Cont by the

# نگارِستان

(۲۶- ادبی مقالوں اور افسانوں کا مجموعہ)

نیاز فتحپوری

قیمت مجلد

چار روپیہ



ناشر

نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

ٹیلیفون ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۲۴۵۵۹

ناشر:۔ عزیز الرحمٰن
پرنٹر:۔ نظامی پریس،

# فہرست

# چند دن بمبئی میں

۲۰ مئی کی شام بھی کیسی منہمک شام تھی جب میں نے بمبئی کے لیے اپنا اسباب درست کرنا شروع کیا۔ میرا اسباب ہی کیا تھا کہ درست کرتا۔ لیکن کسی محبوب مقام کی تیاریاں کرنا گویا تنہائی میں اس کا ذکر کرنا ہے، اور میں چاہتا تھا کہ اس ذکر کی تکرار ہو۔ بستر لپیٹ رہا ہوں، لیکن سوادِ بمبئی سامنے ہے، ہوں ہانسی میں لیکن پھر رہا ہوں بمبئی میں۔ اُف رے تصور تیری لطف پاشیاں!

یہ "حدِ شوق نفوذِ تخیل" ہمارا روز کا تجربہ ہے، لیکن یہ اشراقیت کہ کہیں کا نام سنا اور فوراً اس کے حدود پیشِ نظر ہو گئے، وہاں کی گلیاں، وہاں کے مقاماتِ تفرج کی کیفیتیں، وہاں کے لوگوں کی صورتیں کھنچ کر رہ گئیں، بسا اوقات زیادہ پُرلطف ثابت ہوتی ہے اور جب اس جگہ ہم پہونچ جاتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ تخیل کی وارفتگی، خیال کی ربودگی کیسی پاکیزہ چیز تھی اور ہمارا صنمکدۂ دماغ جو "تخیل" کی بت سازیوں کا نتیجہ تھا بہت زیادہ پُرکیف مناظر سے معمور تھا۔

لکھنؤ، آگرہ، دہلی وغیرہ جانے سے قبل وہاں کا ذہنی جغرافیہ سامنے تھا اور راتوں کی خلوت میں بارہا وہاں کی گلیاں چھان چکے تھے، لیکن جب وہاں پہونچ گئے تو کیا ہوا؟ وہ جغرافیہ جس میں زمین کے بہترین مناظر آتے تھے فراموش ہو گیا وہ مرقعہ جن کی ترکیب بہترین تصویروں سے ہوتی تھی اور وہ ذراتِ حسن جو وہاں کی گلیوں میں نظر آتے تھے یکسر محو گئے، لیکن صرف بمبئی ایک ایسا مقام نکلا

چند دن بمبئی میں

جس کو دیکھ کر میں ایسا محسوس کرنے لگا گویا میرے تمام اگلے پچھلے قیاسات و تصورات نے جسم اختیار کر لیا ہے اور اسی کا نام بمبئی رکھ دیا گیا ہے۔

وہاں جانے کی آرزو عرصہ سے قلب میں پرورش پا رہی تھی، لیکن اس کی رنگینیوں کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ جب میں نے مصمم ارادہ کر کے اسے خون کے ساتھ ایک ایک رگ میں دوڑا دیا۔

ٹھیک گیارہ بجے شب کو میں ہانسی میں سوار ہوا اور صبح کو دلی پہونچ کر شام کو ۵ بجے آگرہ اُتر پڑا، مہمان دلگیر ہوا۔ خیال تھا کہ ایک دن یہاں رہوں گا لیکن گرمی کی شدت نے اجازت نہ دی اور مجبوراً ۶ گھنٹہ کے بعد ہی میں نے رات کی گاڑی سے آخر کار اپنا وہ سفر شروع کر دیا جس کا خیال اسوقت بھی میری تمام ہستی پر حکمران ہے۔

بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

ریل میں بیٹھئے اور سفر طویل ہو، تو سب سے پہلے لطیف معیت کی جستجو ہوتی ہے، یعنی اگر تنہائی نصیب نہ ہو، جو بہتر ندیم ہے، تو خیر وہاں کچھ صورتیں ہی ایسی ہوں جن کو دیکھ کر بینائی مجروح نہ ہو۔ مگر یہ پہلا شگون نیک تھا کہ میرے ساتھ کوئی نہ تھا اور اس لئے جلدی جلدی بستر کھولا، اور کھڑکی سے سر نکالکر ان نقوش پر نظر ثانی کرنے لگا، جو اس وقت میرے دماغ کے تنہا نقوش تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر تک اس لذت میں مستغرق رہا، کیونکہ جب میری آنکھ کھلی، تو ۲۲ مئی کا سورج بہت بلند ہو چکا تھا۔ اور ایک جوان فرنگن مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ کسی اسٹیشن پر ۹-۱۰ بجے کے درمیان اتر پڑی۔

میں سفر میں اس سے بہت گھبراتا ہوں کہ کوئی مجھ سے اس قدر بے تکلف ہو جائے کہ لامحالہ اس کے ہر سوال کا جواب دینا پڑے۔ خاص کر ایسے سفر میں جس کے متعلق اگر میں خود اپنے سے سوال کروں کہ "کیوں جا رہا ہوں" تو کوئی جواب بھی نہ ملے

چنانچہ ایک صاحب نے میری طرف سوال کرنے کو اپنا چہرہ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے کتاب اٹھالی اور دیکھنا شروع کر دیا۔

کسی دور دراز کے مشہور مقام پر جانے والے مسافر سے سوال کیجئے تو وہ نہایت نخوت سے مختصر سا جواب دیتا ہے کہ کلکتہ یا بمبئی"، یعنی جس طرح ریل پر سوار ہونے والا، پیدل چلنے والوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے تئیں بہت بالا و برتر سمجھتا ہے، اسی طرح ایک ہی گاڑی میں سفر کرنے والے اظہار تفوق کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں اور پھر تماشہ یہ جہاں کسی نے "کلکتہ، بمبئی" یا کسی دوسرے دولتمند شہر کا نام لے دیا تو قریب جانے والے غریب کچھ ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ خواہ مخواہ وہ اسکے اندر شان امارت محسوس کرنے لگتے ہیں اور اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں سے یہ ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ "وہ یہ شخص کیسا خوش قسمت ہے؟" مجھ سے اگر کسی نے پوچھا بھی تو ہر آگے آنے والے اسٹیشن کا نام لیکر کہدیا کہ اس طرف جاتا ہوں۔ غرض دن بھر اسی لغویت میں گزرا کہ کون آتا ہے اور کون جارہا ہے، گرمی کا وہ عالم تھا کہ تالو پیاس سے چٹخا جا رہا تھا۔ شام ہوئی تو گرمی میں کچھ تخفیف ہوئی، طبیعت کو کچھ سکون ہوا اور کوشش کر کے سو گیا۔

۲۳ رجون کی صبح کو جو آنکھ کھلی تو سواد بمبئی شروع ہو گیا تھا اور سب سے پہلا منظر کھجوروں کے درختوں کا تھا جو سبزہ و شاداب ٹیکروں اور پھیلے ہوئے قطعات آب سے مل کر آنکھوں میں سمائے جا رہے تھے، راستہ کے خشک و گرم میدانوں کو دیکھنے کے بعد اچانک یہ سکون نظر، خدا جانے کیسی نعمت تھا، میں اس منظر کی عربیت سے بہت متاثر ہوا اور ایسا محسوس کرنے لگا گویا دشت نجد میں قیس اتفاقاً کہیں لیلی کو پا گیا ہے اور صحرا کی وحشت و خشکی جو شاید اسی ملاقات کی منتظر تھی، اکبارگی رونق و سرسبزی، خنکی و تری میں تبدیل ہو گئی ہے!۔ وہ

## چند دن بمبئی میں

اِدھر اُدھر لا بنے لا بنے سبز کھجوروں کے جھنڈ، وہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا زمردین سلسلہ اور پھر اس پر چادر آب کی غیر متناہی شکنیں! قیامت تھی، قیامت!۔
کسی خاتون کو ریل میں بٹھا کر اس طرف لے جاؤ، ممکن ہے وہ اپنے جذبات کو چہرہ سے ظاہر نہ ہونے دے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے سانسوں کے نظام میں کوئی فرق نہ آنے دے لیکن اسکی نازک کلائی پر ہاتھ رکھ کر ضربات نبض کا شمار کرو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ یہاں عشق کرنا سیکھ سکتی ہے، وہ یہاں اپنے اعضا میں خواہش سپردگی محسوس کر سکتی ہے۔ المختصر یہ کہ ساری کی ساری خستگی یہ کچھ عجیب پُرلطف انبساط ہوگئی، اور سارے شدائد گرامجو ہو گئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک ریل انھیں سرسبز حصوں سے ہوتی ہوئی گزری یہانتک کہ سات بجے آہستہ آہستہ ہوکر اس سرزمین حسن و عشق، اس بلدہ شعر و موسیقی میں پہونچ گئی، جسکی تمنا میری ہستی کے اندر ایک الگ روح بنی ہوئی تھی اور اس مقام کی وہی خصوصیت جس نے میرے دل کو تڑپا رکھا تھا، آخر کار پیش نظر ہو گئی۔
پارسیوں کی جنس لطیف کا حُسن گو میرے لئے اجنبی نہ تھا لیکن یہ خیال کہ "بمبئی" تو ان کا مسکن ہے، یہاں تو ان کی حکومت ہے"۔ تصور کی فراوانی سے تنگ آکر، ہجوم حسن کا آرزومند تھا، اور اس پرستش کا کس زبان سے شکریہ ادا کیا جائے کہ دادر اسٹیشن پر پہونچتے ہی اس حسن کا ایک نہایت پاکیزہ و پُرشباب نمونہ، میری بیخودی و وارفتگی کا ترانۂ خیر مقدم گا رہا تھا میں اسکو اپنا ہی خیر مقدم سمجھوں گا، کیونکہ وہ میری گاڑی کے ٹھہرتے ہی اٹھی اور میں اسکا "ترانہ" ہی کہوں گا، کیونکہ اترتے ہی میں نے اسکی آواز قدم سنی، آہ کون جانتا ہے کہ حسن کی اگر کوئی زبان ہے تو صرف موسیقی اور ایک حسین عورت کی ہر حرکت ایک نطق موسیقی ہے، جس کا ساز فسائیت اور صرف "فسائیت" ہے،

وہ ہاتھ ہلاتی ہے گویا ہوا میں نقش ترنم بنا دیتی ہے، چلتی ہے اور اپنے پاؤں سے زمین پر نشان موسیقی چھوڑ جاتی ہے اس لئے اے بمبئی! میں تیرا ممنون ہوں کہ تو نے میرے خیر مقدم کے لئے اپنے ہاں کے بہترین گیتوں میں سے ایک گیت منتخب کیا۔

ضرورت تھی کہ اسوقت میں تنہا چھوڑ دیا جاتا، اور بالکل آزاد لیکن افسوس ہے کہ مجھے ابھی اور آگے جانا تھا اور یہاں گاڑی بدلنا تھی، اسباب سنبھالنے میں مصروف ہوا لیکن میں نے اپنے ایک دوست کو یہاں پہنچنے کی اطلاع اسی وقت ایک کارڈ لکھ کر دیدی کہ ؏ اے رفیقان نوبہار آمد کنوں دیوانہ ام

دادر بمبئی کا لوکل اسٹیشن ہے اور مجھے ماہم جانا تھا جو یہاں سے دو تین اسٹیشن اور آگے ہے۔ اس دلنشین آفت، اس سکونِ جان قیامت کو جو پلیٹ فارم پر خراماں تھی، "زندہ باد" کہتے ہوئے رخصت ہوئے اور آدھ گھنٹے میں ماہم پہونچ گئے، جہاں مجسمہ صدق و خلوص پیکر محبت و صفا، لطیف الدین احمد میری پذیرائی کے لئے موجود تھے

پانچ منٹ میں ہم اس جگہ پہونچ گئے جہاں قیام کرنا تھا افسوس ہے کہ لطیف کی مشغول و منہمک زندگی کو دیکھ کر میں خوش نہ ہوا۔ کیونکہ میری رائے میں تحقیقات اس کے لئے وضع نہیں ہوئے لیکن ابھی اس تنقید کا موقعہ نہ تھا اور میں نے انکو اجازت دیدی کہ وہ جائیں اپنا کام کریں، اب مجھ سے ان سے تین چار گھنٹے کے بعد ملاقات ہونا تھی اس لئے میں بالکل تنہا رہ گیا اور لگا اطمینان سے بیٹھ کے یہ سوچنے کہ "تو یہاں آکے بھی ویسا ہی زار و خراب رہا"۔

یہ مکان اُس سلسلۂ آب کے کنارے ہے جو بمبئی کو جزیرہ نما بناتا ہے اور اس لئے یوں کہنا چاہیئے کہ میں ساحل بحر پر تھا جہاں میری نگاہ کی پرواز کے لئے ایک وسیع و رقیق میدان موجود تھا، اس مکان کے چاروں طرف بھی کھجوروں کے درخت کثرت

سے معصومیت منظر یہاں بھی پائی جاتی تھی۔

شام کو میں اور لطیف ریل میں سوار ہو کر چرچ گیٹ، اسٹیشن گئے اور وکٹوریہ میں بیٹھ کر اس کارگاہِ حسن و جمال اُس نزہت آبادِ حسن و نزاکت میں پہنچ گئے جسے ساحل اپالو کہتے ہیں۔

حسن، عام اس سے کہ وہ اک نو زائیدہ، سبزہ کی نرم و نازک پتی اور اک ہلکے رنگ کی کلی میں آسودہ ہو، یا وہ جنس لطیف میں پانزدہ سالہ دوشیزگی کو اپنا نشیمن بنانا پسند کرے، فطرتاً اس امر کا مقتضی ہے کہ حسن ہی اسکا متجسس ہو، جمال ہی اسکی جستجو میں سرگرداں ہو، جس طرح نزاکت کا بار اٹھانے کے لیے نزاکت ہی زیادہ موزوں ہے بالکل اسی طرح حسن کی معیت کے لیے حسن ہی کی ضرورت ہے۔ نازک پھولوں پر ایک تیتری ہی بیٹھی ہوئی بھلی معلوم ہوتی ہے اور ایک حسین و صبیح پیشانی پر کچھ صندل ہی کا نقشہ لطف دیتا ہے!

معدنی اشیاء میں سونے اور پارے کی خصوصیات مجھے بہت پسند ہیں، وہ جاذب ہے اور یہ منجذب، وہ پسندیدہ حسن اور یہ حسن پسند۔ عورت سونے ہی کے زیور پر جان دیتی ہے کہ پارہ بھی اپنے معدن سے باہر نہیں آتا جبتک کوئی حسین لڑکی گردن جھکا کے جھانک نہیں لیتی۔

بچہ اپنے لطف کے لیے بچوں کا ساتھ ڈھونڈھتا ہے، کوئی بوڑھا ان میں بیٹھ بھی جائے تو اسے ناگوار ہوتا ہے، محفل رقص و سرود میں مغنیہ کی نگاہ دیں پڑتی ہے جہاں نوجوانوں کا مجمع ہوتا ہے اور جہاں کسی سن رسیدہ شخص نے کوئی بات کہی اور اس کی طبیعت سرد ہوئی۔

حسن میں کشش ہے تو اسکے یہ معنی نہیں کہ ہر کھنچ جانے والی چیز مقبول بھی ہو سکتی ہے دیکھنا یہ ہے کہ حسن کا مطلوب معنوی کون ہے، کیونکہ حقیقتاً مطلوبِ حسن ہونے کی اہلیت رکھتا ہی وہ حسن ہے جو ہماری رائے میں حسن کی معیت کا مستحق ہے موسم برشگال میں افق کی سیاہی کا سرایع نشو و نما ہم بھی دیکھتے ہیں، چاروں طرف جوشِ سبزہ ہمیں

بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ باغوں کی فصیل پر طاؤس کا خرام ہمارے دل میں بھی گدگدی پیدا کرتا ہے۔ کوئل کی مستیاں، ہمارے دماغ پر بھی چھا جاتی ہیں، لیکن ایک رند سے پوچھو، وہ کہتا ہے کہ "میں نہ ہوں تو بادل کا ایک ٹکڑا نظر نہ آئے"، ہمیشہ خشک سالی کے مصائب دفع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ نہیں ہوتا کہ شراب پینا لوگ شروع کر دیں، کہ کبھی امساک باراں کی شکایت نہ ہو"۔ غرض یہ کہ وہ اودی اودی گھٹاؤں کو دیکھ کر بیتاب ہو جاتا ہے، اور جب ہم مکان کی چھتیں دیکھا کرتے ہیں اسی وقت وہ باہر جنگل میں سبزہ پر بیٹھ کر جھوما کرتا ہے، مظاہر قدرت کا محبوب اور حسن مناظر کے نزدیک حسین وہی ہے جو اپنے تئیں ان میں محو کر سکے، کلی کے اگر زبان ہوتی تو وہ کہدیتی کہ مجھے تو صرف بھنورا چاہئے، مجھے پروا نہیں اگر وہ میرا سارا رس نکال لیتا ہے، اسکا شوق اس کے لئے مایۂ حیات اور میں خوش ہوں کہ میری بربادی اسکی زندگی ہی کیونکہ اعتراف محبت کا یہی ایک پسندیدہ طریقہ ہے اسی لئے میں نے کہا کہ

یہاں میرا آنا بعد از وقت ہوا، دل میں ولولہ کی وہ فراوانی نہیں کہ حسن مناظر کے لئے جی کھول کے وقت صرف کر سکوں۔ عنفوان شباب کی وہ رعنائی نہیں حالانکہ غریب مرد کے صحیفۂ حیات کا یہی ایک ورق عورت کے مطالعہ کے قابل ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہاں آنے کا مجھے بہت شوق تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں کا پورا لطف اٹھانے کے لئے اس قدر شوق کافی نہ تھا حسن سے پوری طرح مستفید ہونے کے جذبات عرصہ ہوا کہ میں اپنی تمناؤں کے ساتھ سینہ میں دفن کر چکا ہوں اور اس لئے ضرورت تھی

چند دن بمبئی میں

کہ زندگی میں خاص تحریک پیدا کرنے کے لئے کسی محرک کی معیت نصیب ہوتی
لیکن وہ کہاں! پھر بھی میرے لئے تباہ و برباد ہو جانا یہاں آسان تھا لیکن شکر ہے کہ
لطیف کی عدیم الفرصتی میری حیات کی ضامن ہو گئی اور میں زندہ وطن واپس آسکا۔

جس وقت میں اپالو پہونچا، تو متحیر تھا کہ کیا فی الحقیقت کسی ساحلِ بحر پر کھڑا ہوں؟
یقین نہ ہوتا تھا کہ میں خشکی کا اس قدر حصہ طے کر کے یہاں آگیا ہوں جہاں سے قدرت کی
یہ رفیق العجوبہ نمایاں شروع ہو کر دنیا کے تین چوتھائی حصہ پر قابض ہو گئی ہیں، نگاہوں
کے سامنے ناقابلِ عبور سطح امواج! یہ معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کی وسعت تخیل نے ایک
صورت اختیار کر لی ہے۔

میں سمجھتا تھا کہ اونچی اونچی لہروں کے بیتاب غیر منقطع سلسلہ اور ایک سامعہ شکن
شور کا نام سمندر ہے، لیکن یہ دیکھ کر کتنا تعجب ہوا کہ وہ تو صرف ایک سکون ہے متحرک،
ایک خوشی متلاطم۔

چھوٹی چھوٹی کشتیاں، ایسی آزادی اور تیزی کے ساتھ سمندر کے سینہ پر دوڑتی
پھرتی تھیں کہ قوت بحر کی طرف سے اعتقاد کچھ کمزور سا ہوتا جاتا تھا لیکن جب ذرا
فاصلہ پر ایک عظیم الشان جہاز سمندر کی ہمسانس کے ساتھ متحرک نظر آیا اور اس
سے اور دور روشنی کا ستارہ نگاہوں کو اپنی طرف کھینچنے لگا، تو سخت حیرت ہوئی
کہ خدایا یہ قہار سکون، یہ ذخار خوشی کیونکر انسان کو ایسا جری و بیباک بنا سکی۔

جس وقت ہم ساحل پر پہنچے شام ہو چکی تھی بجلی کی روشنی جو صرف لب آب جگمگانے
کے لئے وضع ہوتی ہے، اور لب آب بھی وہ جس پر اپالو اور چوپاٹی بجا طور سے فخر و ناز
کر سکتے ہیں سمندر میں پڑی تھرتھرا رہی تھیں، اور تاج محل ہوٹل جو ہند کا بہترین
ہوٹل ہے مع اپنی تمام روشنیوں، دلآویزیوں اور ارتفاع و شوکت کے پانی کے
اندر ہچکولے کھاتا نظر آ رہا تھا۔ کشتیوں پر کہیں لوگ سوار ہو رہے تھے۔ کہیں اُن

سے اتر رہے تھے، دس جا رہی تھیں تو بیس واپس آ رہی تھیں مختلف شکل و وضع کے لوگوں کا مجمع تھا، جن میں کوئی ٹہل رہا تھا، کوئی بیٹھا تھا، لیکن کیسی پرلطف و تعجب انگیز بات تھی کہ اس مجمع میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کا جادۂ نظر دوسرے سے مختلف ہو۔ اک طوفانِ نظارہ تھا جو سطحِ آب پر برپا تھا، اک سیلاب شوق تھا جو سمندر کی سیال خموشی کو محیط تھا۔

(غالباً ۱۱ سمہ ء)

(نوٹ) اس کا باقی حصہ تمدن میں شائع ہوا تھا لیکن افسوس ہے کہ تلاش سے اس کے پرچے دستیاب نہ ہو سکے۔

# ایک مصوّر ایک فرشتہ

اب سے بہت پہلے، کروروں برس پہلے، جب تکوین عالم کی بالکل ابتدا تھی، مذاق آفرینش یا تو پانی کی لہروں سے کھیلتا نظر آتا تھا، یا وادیٔ قاف کی نسرین و نسترن زار میں آسودہ!

خشکی کا حصہ سارے عالم میں صرف اسی قدر تھا اور میر آب حباب کا حکم باقی تمام کائنات پر سیال، لیکن حالت یہ تھی کہ سبزہ نہ تھا مگر یاسمین، اور چھوٹی سی چھوٹی موج آب نہ تھی مگر برگ نیلوفر سفید اور صرف سفید رنگ میں تمام موجودات عالم ملفوف تھے، گویا نیچر ہنس رہا تھا آفتاب صرف چند ساعت کے لئے اپنی ضروری خدمت انجام دینے کے لئے نمودار ہو کر غائب ہو جاتا تھا، اور صرف ایک چاند جو غرہ و محاق سے نا آشنا تھا اس تبسم آباد کا دیکھنے والا تھا، کیونکہ نباتات ہوں یا دیگر مخلوقات، نزاکتِ تخلیق کی وجہ سے تمازت آفتاب کی برداشت نہ کر سکتے تھے اور اس لئے آفتاب کی پہلی شعاع جب نمودار ہوتی تھی تو فضائے عالم پر سکون مطلق طاری ہو جاتا تھا اور نیچر خواب میں بیہوش!

ایک شب کا واقعہ ہے، وادی قاف میں سپید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفانِ عریانی بپا تھا، فرط تعطر سے پنکھڑیاں جا بجا شق ہو گئی تھیں۔ چاند چادرِ سیمین پھیلا کر اس میں اتر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی موجیں جن میں ضیاء ماہ پس کر رہ گئی تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ نقرئی زنجیریں ہیں اور حباب گھونگھر کے دانے، جو صبا

کے سبک و نازک پاؤں سے فرش آب پر ہنگام رقص نکل کر رہ گئے ہیں۔ کرۂ آب، یادشتِ نیلوفریں جو کلی کہیں کھل کر رہ گئی تھی، اور اُسکے اندر قطرۂ آب جگمگا رہا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ناہید فلک کا بُت کسی شوالہ میں رکھا ہوا ہے۔

چاند نصف فلک طے کر چکا تھا کہ سطح آب کی حرکت یکایک بند ہو گئی، جو موج جہاں تھی وہیں رہ گئی، نیلوفر کی کلیاں اک رقیق خرامی کے ساتھ ساحل کی جانب ایک قطار میں آکر قایم ہو گئیں، ہوا بند ہو گئی، اور ایک ایسا سکون پیدا ہو گیا جیسے یہ مختصر سی دنیا چلتے چلتے اک بارگی کسی چیز کو دیکھ کر حیرت سے ٹھٹک کر رہ گئی ہو۔

دفعتہً ساحل پر پھیلی ہوئی چاندنی پھٹی اور جس طرح کوئی چادر کا کونہ پکڑ کر جھٹکا دے بالکل اسی طرح سطح آب میں تموج پیدا ہوا، ہوا چلنے لگی اور نیلوفر کی ساری کلیاں دفعتہً ایک معطر لحن کے ساتھ کھل پڑیں بیشمار چھوٹی چھوٹی مچھلیاں منھ میں ایک ایک صدف دبائے باہر نکل کر آگئیں اور ہنس ایک ایک دانہ مرجان اپنی چونچ میں لیئے ہوئے باہر آگئے۔

ساحل پر ایک فرشتہ خاموش کھڑا ہے، اس منظر کو بیک نظر سمجھنے کی کوشش میں مستغرق ہے، وہ چاند کو دیکھتا ہے اور دیر تک غور سے دیکھنے کے بعد اس طرح اپنی نظر کو آہستہ آہستہ اس وادی تک لاتا ہے، گویا چاند کی شعاعوں کے ساتھ اس کی نگاہیں بھی پھولوں تک آکر پھیل گئیں، اس نے پروں کی شکنیں دور کیں، بازو پھیلائے، اور زمردین قلم، ایک ہاتھ میں اور ورق زرد دوسرے ہاتھ میں لیکر ساحل پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا، وہ کچھ متفکر تھا، کچھ سوچ رہا تھا، اور اس ورق زر پر کچھ لکھنا چاہتا تھا کہ دفعتاً وہ چونک پڑا اور اس نے ورق علٰحدہ رکھکر

وادی کی طرف منھ کر کے ہاتھ بڑھایا، خوشبو کی موجیں جو اٹھ رہی تھیں انھوں نے سمٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ سمٹتے سمٹتے یکجا ہو گئیں، اور انھوں نے ایک سپید نورانی شفاف جسم اختیار کر لیا، فرشتے نے اس مجسم شے کو اپنی مٹھی میں لیکر ایک ایسا فشار دیا کہ وہ بیشمار منور ذرّوں کی صورت میں چور چور ہو گئیں اور ایک جگہ زمین پر ڈھیر۔

فرشتہ کچھ مطمئن سا نظر آتا تھا، اس نے اب اُن مچھلیوں کی طرف نگاہ ڈالی اور بیک اشارۂ انگشت جتنی سیپیاں تھیں سب کھل کر رہ گئیں اور موتیوں کے شفاف و پاکیزہ دانے نظر آنے لگے۔ اس نے اس انداز کو قلم لیکر اسی ورق زر پر لکھ لیا، اور پھر اک نگاہ گرم سے ان موتیوں کی طرف دیکھا۔ اب ہر صدف بجائے موتیوں کے ایک سیال شے سے لبریز تھی، فرشتے نے ہر صدف سے یہ رقیق مادہ لیا، اور ان ذروں پر چھڑک دیا، جو پہلے سے ڈھیر تھے فرشتہ اٹھا اور اس خاک کو اس پانی میں گوندھنے لگا، لیکن اسی کے ساتھ وہ نیلوفر کی نرم و نازک پتیوں کو بھی دیکھتا جاتا تھا اور ان دانہائے مرجاں کو بھی جو ہنس لیئے کھڑے تھے رفتہ رفتہ وہ پنکھڑیاں سخت و سنگین ہو گئیں اور مرجاں سپید۔ یعنی اس نے ان پتیوں کا لوچ لے لیا اور دانوں کا رنگ اور اسی خاک میں انھیں بھی ملا دیا، ہنس چلے گئے مچھلیاں غوطہ لگا کر غائب ہو گئیں، اور نیلوفر کی کلیاں سنگین ہو کر سطح آب میں غرق، اب ادھر وادی قاف خالی پڑی تھی اور ادھر ورق آب سادہ کامل ۱۵-۱۶ گھنٹوں کی لگا تار محنت کے بعد اس خاک میں خمیر پیدا ہوا تو فرشتہ نے اپنی انگلی کے اشارہ سے اپنے اور اس خمیر کے گرد ایک حصار کھینچ لیا اور نگاہوں سے غائب ہو گیا۔

ایک دن، دو دن۔ ایک ہفتہ دو مہینہ، سال، دو سال، یہانتک کہ برسوں

ہو گئے۔ اور وہ صانع فرشتہ اسی پردۂ حصار میں غائب رہا۔ ایک شب وہی ساعت تھی جب یہ نگاہوں سے غائب ہوا تھا، پورے پندرہ سال ہو چکے تھے چاند کی وہی درخشانی اور پانی کی وہی روانی کہ یکا یک وہ سنگین حصار پگھل کر بہہ گیا، فرشتہ خوشی سے اُچھل پڑا اس نے عدن میں سنا تھا کہ جب پتھر پانی ہو جائے گا، اُسوقت اس کام کی تکمیل کا وقت آئے گا۔

ایک حسین و جمیل کالبد بےحس و حرکت پڑا ہوا تھا، فرشِ خاک کا ہر ہر ذرّہ، سطحِ آب کا ہر ہر قطرہ، چاند کے دریائے نور کی ہر ہر موج اس کالبد بیجاں کی طرف کھنچی چلی آتی تھی اور فرشتہ اپنے بازوؤں کی ہوا اور ہاتھ کی حرکت سے ہٹاتا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کا کام ایک حد تک مکمل ہو چکا تھا اور جو علامات اس کو بتائے گئے تھے وہ نمودار ہو رہے تھے تاہم وہ کچھ مشوش تھا، اس کی نظریں اس کالبد میں کچھ ایسی کمی محسوس کر رہی تھیں جس سے وہ ہر ہر چیز پر ایک غائر نگاہ ڈال کر کچھ اخذ کرنا چاہتا تھا، لعطر و نور رنگ اور لوچ سے خمیر کی ہوئی صورت میں ایک ایسی شفاف یکسانیت تھی، جس کو وہ دور کرنا چاہتا تھا۔ جو اس کی ضیا اور رنگین سپیدی کی رونق کو اور بڑھا دے، اور غور سے چاند کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً اس کے ذہن میں ایک ایسی بات آئی جس سے اس کی حالت میں اک تغیر پیدا ہوا اس نے فوراً چاندنی کی طرف ہاتھ کے اک جھٹکے سے ایسا اشارہ کیا کہ وہ ہر جگہ سے مسک کر تار تار ہو گئی تمام فضا میں باریک شعاعیں الگ الگ ہو کر رہ گئیں، یعنی چاند سے اب کرنیں یکجا ہو کر نہ نکلتی تھیں۔ بلکہ علیحدہ علیحدہ نازک و طویل خطوط میں۔ فرشتہ اس منظر سے بہت دیر تک متاثر رہا، اس کے بعد اس نے اپنی انگلیاں ان شعاعوں کی طرف بڑھا کر آہستہ آہستہ مٹھی بند کرنا شروع کی، یہاں تک کہ جس وقت اس کے کف دست سے اس کی انگلیاں

ل گئیں، تو تمام عالم میں اندھیرا سا چھا گیا، (روشنی اس نے مٹھی میں کھینچ کر بند کرلی تھی) اور شعاعیں سیاہ چمکدار ریشم کے لچھوں میں تبدیل ہو گئیں تھیں، فرشتہ نے نور آدہ ساری چمک جو اُس کی مٹھی میں بند تھی، اس کالبد کی آنکھوں میں منتقل کردی اور ان ریشمی کرنوں کو خم دے کر گیسو بنا کر شانہ و دوش پر چھوڑ دیا۔ ابھی اس سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ دفعتہً ایک آواز پیدا ہوئی آسمان پھٹ گیا۔ پانی خشک ہو گیا، کوہ قاف زمین کے برابر تھا اور زمین بنجار بن گر غائب، فرشتہ بیہوش تھا اور وہ کالبد چشم زدن میں عدن کو معطر کر رہا تھا ملائکہ سر جھکائے کھڑے تھے، حوریں ایک مودب حلقہ میں اسے لیئے تھیں اور عدن کا ہر طائر ایک عجیب لحن کے ساتھ ترانہ ہائے اسے سنا رہا تھا، مگر اے عورت تو فرشتوں اور حوروں کی نگاہ میں خواہ کچھ ہی ہو، لیکن ہمیں تو تیری فطرت خلقت پرستش پر مجبور کر رہی ہے آہ تجھے اپنی آفرینش کا حال نہیں معلوم، مگر ہم جانتے ہیں، تیرے خمیر میں کتنی خوشبوئیں، کتنی رنگینیاں، کتنی نزاکتیں شامل ہیں، تجھے خبر نہیں، مگر ہمیں معلوم ہے کہ تیرے تبسم میں کیوں ایک پُر گہر صدف کے کھلنے کا انداز پایا جاتا ہے، تجھے اس وقت ہوش نہ تھا، مگر ہم دیکھ رہے تھے جب تیری انکھڑیوں میں سارے جہاں کی چمک منتقل کی جا رہی تھی، تو غافل تھی مگر ہم تیری ہی طرف کھنچے جا رہے تھے، جب تیری اس بلورین گردن پر گیسو چھوڑے جا رہے تھے، تیری عصمت میں ایک صابئیت ہے کیوں؟ اس فرشتہ سے پوچھ جس نے کامل پندرہ سال تک بے آب و دانہ رہ کر تیری تعمیر کی تجھ میں حیا ہے، تو اپنے جسم کو سمیٹ کر ہم سے الگ ہو جانے پر مجبور ہو جاتی ہے، یہ اس خلوت کا نتیجہ ہے جو برسوں ایک حصار رنگین کے اندر تجھے لیئے رہی۔

ہم کیوں تیری ایک اک شب کے لئے سارا مایۂ حیات دیدینے پر راضی ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ تو رات ہی کو پیدا ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ وہ رات بے کیف وہ بے روح ہے جس میں تو نہ جگمگا رہی ہو۔

---

# کیوپڈ وسائکی

## تمہید

یورپ کے ایک ماہر ادب کا مقولہ ہے کہ "اگر ہمارے تمام مقبوضات سلطنت ایک طرف رکھ دئیے جائیں اور شکسپیر کا لٹریچر دوسری طرف اور ہم سے کہا جائے کہ ان میں سے ایک چیز کو پسند کر لو، تو ہم بلا تامل کہدیں گے کہ ہماری ساری سلطنت وحکومت لے جاؤ، لیکن شکسپیر اور اس کے لٹریچر کو ہمارے لئے چھوڑ دو کہ ہمارے لئے اسی میں بقائے حیات ہے"۔

ممکن ہے اس میں کچھ شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی قوم اپنے بعد کوئی ایسی چیز چھوڑنا چاہتی ہے جو اس کی یاد کو خلعت دوام بخشے تو وہ صرف اس کا لٹریچر ہے۔

ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ مادی منفعت اگر کسی چیز میں ہے تو وہ حکومت وسلطنت ہے۔ لیکن ایک صاحب نظر اس کو ٹھکرا دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں صرف لٹریچر کو ترجیح دے کر اسے اختیار کرنا پسند کرتا ہے، کیوں؟ اس لئے وہ تعین قیمت کے اصول کو جانتا ہے، سمجھتا ہے کہ دنیا میں وہی چیز زیادہ قیمتی ہے جو کمیاب ہے پھر اگر حکومت وسلطنت کمیاب ہوتی جو ہمارے پاس ان تاریخوں کا ذخیرہ موجود نہ ہوتا جن کا ہر

ہر صفحہ عروج و زوال کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے، اور اگر لٹریچر کمیاب نہ ہوتا، تو چاہیئے تھا کہ زمانہ کم از کم دو ہی چار سعدی و شکسپیئر، ہومر و فردوسی پیدا کر کے دکھا دیتا۔ پھر اگر کوئی قوم دنیا میں ایسی ہے جو جلب منفعت کی خواہش تو اپنے دل میں لئے ہوئے ہے، لیکن تعیین ثمن کے اصول سے بے خبر ہے: جو شیرینی کو تلخی سے جدا کر کے حاصل کرنے کی آرزومند تو ہے، لیکن اسے نہیں معلوم کہ حقیقی حلاوت کیا ہے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ آنے والی نسلوں کو ایسی قوم کے اسباب و زوال کی تاریخ مرتب کرنے میں زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اگر انسان دنیا میں صرف اس لئے نہیں پیدا ہوا کہ وقت معینہ تک کھاتا پیتا رہے، اور پھر جب موت آجائے تو مر جائے۔ اگر انسان بہائم کی طرح صرف اپنی عمر طبیعی بسر کر کے فنا ہو جانے کے لئے نہیں آیا تو اُسے سمجھنا چاہیئے۔ کبھی غور کرنا چاہیئے کہ آخر غایت آفرینش کیا ہے اور وہ ہم سے پوری بھی ہوتی ہے یا نہیں غالباً اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ فطرت کا مطالعہ اولین فرض انسانی ہے اور اس لئے اگر ہم یہ نہیں کرتے، تو کہا جا سکتا ہے کہ ہم اپنے وجود سے وہ کام نہیں لیتے جس کے لئے ہم وضع کئے گئے ہیں، پھر اب غور کرو کہ مطالعہ فطرت اور لٹریچر میں کیا فرق ہے؟ تم سوائے اس کے اور کوئی فرق نہ پاؤ گے کہ اگر وہ تخیل ہے تو یہ اسکی زبان ہے، اگر وہ صرف ایک حس ہے تو یہ اس حس کا بیان ہے۔

ایک شخص تاریخی لٹریچر کو ترقی دیتا ہے ملک و قوم پر احسان کرتا ہے۔ دوسرا مذہبی لٹریچر اختیار کرتا ہے (اللہ اسے غریق رحمت کرے) وہ بھی ہمارے شکریہ کا مستحق ہے، تیسرا سیاسی لٹریچر کی حمایت کرتا ہے، (نظر بحکومت دور) وہ بھی ہمارا محسن

ہے، لیکن ایک اور جوان اصناف ادب سے علیحدہ ہو کر اس لٹریچر کو رواج دینا چاہتا ہے جو صرف ہماری روح کو متاثر کرتا ہے، اس شعبۂ ادب کو پسند کرتا ہے جس کا تعلق صرف ہمارے دل سے ہے۔ تو کیا آپ کی نگاہ میں اسکی کچھ وقعت نہیں، کیا آپ کے نزدیک وہ بالکل بیکار وقت ضائع کرتا ہے؟ ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو، لیکن میرے نزدیک تو یہی ایک چیز ایسی ہے جو مادیات کی عظیم ترین فتوحات کے مقابلہ میں روحانیت کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے

ایک واعظ میرے سامنے خانۂ کعبہ کے تقدس کا اظہار کیسے ہی پر اثر لب و لہجہ میں کیوں نہ کرے لیکن جس عظمت و تقدس کا خیال میرے دماغ میں اس انداز خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ ؎

در طوف حرم دیدی۔ دی ہنجۂ می گفت　　کاین خانہ بدین خوبی آتشکدہ بایستے

وہ ہزار واعظوں کے مواعظ سے بھی پیدا ہونا ممکن نہیں۔

جس وقت سے میں نے لکھنا شروع کیا ہے (بلا لحاظ اسکے زمانہ کیا چاہتا ہے) میں نے ہمیشہ اپنے انھیں حسیات کی پابندی کی ہے اور نظم ہو یا انھیں خیالات کے اظہار کو اپنا محبوب مشغلۂ خلوت قرار دے رکھا ہے

میں جانتا ہوں کہ میرے بہت سے احباب نے اس کو ناپسند کیا، بعض نے عریاں و فاحش کہکر شرم دلائی بعض نے خلاف متانت و تہذیب کے الفاظ سے میرے عزائم کو متزلزل کرنا چاہا، لیکن آپ باور کیجئے میں نے کبھی ان باتوں کو سمجھنا بھی نہیں چاہا، کیونکہ میرا مقصود اس سے داد لینا یا دوسروں کو نفع پہونچانا نہیں ہے بلکہ خود لطف اٹھانا ہے پھر دوسروں کی وجہ سے اپنی لذت کھو بیٹھوں ایسا خلق تام مجھ میں کہاں سے آیا!۔

سب سے بڑا اعتراض جو اس نوع کے لٹریچر پر کیا جاتا ہے۔ یہ ہے کہ اس میں عورت، اور اسکے متعلقات کا ذکر غالب ہے لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عورت اور اس کے ذکر کو نکال دینے کے بعد آپکے پاس رہ کیا جائیگا کائنات میں کونسی دوسری چیز ایسی ہے جس سے آپ اسکی رونق کو قائم رکھ سکیں گے۔

جب شاعری سے، جو اس نوع کے ادب لطیف کا پاکیزہ ترین شعبہ ہے صنف نازک اور اس کا ذکر جدا نہیں کیا جاسکتا تو کیا وجہ ہے کہ وہ لوگ جو نثر میں شاعری کرنا چاہتے ہیں اس جنس کے ذکر سے تائب ہو جائیں یہ افسانہ حقیقتاً یونانیوں کے علم الاصنام سے متعلق ہے، لیکن اپنی ترتیب، اپنے انداز بیان اور اپنے اسلوب کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے اور اخذ و اقتباس سے بالکل پاک۔

# کیوپڈ و سائکی

یوں تو، یونان کے عہد زریں کا ذرہ ذرہ بجائے خود اک حسن آباد تھا لیکن سائکی کے شباب نے جس رعنائی جمال کا نمونہ پیش کیا وہ حقیقتاً "عورت کی دنیا" میں ایک سحر تھا، اک اعجاز تھا۔

حسن کی نسبت بہترین شاعرانہ تخیلات کے زیر اثر اک ماہر کوئی ایسی تصویر نہیں پیش کرسکتا تھا، سائکی کے حسن عالم افروز سے کوئی نسبت دی جاسکتی، پھر خدا کی شان ہے کہ علاوہ سائکی کے رئیس یونان کی دو بیٹیاں اور بھی تھیں لیکن جب رات کو شاہی باغ کے صحن اور اسکے کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک، نودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی، تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ

آج سائکی باغ میں نقاب اُلٹ اُلٹ کر پھول توڑ رہی ہے۔

اگلارس و کیوپڈس بھی غیر معمولی حسین تھیں، اور اگر قدرت کے پاس اک آخری نقش حسن و شباب (سائکی) اور نہ ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ یہ دونوں بہنیں وہ چیز تھیں، کہ دنیا انھیں کے لیئے ترستی، انھیں کے لیئے تڑپتی، اس لیئے وہ اگر اپنی چھوٹی بہن سے کچھ خوش نہ تھیں، تو جائے عجب نہیں تاہم چونکہ ان کی شادی ہونے والی تھی، اس لیئے وہ اپنی تسلّی، اپنے انتقام کی تسکین اس خیال سے کر لیتی تھیں کہ ہر چند سائکی زیادہ حسین سہی، مگر کم از کم وہ ان لذّات سے تو ابھی آشنا نہیں ہو سکتی جن سے ہماری راتیں بہت جلد لبریز ہونے والی ہیں" کیا واقعی سائکی کی زندگی میں کوئی رات نہ تھی"؟۔ اب رئیس یونان کے پیش نظر صرف یہی اک فکر تھی، جس میں وہ شب و روز مستغرق رہتا، دنیا کے ہر گوشہ سے شادی کے پیغام آئے، خدا جانے کتنے شہزادوں کی تصویریں مختلف سلطنتوں سے آئیں، اور اگر ہم اس میں ان لوگوں کا بھی شمار کر لیں جو سائکی کی مواصلت کی صرف آرزو اپنے دلوں میں لیئے ہوئے تھے۔ اور زبان تک نہیں لا سکتے تھے، تو اس پیدا و پنہاں پروانوں کے ہجوم کا کوئی شمار ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آئی کہ سائکی کے لیے کوئی بر کس طرح منتخب کیا جائے۔

اب سائکی کوئی بچہ تو تھی نہیں کہ اس کو بُرے یا بھلے یا اپنی طبیعت کے میلان کی تمیز نہ ہوتی وہ تو اب جوان تھی اور اس لیئے انتخاب شوہر کی حِس، جو عورت کی جوانی کی تنہا حِس ہے اس میں بدرجہ اتم موجود تھی اول تو بہت سی تصویریں اسکے سامنے پیش ہی نہ کی جاتی تھیں اور جو اسے دکھائی بھی جاتی تھیں، تو سوا اس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دفعہ تصویر پر نگاہ ڈالتے ہی لانے والے کو نہایت

غور سے از سرتاپا دیکھ لیتی - ہاں اسے غرور تھا، اپنے حُسن پر ناز تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس نے تصویر کی پشت پر لکھوا دیا کہ "اگر یہ انسان ہے تو مجھے انسان کی ضرورت نہیں" مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ اس فقرے سے اپنی آئندہ زندگی کے لیئے ایک سچّی پیشین گوئی کر رہی تھی۔

وہ خوب جانتی تھی کہ اسکے باپ کو کیا فکر لاحق ہے اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ دنیا کے ہر گوشہ میں اسکے حسن کے پرستار موجود ہیں تو اسکی زندگی میں بڑا پیارا انقلاب پیدا ہو گیا وہ کسی شاعر کی بہترین تصویر اٹھا لیتی اور جذبات حسن و عشق میں یہاں تک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اسکے ہاتھ سے چھوٹ جاتی، بارہا ایسا ہوتا کہ جب کتاب دیکھتے دیکھتے اسی حالت انہماک میں اسکی نگاہ کسی پھول پر پڑ جاتی، تو وہ خدا جانے کیوں شرما جاتی اور پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتی غرضکہ اسکی تنہائی کی کوئی ایسی گھڑی نہ تھی خلوت کی کوئی ساعت ایسی نہ تھی جسے وہ اپنے حسن سے معمور نہ پاتی ہو، اور اس کا تخیل ایسا نہ تھا جو شرم و حجاب پر ختم نہ ہوتا ہو، اور چونکہ قریب قریب نصف حصہ اسکے اوقات کا اسی تخیل میں گزرتا تھا یا پھر ایسے کھیلوں میں، جن میں وہ خود کسی کو ڈھونڈھنا، یا اپنے تئیں ڈھونڈھا جانا پسند کرتی (یہانتک کہ بعض دفعہ جب وہ اکیلی ہوتی تو مہندی کی بھول بھلیاں میں گھس جاتی اور آپ اپنی تلاش کرنے لگتی) اس لیئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائکی نصف عورت تھی اور نصف انفعال و جستجو۔

دن گزر گئے، یہانتک کہ سائکی کا شباب، سرور سے سکر، اور سکر سے سرشاری کی حد تک پہونچ گیا، لیکن اسوقت تک کوئی فیصلہ انتخاب شوہر کے متعلق نہ ہو سکا۔

چاندنی رات تھی اور چاندنی بھی موسم بہار کی اور موسم بہار بھی یونان کا، حسن کی زمین کی نسبت فرش گل کا تخیل بھی ادنیٰ ترین تخیل ہے۔ سائکی اپنے باغ کے ایک

کنج میں جو نسبتاً زیادہ تاریک تھا بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سے جسے وہ صرف ایک طویل دن کہہ سکتی تھی، یہاں تک کہ سیر ہو گئی تھی کہ اکثر تاریک مقامات میں وقت صرف کرنا پسند کرتی تھی، مگر وہ یہ دیکھ کر کبھی گھبراتی کہ ہر تاریکی اس کے لئے روشنی ہے۔ اور اسکی ہر رات چاندنی، وہ کنج میں فرش سبزہ پر بیٹھی ہوئی پنکھڑیوں کے ڈھیر کو ایک ہاتھ سے منتشر کرتی جاتی تھی، اور پتیوں اور نازک شاخوں سے چھن چھن کر آنے والی کمزور شعاعوں کو دیکھ دیکھ کر گردن اٹھائے ہوئے اپنے ہی تصنیف کیئے ہوئے شعر آہستہ آہستہ گن گنا رہی تھی، اپنا درد کہہ رہی تھی، شکایتیں کر رہی تھی کہ،

اے چاندنی تو تو آسمان کی سائکی ہے، آسمان ہی میں رہ، دنیا کو تیری ضرورت نہیں کہ وہ پہلے ہی ایک سائکی سے بیزار ہے، زمین جس میں اب مرد کی جنس پیدا ہونے بند ہو گئی ہے۔ سنسان ہے لیکن۔ نہیں تو مجھے پتہ بتا۔ تو تو روز یہاں آ کے ڈھونڈھ جاتی ہے۔ میں بھی تیرا ملک دیکھوں گی۔ شاید میری راتیں وہیں چھپی ہوں۔ چراغ کی طرف پتنگا بیتابانہ آتا ہے، میں اسے پکڑ لیتی ہوں اور گھنٹوں دیکھا کرتا ہوں کہ کلی پر بیٹھنے سے پہلے بھونرے کو گرفتار کر لوں۔ تو ہنسے گی کہ میں نے اپنے مکان سے شمعیں اٹھوا دیں، اپنے باغ سے کلیاں نکلوا دیں کہ جب شمع نہ ہوگی تو پتنگے کیا کریں گے کلیاں نہ ہوں گی تو بھونرے کہاں جائیں گے لیکن تجھے یقین دلاتی ہوں کہ اگر رات کو میری انگلیوں کے سرے چراغ کی لویں ہیں تو دن کو وہ چمپا کی کلیاں ہیں۔ میری گردن جس پر ہرنوں کی گردنیں فدا ہیں، ڈھل جاتی ہے۔ میری وہ آنکھ جس پر جنگلی گایوں کی آنکھیں قربان ہیں، رونا چاہتی ہے، میرا وہ چہرہ، جس پر اے چاندنی، ہر نقاب تیرا ہی ایک ٹکڑا نظر آتا ہے۔ افسردہ ہے کیونکہ دنیا میں کوئی مصور ایسا نہیں ہے جو میرے بعد میری یادگار حسن باقی رکھے کوئی شاعر ایسا نہیں جو میری تمناؤں کو لکھ سکے، اور کوئی مغنی ایسا نہیں جس

کے بربط کے تار میری تعریف میں کانپ سکیں، پھر اے آسمان کی سائکی، تو ہی بتا کہ ایسا شخص جو نور کی تصویر بنا سکے جو سمندر کو لکھ سکے، جو نکہت کو گا سکے کہاں ملیگا۔"

سائکی جیسی حسین و جمیل تھی، ویسی ہی لطیف الخیال شاعرہ اور نازک دست مصورہ بھی تھی، اور اس لئے وہ قدرتاً اس بات کی خواہشمند تھی کہ ویسا ہی حسین، اسی درجہ کا شاعرانہ مزاج رکھنے والا اور ویسا ہی بےمثل نقاش اسکی زندگی کا ہمدم ہو۔ وہ دیر تک اپنے بنائے ہوئے گیت گاتی رہی اور بربط بجایا کی، یہانتک کہ وہ خستہ سی ہوگئی اور اس نے ایک آخری ضرب کے ساتھ جس سے تار کچھ دیر گونجا کئے۔ بربط کو پھینک دیا۔ گویا وہ اس سے بھی بیزار ہوگئی تھی اس نے چاندنی میں ایک جمائی لی، اور پھر انگڑائی لیتی ہوئی وہیں لیٹ گئی وہ اب سونا چاہتی تھی، یعنی اسکی شرابی آنکھیں، جو یوں بھی ہمیشہ نیم خواب ہی رہتی تھیں، اب بالکل سوجانا چاہتی تھیں۔ ساری فضا سو رہی تھی آسمان و زمین سو رہے تھے، وہ شاہراہ زریں جس پر چاند کی شعاعیں ایک مستقل خاموشی کے ساتھ چڑھ اتر رہی تھیں سو رہی تھی، مگر سکوت خواب تو اس خوش نصیب کنج کا تھا جو بیہوش سائکی کو اپنی آغوش میں لیئے ہوئے سو رہا تھا۔

آہ، اس حالت کو نیچر گھنٹوں تک، دیکھتا رہا!

یا پان کار چڑیوں کی شیریں نغمہ سنجی شروع ہوگئی یعنی صبح جاگی، ہر شاخ پھول ہی پھول ہوگئی یعنی کلیاں جاگ اٹھیں۔ سائکی اٹھی اور کنج بھی اپنے تبسم آبادیں جاگ اٹھا، وہ یہاں حقیقتاً سونے نہیں آئی تھی۔ اور نہ اس کو یہ گمان تھا کہ وہ اتنی دیر تک یہاں سوتی رہے گی، مگر اس کو کیا جائے اسکی نزاکت موسیقی کا بار نہ اٹھا سکی، جس کے ہر اتار چڑھاؤ کے ساتھ اسکا شباب صرف ہوتا تھا۔ گیت کے بول جن میں اس کے سارے حیات لطیفہ کی قوت گھٹتی جاتی تھی اس کو بہت جلد خستہ کر دینے والے ثابت ہوئے چنانچہ وہ سوگئی اور انھیں تمناؤں، شکایتوں اور بیزاریوں کو

اپنے دماغ میں لیئے ہوئے سوگئی، جن میں اس کے اجزائے روح گھل گھل کر مل رہے تھے۔ ہمیں نہیں کہ اس پیاری پیاری آنکھوں نے بند ہونے پر کیا کیا دیکھا مگر ہاں جب وہ اٹھی، جو اسکے اعضا دُکھ رہے تھے، اسکا سارا بدن خستگی سے چور ہو رہا تھا، اس نے ہاتھ اُلٹ کر اپنی پیشانی کو چھوا اور پھر اپنے بازوؤں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ایک آدھ دفعہ بل دیا اور اپنے منتشر بالوں کو سمیٹتی ہوئی کھڑی ہوگئی اور آہستہ آہستہ کنج سے نکل کر روش پر ہولی۔

چھریرا بدن ہو اور نازک کمر، تو رفتار میں لوچ کا پیدا ہونا ضروری ہے، لیکن اگر رفتار کی لچک کوئی مستقل چیز ہے اگر سبک خرامی صرف کشیدہ قامتی کی صفت لازم نہیں بلکہ ایک جدا حسن ہے، تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ حسن صرف سائکی کی رفتار کو دیکھ کر سمجھ میں آسکتا تھا۔ نغمہ کا کوئی نقش نہیں، مگر ہوا اس سے معمور ہے، بھلیھری اڑ کر نکل گئی، مگر اسکی لچک اور سبک پرواز اب بھی نگاہ میں تھرتھرا رہی ہے، سائکی کنجوں میں غائب ہوگئی، لیکن اس کی رفتار کا ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے۔ وہ دبے پاؤں اپنی خوابگاہ میں پہونچی اور اپنی سیج پر گر پڑی، اس نے سمجھا بدن کا درد، اعضا کی دکھن عدم آسودگی خواب کی وجہ سے ہے، اور اس نے چاہا کہ سو جائے لیکن وہ ابھی کروٹیں ہی لے رہی تھی، کہ نسرین جو سائکی کی محبوب مطربہ تھی ہاتھ میں اپنا زریں بربط لیئے ہوئے آئی اور پائیں کی طرف فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے بربط کے تار اپنی انگلیوں سے درست کئے اور یہ دیکھ کر کہ شاہزادی کی رات شاید کرب میں گزری ہے، اور وہ ابھی سونا چاہتی ہے، اس نے افسونِ خواب نہایت ہی نرم و شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا۔

"اے نیند آ، اور گھنی پلکوں کو پھر ملا دے کہ ابھی ان میں کچھ نشہ باقی ہے"

اے نیند آ، اور انکھڑیوں کو پھر بند کر دے کہ ابھی ان میں کچھ خمار باقی ہے، ڈالئی

یونان کی بیٹی کو افسردہ انگور کی ضرورت نہیں۔ اس کا شباب خود شراب ہے میں نے تو چاندنی راتوں میں صحن باغ کے اندر ٹہلتے دیکھا ہے۔ اور اگر کسی رات وہ مجھ سے چھپ کر چلی گئی ہے تو صبح کو میں نے روشوں پر سے اس کے نشانات قدم اپنے ہاتھ سے مٹائے ہیں کہ کوئی اس کی لغزش رفتار نہ پہچان لے اے نیند آجا، کہ ابھی سورج کی کرنیں ارغوانی بھی نہیں ہوئیں۔ سائکی کروٹیں لے رہی ہے۔ اس کا بدن شاید دکھ رہا ہے، رات کی شراب ابھی اچھی طرح آسودہ......"

"نسرین خاموش۔ افسون خواب کو ختم کر میرا جی گھبراتا ہے"۔

اب سائکی اٹھ بیٹھی تھی اور پیشانی پر ایک نازک شکن، ایک ننھی سی موج بلورین ڈالے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی، آخر کار اس نے چونک کر نسرین کے ہاتھ سے بربط لے لیا، اور یوں ہی بغیر کسی نظام واصول کے اپنی انگلیاں تاروں پر آہستہ آہستہ چلانے لگی۔ نسرین خاموش مودب کھڑی ہوئی سائکی کی اس خلاف معمول بدمزگی سے ڈر رہی تھی، یہ حالت اتنی دیر تک قائم رہی کہ آفتاب اچھی طرح نکل آیا اور تمام کنیزیں تعمیل احکام اور ضروریات صبح کے متعلق اپنے اپنے فراض ادا کرنے حاضر ہوگئیں لیکن سائکی نے ان کو فوراً رخصت کر دیا اور نسرین کو قریب بلا کر اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولی!

اے نسرین آج تو ایسی بات اپنے منھ سے نہ نکال جس پر کل تجھے افسوس کرنا پڑے، تیرے نغموں نے ہمیشہ میری روح کو مسرت پہونچائی، لیکن اسوقت سے ڈر، جب مجھے ان سے تکلیف پیدا ہونے لگے۔ کچھ ایسی باتیں کر کہ میرے بھولے ہوئے دن میرے سامنے آجائیں، تو مجھے سلانا چاہتی ہے تو میری ان راتوں کا ذکر نہ کر جن میں دیوانہ وار پھرتی رہتی ہوں، تو تو مجھے لوریاں سنا کہ میں اپنی اس

زندگی کو بھول جاؤں جس کا بار میرے لیئے ناقابل برداشت ہے اور پھر ایک دفعہ بچہ بن جاؤں۔

اگر میری پلکیں نشہ آلود اور میری آنکھیں خمار آگیں ہیں تو کیا؟ اگر یونان کی بیٹی کا شباب عروج صہبا ہے تو کیا؟ کیونکہ اسے خود نہیں معلوم کہ اس میں کیا لذت پنہاں ہے میری زندگی تو ایک ایسی صدا ہے، جو صحرا کی وسعت میں گم ہو جائے۔ پھول اگر اپنی نکہت سے آپ فائدہ اٹھا سکتا ہے، اگر کلی اپنی رعنائی پر خود فریفتہ ہو سکتی ہے تو ہزار دفعہ دہی گا۔ جوابس گا نی، ورنہ اپنے بربط کے تار توڑ ڈال، طربیں اتار دے۔ نغموں کو بھول جا، اور اپنا ساز کسی کونہ میں پھینک کر آ، اور میرے ساتھ کراہ۔"

قبل اس کے کہ سائیکی اپنی گفتگو ختم کرتی، وہی دونوں کنیزیں جن کو سب سے پہلے حکم دیا گیا تھا آئیں اور سائیکی نسرین کو مبہوت و متحیر چھوڑ کر ان کے ساتھ چل دی۔

سائیکی غسل سے فارغ ہو کر حمام سے نکلی اور نگاہ کی طرح فوراً آئینہ خانہ میں داخل ہو گئی۔ آج اسکی سترھویں سالگرہ تھی اور اسے حسب رواج دربار میں شریک ہونا تھا۔ ملک کے تمام شعرا، شاہزادے، سفیر، مغنی، سبھی موجود تھے۔ اور دربار میں سائیکی کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ شام کو سائیکی کتاں کی آسمانی رنگ کی چادر میں اپنا بدن چھپائے اور اسی رنگ کا ہلکا نقاب اپنے چہرے پر ڈالے ہوئے برآمد ہوئی۔

سب گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے اور سائیکی اپنی جگہ پر جو بہت بلند تھی کنیزوں کے حلقہ میں بیٹھ گئی۔

اس کے بعد رسم نذر شروع ہوئی۔ ہر شخص جو بڑھتا تھا اس کے ایک

ہاتھ میں ہار ہوتے تھے اور دوسرے ہاتھ میں وہ چیز جو نذر کے لیے مخصوص تھی۔ پہلے اس کے قدموں پر پھولوں کو ڈال دیتا تھا۔ اور پھر نذر پیش کرتا تھا، چنانچہ تھوڑی دیر میں سائکی کے پیروں پر موسم بہار کی بہترین پیداوار اور صناعت انسانی کے نازک و لطیف ترین ہدایا کا انبار لگ گیا۔ شعراء نے اپنے قصاید شروع کئے مغنیوں نے اپنے ساز درست کئے یہانتک کہ اختتام دربار کا وقت قریب آگیا جس کے لئے ہر دل تڑپ رہا تھا۔ اور جس ایک لمحہ کے لئے یہ سارے تکلفات تمہیدی برداشت کئے گئے تھے۔

یہ دستور تھا کہ جب دربار سالگرہ ختم ہوجاتا، تو ان ہدایا کی پذیرائی میں سائکی کو ایک لمحہ کے لیے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دینا پڑتی تھی، اور غالباً اسی برق پاش رسم کا یہ اثر تھا کہ تمام عالم میں سائکی کی غائبانہ پرستش ہو رہی تھی۔ اور ساری دنیا اس جلوۂ عریاں کے لئے بے تاب نظر آتی تھی۔

سنا ہے کہ جس وقت وہ پورے بارہ برس کی ہوگئی اور اول اول دربار میں نقاب پوش ہوکر آئی تو اس قدر ہجوم نہ تھا لیکن اسکے بعد بے نقاب ہونے کی خبر منتشر ہوئی تو ہر سال لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، یہانتک کہ جب پانزدہ سالہ سائکی کی سالگرہ ہوئی تو تمام اقطاع عالم میں اسکے حسن کی آگ مشتعل ہوچکی تھی اور اس سال جبکہ اسکا شباب پورے سترہ سال کا تھا اتنا کثیر ہجوم ہوا کہ شاید سرزمین یونان نے اس سے قبل اتنے پروانوں کا ہجوم کبھی کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ غرضکہ وہ ساعت آئی، جب سائکی کو بے نقاب ہونا تھا، یوں تو جبتک وہ وقت نہیں آیا تھا ہر شخص ایک مستقل اضطراب ایک نمایاں بے چینی بنا ہوا تھا، لیکن جب وہ وقت آیا اور نقیبوں نے اس ساعت کا اعلان کیا تو اتنے بڑے مجمع میں کوئی حرکت، کوئی صدا، اثرِ حیات کا پتہ دینے والی نہ تھی، لب باہم

وصل ہو کر رہ گئے تھے اور آنکھوں نے جھپکنا ترک کر دیا تھا۔

آخر کار سائکی اٹھی اور اپنی بلوریں نازک انگلیوں سے نقاب کے دونوں سرے ایک جھٹکے سے سر کے اوپر کر لئے اور اپنے سحر حسن سے سب کو کم از کم ایک گھنٹہ کے لئے پتھر بنا کے چل دی۔

(۲)

اگر وینس (زہرہ) کو اپنے حسن و جمال پر ناز تھا، تو بیجا نہ تھا کیونکہ سارا آسمان اور تمام آسمان والے اس بات کو مان چکے تھے کہ وینس سا حسین ہونا، گویا خدا ہونا ہے اور معلوم نہیں یونان والوں کو یہ آسمانی عقیدہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ انھوں نے بھی وینس کی دیوی مان کر اسکی پرستش شروع کر دی۔ بت تراشوں نے اسکے مجسمے تیار کئے مصوروں نے اسکی تصویریں بنائیں شعراء نے اس کے حسن کی تعریف میں قصائد کہے اور مغنیوں نے اس کے ترانہ ہائے جمال سے دنیا کو مبہوت و متحیر کرنا چاہا۔ مگر یہ پرستاران حسن (خدا یونان والوں کی روحوں کو خوش رکھے) کچھ اس سے بھی زیادہ وسیع جذبات رکھتے تھے اور اس لئے آخر کار انھیں منھ کے بل اس کے سامنے گر کر کہنا پڑا کہ "اے ملکہ حسن، تیرے مجسمے باوصف اس کے کہ ملک کے بہترین نقاشوں کے دماغوں نے اپنی بہت سی راتیں جاگ کر کاٹ دی ہیں، نادرست ہیں، ہمارے قصائد جن میں حسن کی نسبت لطیف ترین تخیلات کو پیش نظر رکھ کر تیری تعریف کی گئی ہے، نامکمل ہیں اور ہمارے راگ جن کو ہم اپنے بہترین سازوں کے ذریعہ سے اک ترانۂ عبودیت کی صورت میں تیرے آستانۂ جمال پہونچانا چاہتے ہیں، کمزور و ناقص ہیں، پھر اے تو، کہ حسن سے بھی بلند کوئی چیز ہے، اے تو وہ کہ ہمارے خیال کی پرواز تیرے سامنے ایک مرغ پرشکستہ سے زیادہ

نہیں ہمیں یہ نہ بتا کہ تو کیا ہے بلکہ ہمیں یہ دکھا کہ تو کیسی ہے!" ۔ یہ تھے دنیا کے خیالات وینس کے حسن کی نسبت اور یہ تھا اک عالم بے چینی و وارفتگی کا حال۔

وہ زہرہ جو آج سے ہزاروں سال پیشتر یونانیوں کے سامنے جو سما میں چمکتی تھی، آج بھی شاید اسی انداز سے درخشاں ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اسے حسن کی دیوی سمجھتے تھے اور ہم ایک کرۂ غیر آباد یقین کرتے ہیں سو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں وہ آباد رہا ہو اور وینس وہاں کی ملکہ ہو، اور اگر نہیں ہو سکتا تو بھی ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ اسوقت اس ملک کی حکمراں ایک حسین و جمیل عورت تھی، جو ہر چند طبقۂ انسان سے نہ تھی، مگر طبقۂ انسان میں اس کا ذکر ضرور تھا اور اس نے آسمان میں وہی زمانہ پایا تھا، جو سائکی نے زمین میں۔

اسی زمانہ میں ایک دن کا واقعہ ہے (ہم دن کہتے ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ اس ملک میں دن رات کا کوئی مفہوم تھا بھی نہیں) بہرحال ایک جزو زمانہ کا واقعہ ہے، وینس اپنے کاشانۂ بلورین میں بیٹھی ہوئی کنیزوں کا تماشۂ غسل دیکھ رہی تھی اور نہایت مسرور تھی، ایک بلورین حوض جسکی تہ اور دیواریں صیقل کیئے ہوئے آئینہ کی تھیں نہایت شفاف پانی سے لبریز تھا اور ان میں کنیز پریاں برہنہ نہا رہی، اور آپس میں کھیل رہی تھیں چونکہ وینس خود سمندر کے کف سے پیدا ہوئی تھی اس لیئے وہ نظرتاً عریانی پسند تھی اور اسکے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی تھا، غرضکہ وہ اپنی نوجوان کنیزوں کی اس جد و جہد کا تماشہ نہایت انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ ایک کنیز نے باہر سے آکر کسی کے آنے کی اطلاع دی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

اروڈس، وینس کے ملک کی مشہور سیاح اور شہرت کی دیوی، جو اس سے قبل کئی بار کرۂ ارض سفر کر چکی تھی اور وینس کے بہت مقرب درباریوں میں تھی، وینس سے ملنے آئی تھی، وینس پہونچی اور نہایت تپاک سے پذیرائی کر کے اسکی نئی سیاحت دنیا کے متعلق پوچھنے لگی لیکن اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے وینس، میرے حالات

سیاحت کے تمام جزئیات سے آگاہ ہونے کی خواہش نہ کر کیونکہ ممکن ہے کوئی بات اس میں تیرے لئے اضمحلال وافسردگی کا باعث ہو۔"

ونیس نے نہایت متحیر ہوکر پوچھا "اے اروڈٹس آخر تو وہ کونسی بات اب کی دیکھ آئی ہے جو مجھے تکلیف پہونچانے والی ہوگی؟ مجھے یقین ہے کہ تو نے کرۂ ارض کے ذلیل باشندوں میں جن کو ہوا نہ سنبھالے تو منھ کے بل زمین میں گر پڑیں، کوئی بات ایسی نہ پائی ہوگی جس کو سن کر ونیس جلے، کیا تو نے اس سے قبل وہاں کے حالات مجھ سے نہیں کہے اور کیا میں سن کر ہنستے ہنستے بیتاب نہیں ہوگئی کہ انسان اپنے جسم کو جانوروں کی طرح ناخن سے کھجاتا ہے تو اسکے جسم پر مٹی کی لکیریں بن جاتی ہیں۔ اے اروڈٹس کہہ اور نہایت آزادی سے کہہ، جو کچھ تو نے دیکھا ہے میں دیکھتی ہوں کہ آج تو اپنی ملکہ سے خلاف معمول کچھ مذاق کرنا چاہتی ہے۔"

اروڈٹس جو تمام دیویوں میں نہایت سنجیدہ ومتین دیوی تھی یہ سنکر چیں بہ جبیں ہوئی اور بولی "اے ونیس مانا کہ کرۂ ارض کثیف ہے اور اس کے رہنے والے، جن کی ساخت مٹی سے ہوئی ہے ذلیل ہیں، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اسی کرہ میں ایک جگہ یونان بھی ہے جس کا ذکر میں تجھ سے نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن جب تو نہیں مانی اور سمجھتی ہے کہ میں مذاق کررہی ہوں تو سن میں بتاتی ہوں کہ والئی یونان کی بیٹی جس کا نام سائکی ہے، ایسی حسین ہے کہ اگر اس کی خاک پا مل جائے تو ونیس کو چاہئیے کہ اس کا غازہ بنائے اور فخر کرے، کل اس کی سالگرہ کا دن تھا اور میں اس تقریب میں اتفاق سے پہونچ گئی تھی، لیکن اے ونیس یقین کر کہ میں جو اس وقت اتنی دیر سے ونیس کو بے نقاب دیکھ رہی ہوں، اور اس سے قبل ہزاروں بار دیکھ چکی ہوں، اس ایک لمحہ کی تاب نہیں لاسکی، جب سائکی نے اپنا نقاب چہرہ سے جدا کیا۔ اے ونیس، میں افسوس کرتی ہوں اور رشک کرتی ہوں

کہ کیوں نہ انسان ہوئی کہ اس کی معیت کی آرزو اپنے دل میں پیدا کر سکتی۔"

وینس جس کے نزدیک اس سے قبل کبھی اس امر کا امکان بھی نہ تھا کہ کوئی اس کے برابر حسین ہو سکتا ہے، یہ سنکر کہ ایک عورت اور وہ بھی کرۂ ارض کی، اس سے زیادہ حسین ہے، چونک پڑی اور اس کے غرورِ حسن کو اس بیان سے ایسا صدمہ پہونچا کہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ سخت فکرمند ہو کر خاموش ہو گئی لیکن کچھ سوچ کر بولی۔

"اے اروٹس ٹھہر، میں ابھی طلسمی آئینہ منگا کر سائکی کی تصویر دیکھتی ہوں، اور اگر وہ ایسی نہ ہوئی جیسی تو ظاہر کرتی ہے، تو یہ سمجھ رکھ وینس جس طرح حسن خدمات پر انعامات کی بارش کر سکتی ہے، اسی طرح وہ یہ بھی جانتی ہے کہ گستاخی اور جھوٹ کی بدترین سزا کیا ہے۔"

اس نے اروٹس کو رخصت کیا، اور کنیزوں سے طلسم بند آئینہ منگوا کر اپنے سامنے ایک بلوریں میز پر رکھوایا۔ اور سب کو علحدہ کر کے تنہا اس کے روبرو آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی کوئی پندرہ منٹ تک وہ اسی طرح سر جھکائے اور آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی۔ لیکن اس کے حیرت استعجاب کی کوئی انتہا نہ تھی جب اس نے آنکھیں کھول کر آئینہ کو ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہوئے دیکھا، جو حقیقتاً وینس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اسکی ٹانگیں کانپ گر پڑیں آئینہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور عجیب مضطربانہ انداز سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

کامل دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اور وینس کا اضطراب کسی طرح کم ہونے میں نہ آتا تھا کہ دفعتہً ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی۔ اور نسبتاً بیتابی میں کچھ کمی پیدا ہوئی"۔ بیشک میں سائکی کے حسن کا قیام نہیں دیکھ سکتی، پھر مجھے وہ چیز تلاش کرنی چاہئے جو اس کے حسن کو جلد از جلد زائل کر دے اور اس کی

رعنائیوں کو تباہ و برباد۔ اس کو جلد سے جلد درسِ عشق دینا چاہیئے۔ اور عشق بھی نہایت شدید، سخت ناکام و مایوس" یہ کہتی ہوئی اٹھی اور اپنے باغ کی طرف نہایت تیزی سے چل دی۔

کیوپڈ، وینس کا بیٹا شانہ پر کمان اور ترکش میں تیر لیئے، اپنے پردار بازوؤں کو سمیٹے، روشوں پر ٹہل رہا تھا اور پھول توڑ توڑ کر ڈھیر لگا رہا تھا کہ ان پر مشق تیراندازی کرے (ہر چند اسوقت بھی ہمیں اس کی صورت ایک پردار معصوم بچہ ہی کی شکل میں دکھائی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، اسکا عنفوانِ شباب تھا اور اس لیئے اس کی ناوک اندازیوں کی کوئی انتہا نہ تھی) وینس آہستہ آہستہ اس کے پاس پہونچی، اور بیٹے کا منھ چوم کر کہنے لگی "اے کیوپڈ میں نے سنا ہے کہ جب تو تیر و کمان لے کر باہر نکلتا ہے تو ملک کی جوان لڑکیاں تیرے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ اچھے کیوپڈ، چاہے ہمارے دلوں کو اپنے تیروں سے چھلنی کر دے، لیکن خدا کے لیئے پیروں میں زنجیر محبت نہ ڈال، کیا واقعی تیرے تیروں کے زخم زنجیر محبت سے کم مہلک ہیں، کیا میں دیکھ سکتی ہوں کہ ان تیروں سے کیونکر وہ زنجیر تیار کرتا ہے، کرۂ زمین میں رئیس یونان کی چھوٹی بیٹی سائکی تیری قابل نہیں، جا، اور اس کو بتا کہ وینس کا بیٹا کیسا تیر انداز و غرور شکن ہے"۔

کیوپڈ یہ سنکر پھڑک گیا، نئے شکار کا حال معلوم کر کے اس کی چٹکیاں بیچین ہو گئیں۔ کمان شانہ سے اُتر کر ہاتھ میں آگئی اور تیر ترکش سے نکل کر کمان میں آ۔ اس کے پروں کی شکنیں کھلیں، اور دفعتہً نگاہ سے غائب ہو گیا۔

(۳)

سائکی کی رسم سالگرہ، جس نے اس کے شباب میں ایک سال کا اور اضافہ کیا مدت

کیا۔ ختم ہو گئی۔ اور سارا عالم پھر ایک سال تک اس لمحۂ عریاں کے انتظار میں تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا گیا جس کو دیکھنے کی تمنائیں اس درجہ شدید تھیں کہ اگر ساری دنیا سے اس وسعت کا کوئی عوض چاہا جاتا اور واقعی وہ عوض مان بھی لیا جاتا تو سائکی بے نقاب چہرہ اور نگاہ بے محابہ کے سامنے خاکستر حیات کا ایک ڈھیر ہوتا اور پھر وہ تمام عمر کے لئے اپنے نقاب سے بے نیاز ہو جاتی۔ لیکن اس کا حسن، معلوم ہوتا ہے کہ حیات کو رفتہ رفتہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اور روحوں کو بتدریج گھلا گھلا کر فنا کرنے کا خواہشمند تھا۔ دنیا سے اب یہ خیال اٹھتا جاتا تھا کہ سائکی واقعی نوع انسان سے ہے اور یہ خواہش کہ کم از کم ایک ہی رات۔ ایک ہی ساعت، ایک ہی لمحہ، اسکے حسن و شباب میں فنا ہونے کے لئے میسر آجائے، آہ یہ خواہش تو ایسی خواہش تھی، جو اب کفر میں داخل تھی کیونکہ اس کا حسن لوگوں کے دلوں میں اب ایک عجیب و غریب عظمت کی صورت اختیار کر چکا تھا، اور اس سے محبت کرنے کا مفہوم سوائے اسکے اور کچھ نہ رہ گیا تھا کہ دنیا اسکی پرستش کرنے لگے، عالم اسے پوجنے لگے، سائکی کا نام لیا جائے، تو سجدوں میں گر پڑیں اور جب اسکا واسطہ دلایا جائے تو ظالم سے ظالم قزاق اپنا ہاتھ روک لے اور خونخوار سے خونخوار قاتل کی تلوار جہاں تک اٹھ چکی ہے وہیں تک اٹھ کر رہ جائے اور دنیا میں صرف وہی عہد و پیمان قابل اعتبار سمجھا جائے جو سائکی کی قسم سے شروع کیا گیا ہو، غرضکہ رئیس یونان کو پورا الیقین تھا کہ اب سائکی کی شادی کسی طرح نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر کوئی شخص منتخب بھی کیا جاتا تو یہ خبر اسکو کیونکر پہونچاتی کہ وہ سائکی کا شوہر ہونے والا ہے۔ اول تو کوئی شخص ایسا نظر ہی نہ آتا تھا۔ جو حقیقتاً اس بات کا اہل ہوتا کہ سائکی اس کے آغوش میں سپرد کر دی جائے اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یہ بالکل یقینی امر تھا کہ سائکی کے حسن کی

برداشت اسکے امکان سے باہر تھی۔ بہر حال اسکی سترھویں سالگرہ کی تقریب میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید کوئی انتخاب ہو سکے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس میں بھی کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آئی

سالگرہ کے ٹھیک دوسرے دن شام کو سائکی اپنے باغ میں حوض پر بیٹھی ہوئی رنگین مچھلیوں کی بیقراری کا تماشہ دیکھ رہی تھی، وہ شاید چند لمحوں کے لئے اس بات کو بھول گئی تھی کہ وہ وہی سائکی ہے جسکی ناکام رسم سالگرہ ابھی دو دن ہوئے ختم ہوئی ہے اور وہ ایک سال اور اپنے شباب کو خلوت مہجوری میں کاٹنے کیلئے مجبور ہے ورنہ دربار سے آنے کے بعد ایک دن تک اسکی افسردگی کا یہ عالم رہا کہ دنیا کی تمام تفریحیں اسے بے معنی نظر آتی تھیں اور مسرت کا وجود بالکل مفقود۔ وہ سمجھتی تھی کہ عورت ہونا اور ذرا حسین ہونا، ایک ایسا قہر ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں۔ اس نے کھانا نہیں کھایا، کیونکہ غذا بقائے حیات کے لئے ہے اور وہ سمجھتی تھی کہ شاید عورت کا شباب عورت کی حیات سے جدا کوئی چیز ہے، بالوں میں شانہ کرتے کرتے جی الجھا تو اٹھ بیٹھی کہ آخر کیوں؟ آئینہ دیکھا تو منہ پھیر لیا کہ آہ سائکی جہاں کہیں بھی ہے منحوم و نامراد ہے، پھولوں کے ہار یوں ہی رکھے رکھے سوکھ گئے اور اس نے نہیں پہنے، کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ شاید مجردوں کو کوئی اپنے لئے نہیں پہنتا۔ ہار اس لئے گردن میں نہیں ہوتے کہ ان کی نکہت کو صرف ہوا اڑا لئے پھرے ان سے یہ مقصود نہیں کہ وہ ایک افسردہ سینے پر پڑے پڑے سوکھ جائیں۔ بلکہ شاید ان سے یہ مدعا ہے کہ کوئی دوسرا ان کی نکہت سے بیقرار ہونے والا ہو، اور ایک انکی جنبش، ایک دھڑکتے ہوئے دل کی جاتیں اسے بیقراری کا جواب دے ورنہ یوں تو ناکام سینہ ایک مزار ہے، اور مزار پر چڑھائے ہوئے پھول کیا، اس نے گانے میں بھی دلچسپی نہ لی، کیونکہ وہ حسن میں کچھ نقصان محسوس کرتی تھی ساز دل کی نسبت اسے یہ گمان تھا کہ شاید ان کے تار دل میں کسی خاص تار کی کمی ہو گئی ہے اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ اگر موسیقی لذت ہے تو خدا یا یہ کیسی لذت ہے کہ سینہ پھٹنے لگتا ہے، اگر گانا سکون ہے، تو یارب یہ کیسا سکون ہے جو

دل کو بے قرار کئے دیتا ہے۔

غرضکہ اس نے اپنے سارے محبوب مشاغل ترک کر دئیے کیونکہ ان میں سے کوئی اسکے احساس شباب کا جواب دینے والا نہ تھا، وہ راحتوں اور عشرتوں سے بیزار ہوگئی تھی، وہ اپنی گوری گوری کلائیاں دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی مضبوط ہاتھ انھیں پکڑے اور پھر نہ چھوڑے، وہ اپنی نازک کمر، وہ ایک مٹھی میں بھر کے آجانیوالی تپلی کمر چاہتی تھی کہ کوئی اسکو دکھائے اور دکھائے جائے، وہ خواہشمند تھی کہ اسکی نزاکت دوشیزگی کا کوئی دشمن مل جائے اور اسے تکلیفیں پہونچائے۔ اب اسکا وہ غرور حسن باقی نہ رہا تھا کہ شاہزادوں کی تصویریں دیکھ کر منھ پھیر لیتی تھی، اب تو وہ پانی میں بلازس کو بھی مستی کے عالم میں رقص کرتے دیکھتی تو بے اختیار اس سے لپٹ جانا چاہتی تھی، اور ہنس کو گردن اٹھائے، ابھرا ہوا سینہ نکالے پانی میں دیکھتی تھی تو وہ چاہتی تھی کہ یہی بازو کھول کر اپنی آغوش میں لیلے اور اسکی نڈھال گردن پر اپنی زبردست گردن ڈالدے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسکی ادل تمکنت نے معاملہ کی صورت کو اس قدر اہم بنا دیا تھا کہ اب چارہ کار اس کے سوا اور کوئی نہ تھا کہ وہ ایک دیوی کی سی زندگی بسر کرے۔ لیکن آہ کون جانتا ہے کہ ایک دیوی، جس کو دنیا معصوم جانتی ہے، اسوقت کن کن گناہوں کی آرزو اپنے دل میں لئے ہوئے تھی۔

بہر حال وہ اسوقت حوض پر بیٹھی ہوئی تھی، اور نسبتہً کچھ مسرور نظر آتی تھی، کنیزیں پھولوں کے پنکھے لئے اسے ہوا پہونچا رہی تھیں، اور سامنے دوسرے کنارے پر نسرین حسب معمول اپنا سرود لئے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی، کہ سائکی یکبارگی چونک پڑی اور نسرین کی طرف خطاب کر کے بولی "نسرین، یہ تو کیا گنگنائی، پھر کہہ، ذرا آواز سے کہہ، سا تملے اور گا کر مجھے کچھ لطف آیا، نسرین جو سائکی کی افسردگی سے بہت فکرمند تھی، خوش ہوگئی اور اس نے نہایت ہی شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا۔

وہ دن جب میں ایک مغموم خلوت خانہ میں منھ لپیٹے پڑی رہتی تھی، گئے، وہ راتیں جب

سنسان کنجوں میں تنہا پڑی کراہا کرتی تھی گذر گئیں، اب تو جی چاہتا ہے کہ نقاب میرے چہرہ سے جدا ہو اور پھر چاروں طرف کی چاندنی سمٹ کر ایک ہالہ نظر آئے، صبحیں آزردہ تھیں کہ میرا آفتاب سا چہرہ انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوتا تھا، شامیں افسردہ تھیں کہ میری زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو سے وہ عرصہ سے محروم تھیں، راتیں کبیدہ تھیں کہ میرے نغموں نے انھیں عرصہ سے روشن نہیں کیا تھا، لیکن، اب اے صبح اپنا دامن پھیلا اور کرنوں کو جمع کرلے کہ میں آج پھر بے نقاب پھر رہی ہوں، اے شام اپنے تئیں خوب بسالے کہ آج میرے بال پھر تیرے اندر کھلے ہوئے ہیں، اور اے رات بیدار ہوجا کہ آج میری نازک انگلیوں میں پھر تاروں کی لرزش سے گدگدی سی پیدا ہورہی ہے، میری آنکھیں اگر جادو ہیں، تو وہ جادو ہی رہیں گی، انھیں مسحور ہونا نہیں آتا، میرا حسن اگر دیویت ہے تو ہمیشہ اسکی پرستش ہی کی جائیگی، وہ کسی کا خود پرستار کیوں ہو۔ دنیا اگر میرے لئے تڑپ رہی ہے تو تڑپ لے، میں کسی کے لئے کیوں تڑپوں، میری رعنائی ایک مستقل استغنا ہے۔ اور سارے عالم کی حیات اس کے ایک جلوۂ گریز پا کا ادنیٰ خراج۔"

سائکی یہ سنکر جوش میں آگئی اور ایک شاہانہ انداز سے کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی ہسیاہ ریشمی چادر جو اسکی رانوں سے لپٹی ہوئی کمر کی نزاکت کو اور نمایاں کرتی ہوئی سر تک پہونچ گئی تھی ڈھلک گئی، شانے کھل گئے بیاض گردن سینہ کی عریاں سپیدی سے مل گئی، سیاہ ریشمی بال پیٹھ پر گھوم گھوم کر چھلے بن گئے، ابروئیں تن گئیں مست آنکھیں اور متوالی بن گئیں ٹھیک یہی وقت تھا اور یہی عالم کہ کیوپڈ اپنا تیر و کمان سنبھالے کنجوں میں سے نکلا اور اس ارادہ سے نکلا کہ آج اپنا ترکش سائکی پر خالی کردے گا، لیکن نشانہ کو پیش نظر رکھنے کے لئے، کیوپڈ نے سائکی کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی تھا کہ تیر چٹکی سے چھوٹ گیا، کمان ہاتھ سے گر پڑی، چلہ اتر گیا اور کیوپڈ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔

آہ، کاش کوئی سائکی سے اسوقت جاکر کہدیتا کہ جس محبت کی اسکو جستجو تھی وہ خود اسکی آرزومند ہے، جس عشق کی اسے تمنا تھی وہ اب خود اسکا تمنائی ہے صیاد خود اسکا مجروح ہے عشق خود اس کا دیوانہ ہے اور تیر آپ اسکی نگاہ کا زخمی۔

اے کیوپڈ تو نے لاکھوں دلوں پر تیر چلائے ہوں گے، خدا معلوم کتنے سینے تونے مجروح کئے ہوں گے، لیکن وہ تیر جو حسن کے ترکش میں پنہاں ہیں وہ پیکان جنھیں صرف اک حسن دوشیزہ ہی کی نیم باز آنکھیں چلاسکتی ہیں تیری ناوک اندازیوں سے کہیں زیادہ تباہ کن ہیں۔

جا، تیرا تیر، اب صرف شہپر ہے بازو سے جدا، تیری کمان صرف اک خمیازہ ہے بے مزہ جو کچھ ہوتا تھا ہوگیا، فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا، حوروں نے اپنے کاشانوں میں سن لیا کہ وینس کا بیٹا آج سائکی کے باغ میں بیہوش پڑا ہے۔

وینس کو یقین تھا، اور وینس کیا جو بھی کیوپڈ کی بے پناہ ناوک اندازیوں کا حال سن چکا ہے وہ یہی یقین کریگا کہ ایک سائکی کیا اگر اس جیسی ہزاروں ہوں تو وہ چٹکی کی صرف ایک جنبش سے سب کے دلوں کو چلنی کرسکتا ہے، مگر فطرت کے پاس اک تیر اور تھا، ایک ناوک اور تھا۔ جو کیوپڈ کے تیروں کی طرح بدنام تو نہ تھا مگر ان سے زیادہ کارگر تھا اور جس وقت سائکی اس عالم میں آئی تو وہ ناوک اسکی نیشلی آنکھوں میں نگاہ بناکر رکھدیا گیا، کیوپڈ کو تو جراحت پہونچانے کے لئے قصد و ارادہ کی ضرورت تھی، اہتمام و انصرام درکار تھا کہ کمان میں تیر رکھے پھر چلہ کھینچ کر چٹکی ڈھیلی کرے، لیکن سائکی کی مست آنکھوں کو یہ ہوش کہاں، نہ وہ کسی قصد کو جانتی تھیں اور نہ کسی اہتمام کو، وہ نہ کسی ارادہ سے واقف تھیں اور نہ کسی انصرام سے، ایک بار پلک جدا ہوئی اور تیروں کی بارش شروع ہوگئی۔

غرضکہ کیوپڈ سائکی کے باغ سے زخمی ہوکر پھرا اور ایسا زخمی کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ

سکتے ہیں کہ اس کا دل پاش پاش تھا، اور اسکی روح یکسر جراحت کدہ۔

وہ باغ میں ٹہل رہا تھا اور نہایت انہماک کی حالت میں اپنے اضطراب و بیقراری سے لطف اٹھا رہا تھا کہ ونیس آئی اور خلاف معمول اس کو اس درجہ مغموم و افسردہ دیکھ کر متحیر رہ گئی وہ ایک لمحہ کے لیئے بھی یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ کیوپڈ کسی مہم سے ناکام و نامراد واپس آسکتا ہے چہ جائیکہ اسکا مضمحل ہوکر لوٹنا، وہ کچھ سمجھی اور سمجھ کر ٹھٹکی اور پھر آگے بڑھی، بڑھی اور ایک خاص انداز میں بولی " اے کیوپڈ مجھے اپنا ترکش دکھا کہ میں اسے خالی دیکھ کر خوش ہوں اور مجھ سے شکایت کر کہ آج تو تیر چلاتے چلاتے چٹکیاں دکھ گئیں، ہاں، ہاں سمجھتی ہوں شاید اب تو افسوس کرتا ہوگا کہ کیوں سائکی کو زخمی کیا، وہ ایسی ہی حسین ہے، اور اے کیوپڈ یہی وجہ تھی جس نے اسکی تباہی و بربادی کو لازم کر دیا تھا۔ اے کیوپڈ بول، جلدی کہہ کہ وہ دیوانہ وار دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے یا وادیوں میں کہیں خراب خستہ پھر رہی ہے"۔

کیوپڈ، سائکی کی نسبت تباہی و خستگی کا ذکر نہ سن سکا اور بیقرار ہوکر بول اٹھا۔

" ہاں میرا ترکش بھی خالی ہے اور چٹکیاں بھی دکھتی ہیں، کیا تیرے فرمان سے قاصر رہنے کیلیئے یہ عذر کافی نہیں ہے؟ میں سائکی کے مجروح ہونے پر افسوس نہیں کرتا، کیونکہ وہ مجروح نہیں ہے اور اگر کہیں وادیوں میں پریشان پھر رہی ہے یا وادیوں سے سر ٹکرا رہی ہے تو وہ تنہا نہیں ہوگی، کیوپڈ نے اپنی کمان توڑ ڈالی تیر دل کو پھینک دیا اور اب اس کی زندگی صرف یہی ہے کہ وہ سائکی کے درد و الفت میں اپنے تئیں مٹا دے، اے ونیس مجھے ملامت نہ کر، کیونکہ وہ فن تیر اندازی میں مجھ سے زیادہ مشاق نکلی اور نہ مجھ پر تاسف بھی نہ کر کیونکہ ساری عمر میں آج ہی تو یہ معلوم ہوا ہے کہ تیر چلانے سے تیر کھانے میں زیادہ مزہ ہے، آہ اگر مجھے یہ رشک نہ ہوتا کہ زمانہ اس تیر کو دیکھ لے گا تو میں اسکو اس حال میں کہ وہ میرے

خون کے بہترین قطرات سے رنگین ہوتا، اولمپس والٹیاس کی چوٹیوں پر نصب کر دیتا اور زمین کی اس بےمثل یادگار کی پرستش سارے آسمان والوں سے کراتا مگر نہیں وہ پہلو میں ہے اور وہیں رہے گا خواہ اس کے نکالنے کی کوشش میں جیوپٹر میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہی کیوں نہ کر ڈالے"۔

غالباً اسکے اظہار کی ضرورت نہیں کہ وینس پر کیوپڈ کی اس تقریر کا کیا اثر ہوا، وہ انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں وہاں سے چلی گئی، اور سب سے پہلا حکم جو اس نے واپس آکر دیا یہ تھا کہ "سامان سفر درست کیا جائے"۔

پریاں نہایت عجلت کے ساتھ اہتمام کے ساتھ مصروف ہو گئیں اور دربار کی کنواریاں وینس کے جلو میں چلنے کے لئے آمادہ۔ پردار گھوڑے جن کا ساز و یراق جواہرات کا تھا اور جن کی دم و ایال میں نہایت آبدار موتی گندھے ہوئے تھے، وینس کے زریں رتھ میں لگائے گئے اور مع اپنی کنیزوں، کنواریوں اور پریوں کے دفعتہ بادلوں کی طرح جو سما پر چھا گئیں اور پھر تھوڑی دیر بعد آفتاب کی روشنی میں تحلیل ہو کر غائب۔

(۴)

سارا یونان آج چراغاں ہو رہا تھا۔ اور یونان کا ہر ہر گھر بزم رقص و سرود۔۔ ایک سیلاب مسرت تھا، کہ ہر پیشانی اس میں غرق نظر آتی تھی۔ ایک طوفان نشاط تھا کہ ہر دل اس میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا، ہر گلی کوچہ میں زر و سیم کی بارش ہو رہی تھی، شاہی انعامات کا سلسلہ برابر جاری تھا اور نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کے کسی جشن میں ایک بادشاہ کے دستِ کرم نے اس سے زیادہ وسیع حصہ لیا ہو۔

آگسٹس والئی یونان کا دور سلطنت نہ صرف اس وجہ سے عہد زریں سمجھا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا سیر چشم و فیاض تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے

زیادہ رعایا کا خیر خواہ بادشاہ یونان کی تاریخ میں اور کوئی دوسرا نظر نہیں آتا وہ بہانہ تلاش کیا کرتا تھا کہ کس طرح رعایا کو زیر بار احسان کرے، اور اس سے بہتر موقعہ اسکے لئے اپنا حوصلہ نکالنے کا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی دو حسین بیٹیوں کی شادیاں کر رہا تھا، سارا دربار زر اندوز تھا اور دربار کی ہر چیز جواہر کار۔

یونان کے تمام امراء جمع تھے اور پایہ تخت کی ہر حسین لڑکی شاہی مہمان تھی اگلاس و کیوپڈس، سائکی کی دونوں بہنیں سر سے پاؤں تک جواہرات میں غرق دلہن بنی بیٹھی تھیں اور ان کے خوش نصیب شوہر ان کے پہلوؤں میں مست و سرشار۔ ملک کی بہترین موسیقی سازوں سے نکل رہی تھی، اور یونان کی لطیف ترین شراب بلوری و الماس گلاسوں سے چھلک رہی تھی۔

ٹھیک یہی وقت تھا اور جشن طرب کا یہی عالم کہ دربار کے مکان کا ایک دروازہ کھلا اور کوئی چیز اندر آکر روشنی میں مل گئی اور بادشاہ چیخ مار کر تخت سے نیچے گر پڑا۔

نشے ہرن ہو گئے، مسرتیں منغص ہو گئیں، سکون کی جگہ اضطراب نے لے لی، اطمینان پر سراسیمگی نے قبضہ کر لیا۔ اور ہر شخص بادشاہ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا، آنکھیں شدت سے ابل پڑی تھیں، اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا بات ہے، ملکہ چیخ کر بادشاہ سے لپٹ گئی، کہ "خدایا یہ کیا ہوا!؟" اس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا، مگر ہاں ایک وینس، جو لوگوں کی نگاہ سے غائب گویا کہتی ہوئی چل دی کہ "یہ ابتدا ہے، انتقام کی۔ سائکی وینس کے بیٹے کو بیقرار کرکے زندہ رہے، ناممکن ہے۔"

آن واحد میں سارے یونان کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کسی سخت مرض میں مبتلا ہے تو لوگ دوڑ پڑے ماہرین طب نے اپنی ساری تدبیریں ختم کر دیں، شیوخ

معابد دعا مانگتے مانگتے تھک گئے لیکن درد میں کسی قسم کی تخفیف نہ ہوئی اور اس لیۓ پایان کار تمام ارکین وعقلائے سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ سنگ مقدس سے چارہ جوئی کی جائے اور جو ہدایات اس کی ہوں ان پر عمل کیا جائے۔

جس عہد کا یہ واقعہ ہے اسوقت یہ دستور تھا کہ جب کوئی سخت مصیبت پیش آتی تھی اور کوئی انسانی تدبیر کارگر نہ ہوتی تو دیوتاؤں کی روحوں سے التجا کی جاتی تھی اور اس عرض والتجا کے لیۓ ایک خاص مقام مقرر تھا، یہاں ایک پتھر نصب تھا جسے سنگ مقدس کہتے تھے، اس عرض کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پتھر پر ایک تحریر نظر آجاتی تھی جو نہ صرف اس مصیبت کی حقیقت سے آگاہ کرتی بلکہ دفع بلا کی تدبیر بھی ظاہر کرتی تھی، چنانچہ اسوقت صحبت میں جبکہ بادشاہ کی تکلیف ہر لحہ بڑھ رہی تھی اور کسی طرح اسے آرام ہوتا نظر نہ آتا تھا، سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ سنگ مقدس سے مدد چاہی جائے۔ چنانچہ اس نتیجہ پر پہونچنے کے لیۓ ملکہ امرائے دربار، ارکین سلطنت اور اپنی دونوں دلہن بیٹیوں کے ساتھ روانہ ہوگئی، اور سائکی کو بادشاہ کی تیمارداری کے لیۓ چھوڑ دیا۔

سب وہاں پہونچے اور جلدی جلدی وہ تمام مراسم عبودیت ادا کیۓ گئے، جن کا ادا کرنا ضروری تھا، مگر آہ کسے خبر تھی کہ وینس نے اس سنگ مقدس پر ایسا سخت فیصلہ لکھ دیا ہے، جس کے دیکھنے اور سننے کے لیۓ نہایت سنگین دل کی ضرورت ہے۔

جب دعائیں اور التجائیں ختم ہوگئیں تو ملکہ دھڑکتا دل لیکر بڑھی اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس پردہ کو ہٹایا، جو سنگ مقدس پر پڑا ہوا تھا۔ اس تحریر کا مفہوم یہ تھا۔

"رئیس یونان بیمار ہے، لیکن اسکی بیماری کا علاج انسانی قوت سے باہر ہے عالم کے طبیبوں کو بلاؤ۔ لیکن وہ نہ بتا سکیں گے کہ یہ بیماری کیا ہے، ساری دنیا

کے اختر شناس جمع کرو، لیکن وہ نہ کہہ سکیں گے کہ یہ کیا بلا ہے کیونکہ وہ کوئی مرض نہیں جسے طبیب پہچان سکے، وہ کسی ستارہ کا اثر نہیں جسے نجومی دور کر سکے۔ وہ ایک قہر ہے جو بہشت کے مالک اور دیوتاؤں کے سردار جیوپڑ نے اس پر نازل کیا ہے' یہ اس کا غصہ ہے کہ اس سے جلد پناہ نہ مانگی گئی تو سارا یونان بہت جلد تباہ ہو جائے گا، اگر یونان کے امراء، یونان کی رعایا اپنے بادشاہ کی صحت اور آئندہ امن وسکون کے آرزومند ہیں ان کو چاہیئے کہ شاہزادی سائکی کو کوہ الوندکی سب سے اونچی چوٹی پر لے جائیں اور شاہ بلوط میں باندھ کر چلے آئیں۔ جیوپڑ اس قربانی کو کسی عفریت کے ذریعہ سے قبول کرے گا، اور بادشاہ فوراً صحیح و تندرست ہو جائے گا اور اگر یہ قربانی دو دن کے اندر نہ کی گئی تو پھر ہزار سائکی کی قربانیاں بھی اس مصیبت کو دور نہ کر سکیں گی"۔

ملکہ غش کھا کر گر پڑی، امراء، متحیر رہ گئے، کنیزوں نے اپنا سر پیٹ لیا مگر اس غمگین جماعت میں' اس حلقۂ ماتم میں دو روحیں ایسی بھی تھیں جن کی حقیقی مسرت کا یہ آج پہلا دن تھا' اور جن کے لیئے اس ظالم پتھر کی یہ ظالم تحریر اک شعر سے زیادہ پُرلطف ایک نغمۂ صباحی سے زیادہ مسرت بخش تھی۔

اگلاریس کیوپڈس نے اپنی ماں کو اٹھایا اور ہوش میں لاکر جلد واپس چلنے پر اصرار کرتی ہوئی بولیں' "اے ماں اٹھ، خدا جانے بادشاہ کا کیا حال ہو گا ہر چند جیوپڑ کا فیصلہ نہایت شدید و ظالم ہے' لیکن اس کا غصہ اس سے زیادہ بے پناہ و بے رحم ثابت ہوگا۔ اگر سنگ مقدس کی تحریر پر عمل نہ کیا گیا"۔

بہرحال ملکہ کسی نہ کسی طرح واپس آئی، لیکن اک ایسے روح فرسا غم کا بوجھ اپنے دل میں لیئے ہوئے کہ اگر خود اسے اپنی جان کی قربانی کرنی پڑتی، تو

وہ نہایت خوشی سے اس کے مقابلے میں برداشت کر لیتی، مگر نہیں فطرت اسوقت اس کے نسوانی فرائض کا امتحان لے رہی تھی، سخت المناک آزمایش میں ڈالنا چاہتی تھی، شوہر اس کا دل تھا اور بیٹی اس کی جان اور اس لیئے کوئی قوت اس امر کے فیصلہ میں مدد نہیں دے سکتی تھی کہ وہ دل کو جان پر قربان کرے، یا جان کو دل پر۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ہاتھ سے دینا اگزیر ہے مگر کس کو دے اور کس کو لگائے رکھے، یہ ایک ایسی کشاکش تھی جس سے نکلنا آسان نہ تھا۔

وہ محل واپس آئی تو بادشاہ کے کرب میں اس نے اضافہ پایا، لیکن جب اس نے سائکی کو باپ کے پاس سخت حالت افسردگی میں بیٹھا ہوا دیکھا تو وہ "ہائے سائکی" کہہ کر زمین پر گر پڑی اور بیہوش ہو گئی، ہمیں خبر نہیں کہ وہ کبتک اس عالم میں رہی، اور کن کن شدائد کا مقابلہ اس نے کیا، مگر ہاں، جس وقت صبح کو اسکی آنکھ کھلی تو چہرہ کا رنگ بالکل اڑا ہوا تھا، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے اور ضعف و نقاہت کا وہ عالم تھا کہ کسی کے سہارے سے اٹھنا بھی دشوار تھا۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی چاروں طرف دیکھا اور یہ یقین کرنا چاہا کہ جو کچھ گزرا یہ سب خواب تھا، مگر جب اس نے کئی بار اپنی آنکھوں کو کھولا اور بند کیا تو اسے سمجھنا پڑا کہ یہ سب حقیقت و واقعہ ہے اور ویسا ہی جگر خراش ہے جیسا اس نے اپنے پندار میں بحالت خواب وہ بیہوشی پایا تھا۔

نہ صرف امرار دربار و اراکین سلطنت، بلکہ سارا یونان سراسیمہ تھا کہ دیکھیے ملکہ کس نتیجہ پر پہونچتی ہے بعض کا خیال تھا کہ ایسا عادل بادشاہ، ایسا سخی و رحیم حکمراں پھر یونان کو نصیب نہ ہوگا، اس لیئے جس قدر گراں قیمت پر بھی اس کی زندگی واپس مل سکے ارزاں ہے، لیکن بعض کی تمنا یہ تھی کہ جو کچھ ہو سائکی زندہ رہے، کیونکہ بادشاہ

تو ضعیف ہے اور بہر حال یونان کو ایک نہ ایک دن اس کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہے لیکن سائکی جس نے ابھی اپنی زندگی کی صرف سترہ بہاریں دیکھی ہیں اور جس کی ذات ساری زمین کے لئے مایہ ناز ہے، روز روز پیدا ہونے کی چیز نہیں۔

اسی حالت منتظرہ میں دفعتہً بادشاہ کی خوابگاہ سے سخت چیخ کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ بادشاہ دم توڑ رہا ہے۔ ملکہ نے دفعتہً آنکھیں کھول دیں۔ اور اس سکوت کے دور کرنے کے لیئے جو اسوقت سارے دربار پر چھایا ہوا تھا، اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے جس کے سننے کے واسطے یونان کا ہر متنفس ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا وہ اٹھی اس عزم کو اپنے خط و خال میں لیئے ہوئے، اس عجیب و غریب استقلال سے اپنے اندرونی اضطراب کو چھپائے ہوئے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ اپنے تاثرات سے جنگ کر کے کوئی فتح حاصل کر چکی ہے، اور اب جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہے اس پر افسوس کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ سائکی بھی مثل میرے بادشاہ کی مملوکہ ہے اور اس لیے مجھے کوئی حق نہیں کہ ایک مالک کو اپنی مملوکہ سے نفع نہ اٹھانے دوں۔ اگر سائکی کو ہاتھ سے دیدینے کے بعد بادشاہ اپنی زندگی حاصل کرلے گا تو اسکی مثال بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے کوئی شخص اپنی محبوب ترین چیز دیکر کسی مصیبت سے نجات حاصل کرے

جب وہ اس تاویل سے اپنی تسلی کر چکی تو اپنے مریض شوہر کے بستر علالت پر گئی اور سب کے سامنے سائکی کو مخاطب کر کے بولی کہ:-

"اے بٹی، تیار ہو جا، میں تجھے اجازت دیکر اپنے فرض سے سبکدوش ہوتی ہوں اور اسکی تعمیل کر کے تو اپنے فرض کو ادا کر، اے سائکی ہر چند مجھے یقین ہے کہ تیرے بعد میں زیادہ نہ جی سکوں گی۔ لیکن اگر مجھے اپنی ہی جان دینی پڑتی تو کیا مجھے پس و پیش کرنا چاہیئے تھا، پھر تیرا چلا جانا بھی تو میرا اپنی ہی جان کا چلا جانا ہے۔ اے میرے

جگر کے ٹکڑے دیکھ، اپنی کمزوری سے اسوقت میرے ارادوں کو کمزور نہ کر دینا۔ تو زیادہ پریشان نہ ہو، کیونکہ تیری ماں بہت جلد تجھ سے آملے گی اور پھر کبھی جدا نہ کرنے کے لیئے تجھے اپنی آغوش میں لے لیگی۔"

اب ملکہ کی آنکھوں میں آنسو امنڈ امنڈ کر آنے لگے اور اسکی آواز کانپنے لگی۔۔ یہانتک کہ اسکی ہچکی بندھ گئی اور مجبوراً آنکھ پر رومال رکھ کر اسے ہاتھ کا اشارہ کرنا پڑا کہ "بس اب سائکی کو لے جاؤ اور دیر نہ کرو۔"

ہم نہیں کہہ سکتے کہ سائکی نے اول اول اس خبر کو کہ وہ قربان گاہ پر چڑھائی جائے گی، کس طرح سُنا اور اس حالتِ انتظار کو جبتک ملکہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کیونکر کاٹا، مگر ہاں یہ ایک واقعہ ہے کہ جب اسکی نسبت اک قطعی رائے قائم کر لی گئی اور اسے پہاڑ پر لے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں، تو وہ بالکل مردہ سی تھی، اور اس کے قواے نے بالکل جواب دیدیا تھا۔

موت سے ڈرنا بالکل فطری امر ہے، اس لیئے سائکی کیونکر مستثنیٰ ہوسکتی تھی، لیکن اس میں کلام نہیں کہ جس غم نے اسے گونگا بنا دیا، جس صدمہ نے اسکی آنکھوں سے آنسو جذب کر لیئے وہ صرف یہ تھا کہ "میری جدائی کو ماں، کیونکر برداشت کرسکے گی۔" اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دیئے۔ بدن ڈھیلا کر دیا۔ اور اس طرح گویا اس نے اجازت دیدی کہ اُس جسم کو جہاں جی چاہے لے جاؤ۔

اگلاریس دکیوپڈس نے جلدی جلدی سارا انتظام روانگی کا کیا اور غریب سائکی کا زندہ جنازہ ایک گاڑی پر ڈال کر کوہ الوند کی طرف چل دیئے۔

سوگوار ماں، جس کی حالت دیکھ دیکھ کر لوگوں کے کلیجے پھٹے جاتے تھے ساتھ ساتھ تھی اور اک ہجوم تھا جو پروانہ وار اس شمع مردہ کو گھیرے ہوئے تھا، سارے شہر میں اک کہرام برپا تھا، اور ہر گھر میں نالہ و ماتم۔ کوئی آنکھ نہ

تھی جو خونبار نہ ہو، اور کوئی دل نہ تھا جو بے قرار نہ ہو۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسوقت ساری کائنات پلٹ دی جانے کو ہے، اور آسمان ٹوٹ پڑنے کو ہے۔

ایک گھنٹہ میں یہ جماعت اس چوٹی پر پہونچ گئی جہاں سائکی کی قربانی پیش کی جانے والی تھی اور جلد جلد اسے شاہ بلوط کے اس درخت سے باندھ دیا جو سب سے زیادہ نمایاں رہا تھا۔

اب اس کی نازک کلائیاں جو ایک ایک چوڑی کا بار بھی برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ پس پشت رسّی سے باندھ دی گئی تھیں اور وہ کمر جس کی نزاکت کی پیمائش کے لیئے بالشت فیتہ بھی زائد تھا درخت کے زبردست تنے سے کس دی گئی تھی اسکی وہی ریشمی چادر جسے وہ نصف باندھتی اور نصف اوڑھ لیتی تھی اسکے جسم پر تھی، لیکن وہ نقاب جو دو سال سے اس کے چاند سے مکھڑے کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تھا اب جدا تھا، کیونکہ یہ بھی رسم تھی کہ جس کی قربانی کی جائے اس کا سر و چہرہ برہنہ کر دیا جائے۔

سائکی کا یہاں تک لایا جانا، اسکی کمر اور کلائیوں کو باندھ کر درخت سے کس دیا جانا، یہ سب عالم بیہوشی میں ہوا، لیکن جس وقت اسکی ماں نے بیتابانہ اک آخری بوسہ اس کا پیشانی کا لیا تو سائکی کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور چونکہ وہ اب ہاتھ نہ جوڑ سکتی تھی (کیونکہ وہ بندھے ہوئے تھے) وہ قدموں پر نہ گر سکتی تھی، (کیونکہ وہ درخت سے کس دی گئی تھی) وہ کچھ نہ کہہ سکتی تھی (کیونکہ اس کے حلق و زبان خشک تھے) اس لیئے اسکی وہ ساری التجائیں، وہ ساری لجاجتیں جو دیگر اعضاء سے کی جا سکتی تھیں اب صرف اسکی آنکھوں میں کھنچ کر آگئی تھیں، اور اس لیئے عالم یاس میں اس کی آنکھوں کا ماں سے طلب رحم کرنا، حقیقتاً ایک ایسا دل ہلا دینے والا منظر تھا جس کی تاب بھلا غریب ماں

کیا لاسکتی تھی، وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی، لوگوں نے اسے اُٹھایا اور سائکی کو یوں ہی تنہا پہاڑ کی چوٹی پر چھوڑ کر چل دئے۔

مگر آہ، وہ سائکی کا کسمسا، کسمسا کر اک آخری نگاہ مایوس کے ساتھ دیکھنا اور اسوقت تک اپنی نڈھال گردن موڑ موڑ کر دیکھتے رہنا، جبتک سب لوگ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے (کہ شاید اب بھی کوئی رحم کرے) ایسا دردناک نظارہ تھا کہ شاید اگر وینس خود موجود ہوتی تو وہ بھی آنسو بہاتی، مگر آہ، نہ وینس وہاں تھی کہ اسی کو کچھ رحم آتا۔ اور نہ ماں وہاں موجود تھی کہ پھر ایک بار چیخ کر اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگا لیتی۔ صرف ایک سنسان پہاڑ کی چوٹی تھی اور وحشت ناک جنگل کی خاموشی جس کی ساکن و وسیع فضا میں سائکی کی نگاہ واپسیں گم ہو گئی اور وہ خود ایک طرف گردن ڈال کر بیہوش۔

(۵)

"اے خواب کی ملکہ، اے نیند کی دیوی جا اور اس کی آنکھوں کو ایک شیریں سکون سے بھر دے، اور تو بھی اے نسیم کی دیوی اٹھ اور اسکی کمر اور کلائی کے بند جدا کر دے، کیونکہ فانی نوع انسان میں ایسا ساحرو دلدوز حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا جلدی کرو کیونکہ میرا دل اسکی محبت میں پھنک رہا ہے۔" کیوپڈ کی اس التجا کو ان دیویوں نے سنا اور دفعتہً کوہ الونڈ کی اس خوفناک چوٹی پر پہونچ گئیں، جہاں اک شاہ بلوط کے تنے سے یہ چاند طلوع ہو رہا تھا۔

شاخوں میں جنبش شروع ہوئی۔ پتیاں ہلنے لگیں اور رفتہ رفتہ ایک لطیف و نکہت بیز ہوا نے سارے پہاڑ کو معطر کر دیا۔ سائکی کے دماغ کا اس تعطر سے متاثر ہونا تھا اس کی آنکھیں جھپک گئیں اور اس کا سونا تھا کہ بادنسیم

نے درخت سے جدا کر کے اپنے ہاتھوں پر سنبھال کر فرش پر لٹا دیا۔

سائکی بے خبر پڑی سو رہی تھی، چادر اس کے سر و سینہ سے جدا تھی اور اسے یہ ہوش نہ تھا کہ ایک حریص آنکھ اسے دیکھ رہی ہے۔ اس لیئے اپنا عریاں حصہ جسم چھپا کر اسے سمٹ جانا چاہیئے۔ اس کے بال ہوا سے اُڑ اُڑ کر اس کی پیشانی اور چہرہ پر آ رہے تھے اور اسے کچھ خبر نہ تھی کہ ایک غیر شخص اس منظر سے لطف اٹھا رہا ہے، اس لیئے اپنے بال درست کر کے چہرہ پر نقاب ڈال لینا چاہیئے۔

کیوپڈ نے اس سے قبل جب سائکی کو باغ میں دیکھا تو وہ بے نقاب ضرور تھی، مگر محوِ خواب نہ تھی، لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جب حُسن سو جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ اور جب لباس بے ترتیب اور برہم ہو جاتے ہیں تو ایک عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے۔

کیوپڈ خاموش و متحیر کھڑا دیکھ رہا تھا، اور تباہ ہو رہا تھا، اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سائکی کی کھلی ہوئی بلوریں گردن کو دیکھا کرے یا صرف اس کے عریاں سیمیں سینہ کو، اس کے یاقوتی ہونٹوں پر جان دے یا اس کی کشادہ پیشانی پر۔ اس کی فہم اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ سائکی کی سیاہ خمدار ابروؤں سے محبت کرے یا اس کی متوالی آنکھ سے، وہ متحیر تھا کہ اسکی نازک کمر پر اپنے تئیں تباہ کرے یا اسکی کشیدہ قامتی کے انتہائی تناسب پر دہ دیر تک اسی عالم حیرت و استعجاب میں کھڑا رہا، اور آخرکار یہ فیصلہ کر کے کہ سائکی کا رتبہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ کوئی شخص اپنے تئیں اس سے محبت کرنے کا اہل سمجھے وہ اس کے قدموں پر گر پڑا اس کے رنگین تلوؤں پر ایک طویل بوسہ دیکر یہ کہتا ہوا اٹھ بیٹھا کہ:-

"اے سائکی میں تجھ سے محبت نہیں کروں گا، تجھ سے پیار نہیں کروں گا، تجھ سے عشق نہیں کروں گا۔ کیونکہ یہ بھی اک ناقص طریقہ اظہار جذبات کا ہے، میں تیری عظمت کروں گا۔ تجھے پوجوں گا، تجھ سے ڈروں گا، ایک ایسا ڈر اپنے دل میں لیئے ہوئے جو کبھی جیوپڑ کی طرف سے بھی مجھے پیدا نہیں ہوا، تجھے دیکھوں گا اور کانپا کروں گا بدن کی اس کپکپی کے ساتھ جو کبھی میرے اوپر طاری نہیں ہوئی، میں تجھے ایک ملکہ نہیں، ایک دیوی، آہ یہ بھی نہیں بلکہ خدا جانے کیا سمجھوں گا، اور اگر تو نے اجازت دی تو اپنے تئیں تیرا ایک خادم، ایک ادنیٰ پرستار، آہ یہ بھی نہیں بلکہ ایک غریب فقیر، اک ذلیل گدا، اک خوار بھکاری اور اس سے زیادہ حقیر وہ کچھ سمجھوں گا، جسے میں الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔"

مارفیس و زفر نے سائکی کو اٹھایا اور اپنے پروں پر رکھ کر شاداب کوہ اولمپس کی اس کنج میں لے گئیں جہاں کیوپڈ نے خاص طور پر ایک قصر سائکی کے لیئے تیار کرایا تھا، وہ اک برج میں جو اس قصر کا بہترین حصہ تھا لٹا دی گئی اور مارفیس اپنی نیند اس کی آنکھوں سے لے کر زفر کے ساتھ غائب ہو گئی۔

سائکی اپنی آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی اور سخت متحیر ہوئی جب اس نے اپنے تئیں اک طلائی برج میں جواہر کار فرش پر پایا اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں کہ شاید یہ کوئی دلکش خواب ہے اور پھر کھول دیں کہ کاش خواب نہ ہو، مگر بے صبر کیوپڈ سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا۔ اور اک شیریں آواز سائکی کے کانوں میں آئی کہ "یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔" اور اسی کے ساتھ چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے، سونے کی بوچھاروں میں حسین کیوپڈ یہ کہتا ہوا نکل آیا کہ "متعجب نہ ہو، تیرا غلام تیرے سامنے حاضر ہے، اسے کوئی حکم دے۔ شاہانہ لب و لہجہ کے ساتھ کچھ کرنے کو کہہ کیونکہ تیری خدمت اس کی زندگی ہے، اگر تو نفرت نہ کرے تو میں کہوں کہ وہ عفریت میں ہی ہوں۔ جس کے لیئے تیری قربانی چڑھائی

گئی تھی، اور اگر تو خفا نہ ہو تو وہ عفریت تیری تمام خواہشات قلب مہیا کر دے"۔

سائکی کو سمجھایا گیا تھا کہ جب اس کی قربانی پیش کی جائے گی تو ایک بدصورت مردم خوار عفریت اس کا شوہر بنے گا، لیکن وہ تو اپنے سامنے ایک حسین نوجوان کو دیکھ رہی تھی اور ہر چند وہ نقاب پوش تھا لیکن اعضا کا تناسب، اس کا کندنی رنگ جو نقاب سے چھنا پڑتا تھا، کہے دیتا تھا کہ اس نقاب کے نیچے اک نہایت ہی خوبصورت اور پُرشباب، چہرہ چھپا ہوا ہے۔

اس کے وہ تمام حیات جو یونانؔ میں مردہ ہو چکے تھے، دفعتہً زندہ ہو کر پھر اسکے خون میں دوڑنے لگے، اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا، انفعال سے بھیگ گیا یعنی گلاب پر پھر وہی شبنم آگئی جس سے اس کا حُسن اور چمکنے لگتا تھا۔ وہ آخرکار اپنی تمنّا سے مغلوب ہو کر اٹھ بیٹھی اور کیوپڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی کہ" اگر تو ہی میرا شوہر ہے تو پھر یہ حجاب کیوں؟ یہ نقاب کیسا؟ تجھے کیا حق حاصل ہے کہ ان آنکھوں کو مجھ سے چھپائے رکھے۔ جن میں مجھے اپنے جذبات اپنی تمنّاؤں کی وسعت کو پڑھنا ہے، وہ جیسی بھی ہیں میری ہیں، میں اُن سے محبت کرنا سیکھوں گی گو انھیں مجھ سے محبت نہ ہو، میں اپنے بہترین ہدایائے عشق ان کے سامنے پیش کروں گی، خواہ وہ کتنی ہی مجھ سے چرائی جائیں"۔ یہ کہتے ہوئے سائکی نے اس کا نقاب نوچنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کیوپڈ نے اس کی کلائیاں پکڑ لیں اور نہایت ہی نرم و پُر لجاجت لہجہ میں بولا کہ:-

" اے سائکی میں تیرا ادنیٰ غلام ہوں تو مجھے جو چاہے سمجھ لیکن مجھے اس بات پر مجبور نہ کر، جس کو میں اگر الگ کر ڈالوں تو پھر تجھی کو افسوس کرنا پڑے گا اگر تو مجھ پر صرف اس لیئے رحم کر سکتی ہے کہ صرف نقاب کا جدا کرنا ہی اک ایسا کام ہے جس کے متعلق وہ تیرا فرمان ماننے کے لیئے تیار نہیں، تو تو رحم کر، ورنہ اے سائکی پھر میں تجھ سے چھٹ

جاؤں گا اور مر جاؤں گا۔"

سائکی کچھ تو اس تقریر سے متاثر ہوکر اور کچھ اس کے مردانہ گرم ہاتھوں میں اپنی نازک کلائیوں کو پاکر رک گئی۔ ٹھہر گئی اور ایسا محسوس کرنے لگی۔ گویا اس کے ہاتھ ڈھیلے ہیں، اس کے بدن میں سکت نہیں ہے اور وہ بے اختیار اسکی طرف کھنچی جا رہی ہے آخر کار اس نے اپنے سارے بدن کا بوجھ کیوپڈ پر ڈال دیا، اپنے تئیں اسکی آغوش میں سونپ دیا اور اس نامعلوم لذّت سے مست و سرشار ہوکر جو اس سے قبل اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی، اور جس کے لئے وہ اک جستجوئے مبہم بنی ہوئی تھی، آنکھیں پلٹ کر کیوپڈ کی گود میں بے حس ہوکر گر پڑی۔

ہر چند، ملک، وطن ماں باپ کو یکایک چھوڑنے کا رنج، ایسا معمولی رنج نہیں جسے ایک عورت اور عورت بھی ایسی حساس، ایسی لطیف الخیال اور ایسی نازک طبع جلد فراموش کر سکے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شباب کے عالم میں اگر کوئی حقیقی اور سچی حس رکھتی ہے تو وہ وہی ہے جس کا تعلق صرف اس کے شباب سے ہے، یہ ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں وہ دیگر مشاغل حیات بھی با انہماک ہو مختلف اسباب تفریح سے کتنی گہری دلچسپی کا اظہار کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ذات سے وابستہ ہونے والے اور تمام تعلقات کے ساتھ یکسر محویت و استغراق ہو جائے لیکن اس کے سامنے اس کے حسن کا ذکر کردو۔ جس سے اس کا شباب براہ راست متاثر ہو، پھر یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا بھر کی تمام باتیں چھوڑ کر اس طرف متوجہ نہ ہو جائے، یہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنے حسن و شباب کے متعلق جس قدر دوسروں کی رائے زنی سے خوش ہوتی ہے، اتنی وہ خود آئینہ دیکھ کر بھی کبھی مسرور نہیں ہوتی، حالانکہ وہ گھنٹوں اس کے سامنے گیسو سنوار سنوار کر مزے لیا کرتی ہے، وہ چاہتی ہے کہ اس کی جوانی میں جوانی ہی کا ذکر ہو، اور کوئی گفتگو اس کے سامنے نہ ہو۔

ہم نے مانا کہ سائکی کو اپنی ماں سے بہت زیادہ الفت تھی، اپنے باپ پر جان دیتی تھی (اور اس نے دے ہی دی) اپنے وطن کی شیدا تھی، لیکن یہ الفت، یہ جاں نثاری یہ قربانی اسی وقت تک تھی جبتک کوئی اس کا چاہنے والا نہ تھا، لیکن جب اس نے اپنے سامنے کیوپڈ ایسا حسین نوجوان دیکھا، اور اسکی دارفتگی، اسکی افتادگی، اور اس کی پرستاری اپنی آنکھوں سے دیکھ لی، کانوں سے سن لی اور ہاتھوں سے چھولی، تو وہ اپنے سارے افکار بھول گئی، سارے غم طے کر گئی، کیونکہ اب کوہ اولمپس کی وسیع خلوت میں سوائے اک حیاتِ معاشقہ کے اسے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور وہ کچھ نہ سمجھ سکتی تھی مگر یہ کہ وہ اپنے بارِ شباب سے خستہ ہو کر جس کی خستگی کو وہ کم از کم تین چار سال سے برداشت کرتی چلی آتی تھی، آنکھ بند کر کے کیوپڈ کی محبت بھری آغوش میں گر پڑے، اس نے سمجھ لیا کہ وہ نوجوان ہے، حسین ہے، اس لیئے اس نے مطلق پروا نہیں کی، اگر کیوپڈ کا چہرہ بے نقاب نہ تھا، اس نے جان لیا کہ وہ اس سے محبت کرنے کے لیئے آمادہ ہے، اس لیئے کون اور کیا کے جھگڑوں میں اپنے لطف کو خراب کرنا حماقت ہے۔

کیوپڈ کی خود کیا حالت تھی، وہ سائکی کے نرم و نازک جسم کو اپنے جسم سے متصل پا کر کیا سوچ رہا تھا؟ غالباً یہ سوال جواب طلب نہیں کبھی) وہ سائکی کی آنکھیں چومتا تھا اور کبھی لب، کبھی اس کے سینے سے آنکھیں ملتا تھا اور کبھی گردن سے غرض کہ وہ بالکل دیوانہ سا تھا، مجنوں تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکر وہ سائکی سے سیر و آسودہ ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس نے سائکی کے پُر لمس ہونٹوں پر اپنے لب رکھ دئے اور وہ بھی مست ہو کر اپنے تئیں بھول گیا، اور اسکی آغوش میں بیہوش ہو کر پڑ رہا۔

(۶)

ابتداء آفرینش سے لے کر اس وقت تک کوہ اولمپس کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس نے کسی انسانی ہادی کو اپنے دامن میں جگہ دی ہو کیونکہ اس کی بلند چوٹیاں نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ جیوپٹر کی تجلی گاہ تھیں۔ بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کو آباد کرنا ایک انسانی قوت سے باہر تھا ہمیشہ سنسان اور ویران رہیں نا قابل پیمائش عمیق غاروں کی تاریک وسعت، نہایت ہولناک سیاہ پانی کے عمیق چشموں کی اس وسعت میں روانی، بڑے بڑے درختوں سے پیدا ہونے والا ہوا کا مہیب سناٹا، خوفناک درندوں کی گرج کی آواز بازگشت۔ بڑے بڑے کانٹوں والی جھاڑیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ، اور اسی طرح کی اور بہت سی ڈراؤنی چیزوں اور جسم میں لرزہ پیدا کر دینے والے مناظر کا مجموعہ ایسا تھا کوہ اولمپس جہاں کیوپڈ نے سائکی کے ساتھ رہنا پسند کیا، اور یہ انتخاب اس نے اپنی کمسنی اور ناتجربہ کاری ہی کے لحاظ سے کیا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب وینس کو خبر ہو جائے گی، تو وہ کوئی تدبیر سائکی کی ہلاکت کی نہ اٹھا رکھے گی۔ پھر وہ کہاں جاتا؟ کوہ اولمپس ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کسی کی رسائی نہ تھی اور وہ اپنی زندگی سائکی کے ساتھ امن و سکون کی حالت میں بسر کر سکتا تھا، کیونکہ جب جیوپٹر کو کوئی عذاب نازل کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی پہاڑ کی چوٹی پر اتر آتا تھا اور عذاب نازل کرتا تھا، چنانچہ اس سے قبل بارہا کوہ اولمپس کی چوٹیوں سے جیوپٹر کا غصہ آگ بن کر نکلا اور وہ دور دور آبادیوں کو تباہ و برباد کر گیا، پھر ایسی جگہ جو آسمان کے دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا کے غصہ کرنے کی جگہ ہو کون جا سکتا تھا، مگر چونکہ کیوپڈ جیوپٹر کا محبوب ترین بیٹا تھا اور اپنے فرائض کے لحاظ سے نہایت اہم مانا جاتا تھا اس لئے وہ وہاں پہونچ سکا، اور اپنے ساتھ رہنے والی مخصوص

دیویوں، مارفیس و زفر کو بھی اپنے ساتھ لاسکا۔

اس زرین قصر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، جو اس نے سائکی کے خوش کرنے کے لئے تیار کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیوپڈ سے مواصلت کی مسرت ایسی مسرت سائکی کے لئے تھی کہ ایک ہفتہ تک تو اسے یہ ہوش بھی نہ ہوا کہ وہ ہے کہاں۔ مگر پورے ایک ہفتہ تک اس برج طلائی کو خلوت میں بند رہنے کے بعد وہ وقت آیا کہ سائکی کو اپنی نئی زندگی پر کچھ غور کرنا پڑا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ اب کیوپڈ اس سے زیادہ مسلسل وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ انھیں آٹھ دس دن میں کیوپڈ کے معطل بیٹھ جانے سے کرۂ ارض میں کج خلقی، بے رحمی اور درندگی بہت پھیل گئی تھی اور اس لیئے ضرورت تھی کہ وہ اپنا تیر و کمان سنبھال کر نہایت سرگرمی کے ساتھ اس کمی کو پورا کرے، لیکن سوال یہ تھا کہ جب تک وہ نہ آئے گا سائکی کیونکر اپنا وقت بسر کرے گی، کن مشاغل میں اپنے تئیں اُلجھائے رکھے گی؟ اس کا جواب ذرا دشوار تھا، مگر آخر سائکی نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کیوپڈ سے التجا کی کہ وہ حوالی قصر میں ان تمام اسباب تفریح کو مہیّا کردے، جن کی وہ اپنے زمانۂ دوشیزگی میں عادی تھی۔

کیوپڈ نے دو گلدستے اٹھا کر زمین پر دے مارے، جو خود تو غائب ہو گئے، لیکن بجائے ان کے دو حسین فرشتے جن کے پروں میں الماس ٹنکے ہوئے تھے، اور جن کی عمریں ۱۴-۱۴ سال سے زائد نہ تھیں نکل کر سائکی کے سامنے کھڑے ہو گئے، کیوپڈ نے ان سے کہا کہ " جاؤ اور قبل اس کے کہ ملکہ سائکیؔ دروازہ تک پہونچے، تمام حوالی قصر کو ان مناظر سے آباد کردو جو والی یونانؔ کے محل سے متعلق ہیں۔" ان کو رخصت کرکے کیوپڈ نے جتنے گلدستے وہاں رکھے تھے سب کو فرش زمین پر پٹکنا شروع کیا، یہاں تک کہ چشم زدن میں سارا قصر حسین پریوں سے

بھر گیا اور سائکی آن پر دار پیش خدمتوں سے گھر گئی، ان کے ہاتھ میں مختلف قسم کے ساز تھے، جن کے تاروں سے ارتعاش کے وقت عجیب سکرخوشبو پیدا ہوتی تھی، سائکی اس زمانہ قیام میں اس نوع کے عجائب و غرائب سے اس درجہ آشنا ہوگئی تھی کہ اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی اور کیوپڈ کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر پریوں کے حلقہ میں قصر سے باہر نکلی، لیکن اس کی نگاہ دروازہ سے باہر نکل کر پھیلی ہی تھی کہ وہ ششدر و متحیر ہوگئی کہ شاہ یونان کا باغ مع اپنی تمام روشوں نہروں، کنجوں، فواروں، درختوں اور حوضوں کے کیونکر یہاں منتقل ہوسکا، وہ اپنے اس باغ اور اس باغ میں کچھ فرق نہ پاتی تھی سوائے اس کے کہ وہاں بلور کے ٹکڑے روشوں پر پھیلے ہوئے تھے اور یہاں درہائے الماس تھے وہاں حوض سنگ مرمر و بلور کے تھے اور یہاں شفاف طلا اور صیقل کی ہوئی چاندی کے، وہاں اپنی دوشیزگی کی بے مزہ زندگی بسر کرتی تھی اور یہاں وہ کیوپڈ کے ساتھ مست و سرشار تھی۔

سائکی خوش خوش اس باغ میں داخل ہوئی اور ٹہلتے ٹہلتے ہر ہر چیز کو دیکھتی ہوئی پھولوں کو سونگھتی ہوئی کیوپڈ کو لے کر ایک کنج کے اندر چلی گئی اور ساری پریاں باہر مودب کھڑی رہیں۔

شام ہوگئی تھی، چاند نکل آیا تھا۔ اس لئے پھر سائکی وہاں سے نہیں نکلی اور وہ رات قصداً اس نے کیوپڈ کے ساتھ اس کنج میں بسر کرنا چاہی کیونکہ جب وہ یونان میں تھی تو یہی کنج تھا جہاں اس نے پوری ایک طویل رات نہایت کرب میں گزاری تھی۔

(۷)

کچھ زمانہ اسی انداز سے گذرا کہ کیوپڈ دو چار دن کے لئے باہر چلا جاتا

اور پھر اک نیا شوق، نیا جوش لے کر واپس آتا اور سائکی کے پاس رہتا۔ ہر چند سائکی بھی اس کی عادی بننا چاہتی تھی اور کیوپڈ کی غیبت میں انتظار کی گھڑیاں، مختلف مشاغل تفریح میں کاٹتی تھی۔ لیکن وہ کیوپڈ اس گھڑی گھڑی کی مفارقت سے بعض اوقات بہت دل گرفتہ و مضمحل ہو جاتی، اور وہ اپنے کنجوں، پھولوں اور پریوں سے بیزار، اب وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسی کا ہمجنس مل جائے اور اس سے اپنی موجودہ کامرانی کی داد لے۔ وہ ان پریوں سے صرف اشارہ سے کام لیتی تھی، کیونکہ کام کرنے والی پریاں بات نہیں کر سکتیں اور شاید کیوپڈ نے کسی مصلحت کی بنا پر ایسی کنیزیں مہیا نہیں کیں، جن سے سائکی گفتگو کر سکتی۔ غرضکہ جب کیوپڈ چلا جاتا تھا تو وہ سخت متوحش ہو جاتی اور باوصف اس کے کنیزوں کی ایک کثیر تعداد اس کی جلو میں ہوتی، وہ ان بے زبان متحرک تصویروں سے گھبرا کر یہی سمجھتی کہ "میں تو اب بھی ویسی ہی اکیلی اور تنہا ہوں۔"

جس وقت تک عورت اپنی محبت میں کامیاب نہیں ہوتی، اسوقت تک تو اسکی زندگی ایک کلی کی سی خلوت آرمیدہ زندگی ہے، وہ نہ کہیں جانا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے بات کرنا۔ لیکن جب وہ اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتی ہے، جب اس کی حیات معاشقہ اک عملی صورت اختیار کر لیتی ہے تو وہ پھر اگر تنہا بھی ہے تو بجائے خود اک انجمن ہے اور خلوت سے سخت بیزار، جب تک اس کی محبت کا کوئی جواب دینے والا نہیں، لیکن جب کوئی ایسا شخص اسے مل جاتا ہے اور اس کی جوانی کی لذتوں کو اس کے لیئے قابلِ فہم بنا دیتا ہے، تو پھر عورت اپنی مسرت کے بار کو برداشت نہیں کر سکتی اور اپنی ہی جنس کا کوئی فرد اپنے پاس چاہتی ہے۔ جس سے وہ اپنی لذتوں کا اظہار کرے، یعنی جس طرح وہ اپنی ناکام زندگی میں دوسروں پر رشک کیا کرتی تھی اسی طرح اپنے مسرور و شاد کام

زمانہ میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا بھی اس پر رشک کرے، اس لئے سائکی بعض وقت گھبرا اٹھتی کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم اس کی بہنیں، اگلارس وکیوپڈس ہی آکے دیکھیں اور اس کی خوش قسمتی پر رشک کریں۔

ایک دن جبکہ کیوپڈ خلاف معمول کئی دن کے بعد آیا، تو سائکی مچل گئی، کہ میں تو اپنی بہنوں کو دیکھوں گی، اور اگر میں وہاں نہیں جاسکتی تو انھیں کو یہاں بلوادوں گی، یا تو وہ اس کے پاس سے ہٹا نہ کرے یا پھر کیوپڈس و اگلارس ہی کو بلوا دے کہ چند دن انھیں کے ساتھ بسر ہوں،

کیوپڈ خاموشی سے سائکی کی ضد دل کو دیکھتا اور سنتا رہا اور جب وہ کہہ چکی تو اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے سائکی میرے لئے اس سے زیادہ مسرت بخش امر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ تیرے احکام کی تعمیل میں اپنی ساری قوتوں کو صرف کردوں، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ ان کا آنا میری مسرتوں کو منغص نہ کردے، یہ بالکل ممکن ہے کہ ان کے آنے سے تیری بعض ضدیں پھر از سرِ نو زندہ ہو جائیں اور وہی خدشات سامنے آجائیں جن کے خیال سے میں کانپنے لگتا ہوں، شاید وہ تیرے دل میں جستجو پیدا کردیں اور یہی ایک چیز ایسی ہے جو میں تیرے دل میں دیکھنا پسند نہیں کرسکتا۔ اے سائکی اب بھی سوچ اور مجھے ان کے بلانے پر مجبور نہ کر"۔

مگر سائکی جسے اپنی محبت پر پورا اعتماد تھا اور جو کیوپڈ کے خلاف مزاج کسی بات کا کرنا اپنے لئے بالکل ناممکن خیال کرتی تھی، اپنی ضد پر قائم رہی اور کیوپڈ کو بادل ناخواستہ ماننا پڑا۔

اس نے مارخیس وزفر کو بلایا، اور اگلارس وکیوپڈس کے بلانے کا حکم دیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تاکید کردی کہ ان کو کسی طرح یہ نہ معلوم ہو کہ کس کے

اشارہ اور حکم سے وہ طلب کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد سائکی نے اپنا ساز اٹھا کر گانا شروع کیا:۔

"میں ان راتوں پر رشک نہیں کرتی جو تیری معیت میں مجھ پر گزر جاتی ہیں کیونکہ جبتک تو میرے پہلو میں ہے صرف میرا ہے، لیکن ہاں میں اُن راتوں سے ضرور جلتی ہوں جو اِدھر مجھ پر اور اُدھر تجھ پر تنہا گزریں، کیونکہ اسوقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ تیری معیت صرف انھیں کے ساتھ ہے۔ لیکن جب تو مجھ سے دور ہو تو یہ نہ سمجھ کہ میں تجھ سے جدا ہوں، کیونکہ میں تو صرف ایک آرزو ہوں اور آرزو بھی صرف تجھے چاہنے کی، تجھ سے محبت کرنے کی۔ پھر اگر تو مجھ سے علیحدہ ہو کر میری یاد اس طرح کرتا ہے جیسے کسی دور کی چیز کا خیال کیا جاتا ہے تو غلطی ہے کیونکہ وہ آرزو تو تیرے ساتھ ہے۔ پھر یہ تخیل کیسا؟ دیکھ تو اپنے مشاغل کے دوران میں ایک دفعہ چونک کر کچھ سوچنے لگتا ہے، خاموش ہو جاتا ہے، وہ سکوت وہ نکر میں ہی تو ہوں جو تیری نگاہوں کو تیرے کام سے تیرے دل کو تیرے فرائض سے ہٹا لیتی ہوں، تو رات کو کسی اور دراز زمین میں سوتے سوتے چونک پڑتا ہے، گھنٹوں جاگ کر کروٹیں لیا کرتا ہے، یاد رکھ کہ وہ بیداری اور کروٹ خود سائکی ہے جو تیری آنکھوں میں آجاتی ہے، اور تیرے پہلو سے لپٹ جاتی ہے لوگ کہتے ہیں محبت بُری ہے، مگر میں دیکھتی ہوں کہ میری زخمی کرنے کے لئے کوئی خاص تیر تھا جو کیوپڈ نے چلایا۔"

کیوپڈ کے جسم میں اس فقرہ سے اک لرزش پیدا ہوئی لیکن اپنا اضطراب چھپانے کے لئے بول اٹھا کہ "اے سائکی، کیوپڈ نے کیا چلایا یہ کہو کہ میں نے چلایا؟"۔

سائکی بولی ہاں سچ ہے، تھیں نے چلایا، تو کیا تم کیوپڈ ہو؟ نہیں تم کیوپڈ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ میں نے سنا ہے وہ خود کسی سے محبت نہیں کرتا، اسکے دل میں ذرا رحم نہیں ہے۔ اس کا سینہ گدازِ عشق سے خالی ہے۔ وہ سفاک ہے، اور تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھے چاہتے ہو۔"

کیوپڈ" ہاں میں کیوپڈ نہیں ہوں، مگر یہ خیال کہ کیوپڈ کو کسی سے محبت نہیں ہو سکتی، شاید درست نہ ہو، کیونکہ بہت سی باتیں غلط مشہور ہو جاتی ہیں۔"

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مارفیس اور زفر سائکی کی بہنوں کو ہاتھوں پر لئے ہوئے آئیں اور جگا کر غائب ہو گئیں۔ سائکی اپنی بہنوں کو لیکر قصر میں گئی اور ایک ایک چیز وہاں کی دکھائی پھر وہاں سے باغ میں لائی اور فخر کے ساتھ ہر ہر کنج کی سیر کرائی، دل میں تو وہ اور جلیں کہ سائکی ابھی تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ ایسی شاہانہ زندگی بسر کر رہی لیکن ظاہر میں انھوں نے سائکی کو مبارک باد دی اور پوچھا کہ" یہ زر و جواہر یہ سامان نشاط کہاں سے آیا؟"

سائکی نے جواب دیا کہ" مجھے یہ نہیں معلوم کہ کہاں سے آیا اور وہ کون ہے جس نے مہیا کیا؟" انھوں نے نہایت حیرت سے کہا" تو کیا اس وقت تک تیرے شوہر نے اپنا نام بھی تجھے نہیں بتایا؟"

" آہ میں اس کا نام نہیں جان سکتی، اس کی ممانعت ہے"۔

" مگر اے بہن، تو نے اس کا چہرہ تو ضرور دیکھا ہوگا، کیا بہت خوبصورت ہے"۔

" نہیں میں نے اسکی صورت تو نہیں دیکھی کیونکہ وہ ہمیشہ نقاب ڈالے رہتا ہے"۔

" ہاں جب میں سو رہی ہوں تو میری نیندیں ضرور اس کے حسین چہرہ سے جگمگا اٹھتی ہیں"۔

بہنیں بولیں" اے لڑکی، تجھے فریب دیا گیا، کیونکہ یہ وہی عفریت ہے جو کسی

دن تجھے کھائے گا۔" سائکی نے کہا " نہیں وہ عفریت تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔" مگر دونوں بہنوں نے پھر یہی کہا اور اس قدر اصرار کے ساتھ اسکے عفریت ہونے کا یقین دلایا کہ سائکی بھی متفکر سی ہو گئی۔ اس تفکر سے انھوں نے اور فائدہ اٹھایا اور آخر کار اسے مجبور کر دیا کہ ابھی جائے اور نقاب الٹ کر اس کا چہرہ دیکھے۔

رات ہو گئی تھی، کیوپڈ اپنی خواب گاہ میں بے ہوش پڑا سو رہا تھا، سائکی آہستہ آہستہ گئی اور ڈرتے ڈرتے اس کے چہرہ سے نقاب اُلٹ دیا، مگر بجائے اسکے کہ وہ عفریت کی ڈراؤنی شکل دیکھتی اس نے ایک نہایت حسین وجمیل شکل دیکھی اور اسی ایک لمحہ میں سائکی کی محبت نے خدا جانے کتنے مدارج اور طے کر لیئے۔

کیوپڈ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور برہم ہو کر بولا کہ " اے بیوقوف سائکی یہ تو نے کیا کیا، کیا تو یہ نہ جانتی تھی کہ میں اک قوت غیر فانی ہوں اور کیا میں نے تجھ سے یہ بات بارہا نہیں کہی کہ کوئی انسان میرے چہرہ کو دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے باہر نکل جانا چاہا، لیکن بدقسمت سائکی نے اپنی ملتجی نگاہوں سے کیوپڈ کو دیکھ کر اپنے ہاتھ بڑھائے کہ کسی طرح لوٹ آئے اور اس کی خطا کو معاف کر دے۔ ہرچند کیوپڈ، سائکی کی اس ادا سے بے انتہا متاثر ہوا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے، لیکن وہ رک گیا، کیونکہ اب ایسا کرنے سے اس کی غیر فانی روح اس سے چھین لی جاتی اس لیئے کیوپڈ فوراً ایک بادل اپنے اور سائکی کے درمیان حائل کر کے غائب ہو گیا اور سائکی بیہوش ہو کر گر پڑی۔

کیا خبر وہ کتنے عرصہ تک بیہوش رہی، لیکن ہاں جب اس کی آنکھ کھلی تو نہ وہ قصر تھا، نہ وہ اس کی مکلف خواب گاہ، نہ وہاں کوئی باغ تھا، نہ کوئی کنیز، وہی وحشتناک کوہ الوند کی چوٹی تھی جہاں وہ پہلی دفعہ قربانی کے لیئے لائی گئی تھی، اور وہی شاہ بلوط سامنے تھا جس کے تنے سے وہ کبھی کس کے باندھ دی

گئی تھی، پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ میں کوئی وحشت ناک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے یقین کرلینا پڑا کہ خواب نہیں ہے بلکہ خواب تو وہی تھا جس میں اس نے پر لطف زندگی بسر کی۔ مگر ایسا خواب، ایسا طویل خواب نہیں ہو سکتا، مگر پھر کیا تھا!

آہ، وہ اس حقیقت پر زیادہ غور کرنے کی طاقت اپنے میں نہ پاتی تھی، وہ بالکل مبہوت تھی، دیوانہ پن اس کے چہرہ سے برس رہا تھا اور وہ فوراً مر جانا چاہتی تھی۔

(۸)

سائکی دیوانہ وار پہاڑ پر پھر رہی تھی، پاؤں کانٹوں سے مجروح تھے اور سارا بدن چوٹوں سے داغ دار، کراہتی تھی اور روتی تھی، چیختی تھی اور گر گر پڑتی تھی، لیکن وینس کی برہمی کا وہی عالم تھا، اس نے آدمیوں کو حکم دیا کہ سائکی کو پکڑ کے سامنے لائیں اور خود یہ حکم دے کر جیوپڑ کے پاس چلی گئی۔ جیوپڑ اس کا شوہر اولین تھا اور یہ کسی زمانہ میں اس کی محبوب ترین بیوی رہ چکی تھی، اس لیے بعض خاص تدابیر پر عمل کیا اور اپنے پندار میں ایسی حسین بن کر بیٹھ گئی کہ سائکی کا حسن اس سے شرما جائے گا۔ مگر جس وقت سائکی لائی گئی، تو وینس یہ دیکھ کر کہ اس حالت خستگی میں بھی سائکی کے حسن کا وہ عالم ہے کہ وہ باوصف تمام تدابیر حسن افروز کے بھی مقابلہ نہیں کر سکتی، عرق عرق ہو گئی اور یہ عزم کر لیا کہ سائکی کو مار ڈالنا چاہیئے، لیکن جیوپڑ نے رات کو وینس کے خواب میں آکر اس کا خیال بدل دیا اور سائکی کی جان بخشی کی یہ شرط قرار دی گئی کہ وہ دیوی پراسرپائن کا طلسمی صندوق لے آئے جس میں طلائے حسن بند ہے۔

سائکی اپنی قسمت کا فیصلہ سن کر کانپ اٹھی، کیونکہ اس کے نسبت مشہور تھا کہ وہ کوہ ہیڈس کے سب کے نیچے اور عمیق غار میں محفوظ ہے اور کسی کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی، لیکن ایک آواز اس کے کانوں میں آئی جسے سوائے اس کے اور کسی نے نہیں سنا کہ "گھبرا نہیں، تیرا محافظ تیرے ساتھ ہے"۔ یہ محبت بھری آواز اسے کچھ آشنا سی معلوم ہوئی اور وہ اس شرط کے پورا کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی نہ اس نے دشوار گذار پہاڑی راستوں کی پروا کی اور نہ درندوں کی، نہ اس نے کانٹوں کا خیال کیا اور نہ مہیب غاروں کا، کیونکہ یہ ایک روشنی تھی، اک محبت پاش جھلک تھی جو اُس کے آگے آگے تھی، اور اسے ان مصائب میں تسکین دیتی جاتی تھی، راستے میں درندے اسے ملے، مگر وہ اس کے حُسن سے مسحور ہو گئے، متلاطم دریا راہ میں آئے، لیکن وہ بھی خشک ہو گئے غرضکہ وہ کسی نہ کسی طرح براسرپائن کے دربار تک پہونچی اور طلسمی صندوق اس سے حاصل کیا اور وہ صندوق وینس کے سامنے لا کر ڈال دیا، اس امید پر کہ شاید وہ زمانہ پھر واپس آجائے جس کے لئے وہ تڑپ رہی تھی، لیکن وینس سائکی کے اس عزم و استقلال سے اور زیادہ جلی اور بدعہدی پر آمادہ ہو گئی جیوپیٹر اس پر راضی نہ ہوا اور وینس کو حکم دیا کہ سائکی کو چھوڑ دے کیونکہ جب اس کے پاس طلسمی صندوق آگیا ہے تو اسے کسی کے حُسن سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ آخر کار اسے راضی ہونا پڑا اور سائکی کو جیوپیٹر نے خاص اپنی شراب الوہیت منگا کر پلا دی جس سے وہ بھی غیر فانی ہو کر آسمانی مخلوق میں مل گئی۔

(۹)

کیوپڈ و سائکی پھر اسی کوہ اولمپس پر چلے گئے اور سائکی کی پھر وہی زندگی

شروع ہو گئی۔ جس زندگی کا خواب وہ ایک دفعہ دیکھ چکی تھی، اس کے بعد کیوپڈ نے اپنے چہرہ پر نقاب نہیں ڈالا۔ مگر ہاں اس وقت جب اسے انسانوں کی نگاہ سے چھپ کر تیر عشق چلانا مقصود ہوتا تھا۔

---

# ایک رقّاصہ

اے رقاصہ تو اپنا رقص کر میں منع نہیں کرتا، مگر مجھے اپنی محفل سے اٹھ جانے دے کہ میں تیرے رقص کی برداشت نہیں کر سکتا، میری طبیعت بگڑتی ہے، اے مغنیہ تو گا میں نہیں روکتا، مگر خدا کے لیئے مجھے اپنی بزم سے چلا جانے دے کہ میں تیری موسیقی کا حریف نہیں، میرا دل بے چین ہوا جاتا ہے۔ لیکن اے "رقاصہ و مغنیہ ہمہ" تو کیا مانتی ہے!۔

جب تو اپنے سانچے میں ڈھلے ہوئے مجسمۂ ذی حیات کی کشیدہ قامتی اور اپنی قدِ آدم تصویر کی رعنائی لے کر محفل میں کھڑی ہو جاتی ہے، تو میں چاہتا ہوں کہ اس فتنۂ سر کش، اس سحرِ خوش قامت، اس قیامت بلند بالا کو نہ دیکھوں، مگر دیکھتا ہوں اور کانپتا ہوں، جب تو اپنی آواز میں ایک داد خواہ بیچارگی، ایک مترحم نشیب پیدا کر کے اپنے لحنہ کو میرے عمق دل کی سب سے پنہاں رگ میں ڈبوتی جاتی ہے، تو میں چاہتا ہوں کہ اس صدائے بے پناہ کی طرف سے اپنے کان بند کر لوں، لیکن ایسا نہیں کر سکتا، سنتا ہوں اور مٹتا ہوں، جب تو گردن ذرا خم دیکر ایک خاص ادائے حجاب سے اپنے جوان چہرے پر صرف ایک رخسار کا گھونگھٹ کر لیتی ہے اس حال میں گھونگھٹ کے کنارے تیرے نازک ہاتھ کی صرف دو حنائی انگلیاں تانے رکھتی ہیں، تو میں چاہتا ہوں کہ اس پردۂ عریاں سے اپنی جان نکل جاؤں، لیکن نہیں نکل سکتا دیکھتا ہوں اور تباہ ہوتا ہوں، جب کہ

اپنی نازک کمر میں ہلکی ہلکی لہریں پیدا کر کے فرش پر تیرتی ہوئی سی چلتی معلوم ہوتی ہے اس حال میں تیرے گھونگروؤں کی آواز میرے سامعہ سے گزر کر، دل کی چٹکیوں کا نیل بنتی جاتی ہے۔ تو میں کوشش کرتا ہوں کہ اس بحر نغمہ کی شناور ملکہ کو نہ دیکھوں، مگر دیکھتا ہوں اور تیرے جسم کی ہر جنبش پر مٹتا جاتا ہوں، جس وقت تو اپنا زیر نقاب چہرہ ایک طرف موڑ کر، ذرا کھنچکر اپنے ایک ہاتھ کو پورا خم دیتی ہوئی چھوٹی انگلی کے ارتعاش سے اپنی کمر کی لرزش کو چھوتی ہے اور دوسرے ہاتھ کو پلٹ کر سر پر رکھ لیتی ہے تو میں تیری طرف سے اپنی نگاہیں پھیر لینا چاہتا ہوں، لیکن نہیں پھیر سکتا، جس وقت تو سرو قد کھڑی ہو کر، اپنی نازک لانبی پتلی انگلیوں کو باہر کی طرف خم دیکر صرف ہتیلیوں کے تصادم سے تالیاں بجاتی ہے اور اس حال میں گردن کی مسلسل جنبش، کمر کی متواتر لرزش ہونٹوں کی غیر منقطع ارتعاش، نگاہوں کے ایک مستقل عزم کے ساتھ ساز کی طرف ایک طرف اُٹھتی ہوئی نگاہ ڈال کر اپنا رقص نغمہ زیر شروع کرتی ہے، تو میں اپنی نگاہیں نیچی کر لینا چاہتا ہوں مگر نہیں کر سکتا، دیکھتا ہوں اور تڑپتا ہوں۔ جس وقت تو اپنے حنائی پاؤں میں سے ایک پاؤں کو زمین پر قائم رکھ کر اور دوسرے پاؤں کی ایڑی اٹھا کر صرف پنجہ کی ہلکی ہلکی سے اپنے گھنگروں کی آواز کو ساز کے تال و سم کے ساتھ ملا کر ہوا میں منتشر کر دیتی ہے، تو میں اس منظر سے جان بچا کر کسی طرف نکل جانا چاہتا ہوں، مگر نہیں نکل سکتا۔ پھر۔ اگر میں تیرے رقص سے جس کو میں خرام نغمہ یا نغمۂ خراماں کہہ سکتا ہوں، کانپتا ہوں، ڈرتا ہوں، تو مجھے معذور سمجھ کر، واقعی میری کمزور طبیعت، اس کی تاب نہیں لا سکتی لیکن اگر تجھے مجھ سے ضد ہے، تو میرا کہنا نہیں مانتی، تو تو صرف ایک کام کر۔ مگر رقص نہ کر، ہر چند تیرا نغمہ بھی مجھے ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے، اور میری روح کو اندر ہی اندر تحلیل کر سکتا ہے۔ لیکن جب تو آمادۂ رقص ہوتی ہے اور ساز کے تال اور سم کے ساتھ تیری

ایک رقاصہ سے

بوٹی بوٹی پھڑکنے لگتی ہے تو میں بھی اپنے اعضا میں جنبش محسوس کرتا ہوں ۔ اور بے اختیار یہ چاہنے لگتا ہوں کہ میں بھی تیرے ساتھ رقص کرنے لگوں تو صرف اپنی زبان سے " شیام رے موری بنہیاں گہونا " ادا کر، لیکن اپنے چرائے ہوئے بدن، کھنچی ہوئی گردن، بل کھاتی ہوئی کمر، لجاجت آلود نگاہ شرم آگیں چتون سے آدا کرتی ہوئی، زیر نقاب چہرہ کو ایک طرف موڑ کر رقص کرتی نہ چلی جا، کہ اس وقت وہ ساری شرارتیں اور جسارتیں مجھ میں عود کر آتی ہیں جن سے میرے شباب کی ترکیب ہوئی ہے تو یوں گا " تورے پیاں لاگوں بنہیاں نا مروڑ " ۔ اور تجھے اختیار ہے ۔ جتنا چاہے اپنی آواز کو نرم بنا لے ۔ لیکن خدا کے لیے اپنی سیمین کلائیاں دکھا کر یہ نہ بتا کہ کسی نے انھیں یوں مروڑ ڈالا، اپنی جھکی ہوئی نگاہوں میں استرحام پیدا کر کے ہاتھوں کو جوڑ کر، بدن کی کپکپی کے ساتھ تھراتے ہوئے لبوں سے اسکو نہ ادا کر کہ اس وقت میں بھی تیری نزاکت کی طرف سے اپنے اندر ایک سخت خیال دشمنی پاتا ہوں، اور یہ چاہتا ہوں کہ تیرے بازو کے ہر بل، تیری کلائی کی ہر جنبش، تیری کمر کی ہر لچک اور تیرے جسم کا تمام توڑ مروڑ صرف اپنے لئے مخصوص کر لوں، مگر میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ تو ہر ایک کو ایسا کرنے کی اجازت دے سکتی ہے اور یہی مجھے پسند نہیں ۔

اپنی آنکھوں کی وہ شراب جو ابھی ابھی تیری لانبی سیاہ پلکوں کی آغوش میں سو رہی تھی، اور اب صبح کے وقت تیری بادہ خوار آنکھوں کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سرمہ کی صورت میں پڑی چھلک رہی ہے، مجھے نہ پلا، ہر چند میری روح تیری نگاہوں کے ان ہلکے ہلکے جرعوں کے لئے تشنہ ہے، مگر وہ تشنہ ہی رہے گی، کیونکہ انھیں ہر شخص چکھ سکتا ہے اور میں اس لذت کو صرف اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہوں، اپنی جوانی کا وہ نشہ جو تیرے بستر کی شکنوں پر ہر شخص کو میسر آسکتا ہے، مجھ پر نہ ڈال،

یہ کہرا کے وقت آسودگی خواب کی وجہ سے تیرے خون صحیح کی آور زیادہ پھوٹ نکلنے والی سُرخی، وہ تیرے گورے گالوں میں بھرا رنگ شباب جس کو میں بلور شعلہ رنگ یا شعلۂ بلوریں کہہ سکتا ہوں اور پھر وہ تیرے سینہ پر دہرا ہوئے آنچل کے پلو کا چہرہ تک پہونچ جانا اور وہاں اس کی زریں باریک جھالر کا دیکھتے ہوئے چہرہ پر برقی روشنی میں جھل مل ہونا، اس میں ایک روشن تھرتھری پیدا ہونا، آہ کیا قیامت ہے کہ تو ان چیزوں کے سامنے بھی مجھ سے میرے ایمان، میرے صبر و تقویٰ، میری متانت و سنجیدگی کی قیمت پوچھتی ہے، تجھے کیا خبر کہ اس وقت میں انھیں کس قدر ارزاں دیدینے کے لیئے بیتاب ہو جاتا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ تو عریانی ہے اور تیرا رقص اور زیادہ عریانی مگر وہ نہیں جانتے کہ ہر صفت کی تکمیل عریانی پر ختم ہوتی ہے اور عریانی خود ایک صفت ہے پھر جب تیرے رقص کی برہنگی میری نگاہوں میں جگہ کرنا چاہتی ہے تو میں اس سے صرف اس وجہ سے گھبراتا ہوں کہ ہر صنعت کی تکمیل مجھ سے میری سنجیدگی چھین لیتی ہے اور میں اپنے مشاغل کی طرف سے غفلت کرنے لگتا ہوں جو میرے لیئے دلکش نہ ہوں، مگر جزء حیات کے لیئے ضروری ہیں۔ وہ لوگ غلطی پر ہیں جو تیری صنعت کو تیرے عورت ہونے کے لحاظ سے دیکھتے ہیں، ان کو نہیں معلوم کہ عورت باوجود فطرت کا بہترین نمونہ صنعت ہونے کے اس صنعت سے جُدا ایک چیز ہے جس کو کہ وہ اپنے لیئے مخصوص کرسکتی ہے اور اس میں کسی مرد کا حصہ نہیں۔ بنفشہ کی شاخ اس لحاظ سے کہ قدرت نے اُسے نازک پیدا کیا ہے تکمیل صنعت ہے۔ لیکن جب کوئی تیتری یا بھنبھیری اس پر آکر بیٹھ جائے اور وہ لچک جائے تو اس تکمیل صنعت کا یہ دوسرا پہلو ہے، مگر اس لچک کو اس شاخ کی فطری نزاکت سے جدا کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی نگاہ اس قدر دقیق نہیں کہ وہ کسی ایک ذات میں ملی ہوئی دو صنعتوں کو علحدہ علحدہ دیکھ سکیں، وہ تیرا

رقص نہیں دیکھتے، بلکہ تجھے حالت رقص میں دیکھتے ہیں۔ اور تجھے بھی نہیں بلکہ اپنی خواہشات اور جذبات کا مطالعہ تیرے اندر کرنا چاہتے ہیں اور انھیں اپنے ہیجان میں مطلق تمیز نہیں ہوتی کہ اپنے کو جذبات سے اور تیرے رقص کو تجھ سے علیحدہ کر سکیں دنیا بھر چیز کا مطالعہ اس نگاہ سے کرتی ہے جو نگاہ خود اس کے ذاتی و نفسیاتی اغراض کی مجبوریوں کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس لیئے اس میں فیصلہ کی صحیح قابلیت نہیں ہوتی۔ نقاد ہونا آسان کام نہیں۔ کوئی شخص کسی پھول کو شاخ میں کھلا ہوا دیکھے اور اس کو توڑ لینے کی خواہش اپنے دل میں محسوس کرے تو سمجھ لو کہ اس میں قوت تمیز نہیں ہے، کیونکہ اُس نے اس بات کو معلوم نہیں کیا کہ وہ صرف اپنی نکہت کی وجہ سے قابل قدر نہیں ہے بلکہ اس کا شاخ میں کھلا ہوا ہونا، ہوا چلے تو جھومنے لگنا کھلی ہوئی فضا میں مسرور سا نظر آنا، یہ خود ایک بڑا مکمل پہلو اس صنعت کا ہے، جو نکہت سے زیادہ دلکش ہے۔ مگر وہ اسے نہیں سمجھ سکتا، ایسا شخص ایک بچہ ہے جو ہر اُڑنے والی تیتری پر جان دیتا ہے مگر صرف اس لیے کہ جب اُسے پا جائے تو مل کر پھینک دے۔ ہم اگر کسی حسین سینہ پر اسی کے ہم رنگ پھولوں کا ہار دیکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ منظر ہمارے اُن جذبات کو ہیجان میں لائے جو صرف عورت کے سامنے پیش کرنے کی چیزیں ہیں، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر پھولوں کی زندگی انھیں ناردا خواہشوں پر قربان کر دی جاتی ہے۔

دنیا میں بعض مناظر ایسے ہیں جن کا تعلق ہماری نگاہ اور داعیات نفس سے بالکل یکساں ہے، یعنی نگاہ و خواہش دونوں اُسے چاہتے ہیں، لیکن یہ ہمیشہ نہیں ہوتا ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی صورتوں میں ہمیں ایسا کام کرنا پڑتا ہے جس کا تعلق ذوق نظر سے کم یا بالکل نہیں اور قوائے نفسانی سے زیادہ ہوتا ہے، پھر کیوں ہم ایک ذوق کو دوسرے ذوق سے ملا دیں، دیکھنے کی چیز اسی وقت تک صحیح و درست رہے گی جبتک وہ صرف دیکھی جاتی ہے۔ لیکن اُسے چھوا اور وہ غارت ہوئی۔ کسی ایسے منظر کی حالت بالکل چھوئی موئی

کے درخت کی سی ہے کہ جب تک دیکھ رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں، لیکن ہاتھ لگا اور کمھلا کر رہ گیا، پھر اگر دنیا میں ایسے لوگ ہیں جن کو تیرے رقص میں عریانی نظر آتی ہے، اور وہ اس وجہ سے تجھ سے متنفر ہیں تو عجب نہیں کیونکہ میری حس تو ہر جگہ کام نہیں کر سکتی، لیکن ہاں یہ شکایت تجھ سے بھی ہے کہ تو خود بھی اس کو نہیں سمجھتی۔ دیکھ تیری دو حیثیتیں ہیں۔ ایک صرف عورت ہونے کی یعنی تیرے نسائیت کی۔ اور دوسری صرف تیرے رقاصہ و مغنیہ ہونے کی اور دونوں حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جُدا رکھ، تو صرف اس وجہ سے نغمہ و رقص کو اختیار نہ کر کہ تو عورت ہے، تو صرف اس لحاظ سے اس فن کی نمائش نہ کر کہ تیری نسائیت میں اس سے زیادہ دلکشی و دلربائی پیدا ہو جاتی ہے، بلکہ تو گا محض گانے کے لئے رقص کر صرف رقص کی غرض سے جس وقت تو حالت رقص میں ہوتی ہے تو میں یہ آرزو اپنے دل میں پاتا ہوں، کہ کاش تو اسوقت اسی حیثیت سے میری آغوش میں آسکتی اور شاید تو آ جائے۔ اگر میں بلانا چاہوں مگر مجھے یہ پسند نہیں آتا کہ تو اس حیثیت سے اس قدر غیر الحصول ہو، لیکن اگر تو یقین دلادے کہ اس حالت میں اس حیثیت سے سوائے دل و دماغ کے تو اور کسی کا حصہ نہیں ہو سکتی تو پھر مجھے غرض نہیں کہ تو محض عورت ہونے کی حیثیت سے کیا ہے؟ تو خواہ کتنی ہی عصمت فروش ہو، لیکن اپنے فن کی معصومیت کو مجروح نہ کر، تو اس کے ذریعہ سے اپنے بازار حسن کو رونق نہ دے، تو خوبصورت ہے، تیرے اعضاء میں تناسب ہے جسم میں کشیدگی ہے۔ آنکھوں میں سحر ہے۔ چتون میں افسوں ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ابھی تیری نئی جوانی ہے انھیں کسی کو پناہ نہیں مل سکتی، ان میں سے ایک ایک چیز عالم کو تباہ کر سکتی ہے پھر تجھے کیا ضرورت ہے کہ ان میں تو کسی ایسی بات کا اضافہ کرے، جس کا تعلق تیری دوسری حیثیت سے ہے، جس وقت تو ایک خاص آرائش سے مسلح ہو کر محفل رقص و سرود میں آتی ہے، اسوقت سے لیکر اس وقت تک کہ تو پھر سادہ لباس پہن

کر سامنے آ بیٹھتی ہے یہ سمجھ لے کہ تو وہ نہیں ہے جو بام خانہ یا تختۂ بازار پر ہے۔ کیونکہ میں تجھے اس وقت ایک خاص نگاہ سے دیکھتا ہوں اور اسوقت خود تیری ذاتی حیثیت میرے پیش نظر نہیں ہوتی جس وقت تو ناچتے ناچتے محض تکمیل فن کے لیے کسی ایسے حصۂ جسم کو نمایاں کر دیتی ہے، جس کو یوں بھی کوئی پردہ کوئی حجاب نہیں چھپا سکتا، اسوقت میں بے اختیار ہو جاتا ہوں، حالانکہ حالت رقص سے جدا میں نے بارہا نمود سینہ کو دیکھا اور دیکھ کر خاموش ہو گیا، میں نے بہت سی حسین آنکھوں کو مصروف خواب اور بہت سے سڈول بازوؤں اور گوری گوری کلائیوں کو سو اٹھنے کے بعد انگڑائیوں میں مڑتے، بل کھاتے اور اینڈتے دیکھا ہے لیکن کبھی مجھ پر ایسا اثر نہیں ہوا جیسا اسوقت جب تو نے سوہنی کے دھن میں "اٹھ جاگ نیند پا کے ماتی" گاتے گاتے اپنی آنکھوں میں ایک مصنوعی نیند پیدا کر کے پھر انھیں ایک سست انگڑائی کے ساتھ آہستہ آہستہ کھول کر اپنی نگاہوں کو منتشر کر دیا، میں اس سے خوش نہیں ہوا کہ تو نے میری طرف دیکھا بلکہ میں اس شعبدۂ صنعت پر پھڑک گیا، کہ محفل کا ہر شخص اپنی اپنی جگہ یہی سمجھا کہ صرف مجھی کو دیکھا، کوئی قائل ہو یا نہ ہو مگر تو قائل ہو کہ تیرا رقص معجزہ ہے اور اس معجزہ پر ایمان لانے کے لیے تیار، لیکن کاش اس معجزہ سے تو صرف معجزہ کا کام لیتی اور کوئی قیمت اس کی مقرر نہ کرتی کیونکہ جس وقت صنعت بازار میں آجاتی ہے، صنعت باقی نہیں رہتی بلکہ وہ بازار کی ایک جنس ہو جاتی ہے جو لاکھ گراں ہونے پر بھی کم قیمت ہے۔

جس وقت تو، کمر پہ ہاتھ رکھ کر اپنے پاؤں سے زمین کو ٹھکراتی ہے اور وہی جنبش رفتہ رفتہ تیری کمر تک آکر پہلے ایک خفیف سی لرزش اور پھر ہلکے ہلکے ہچکولوں میں تبدیل ہو جاتی ہے، تو میرے ہاتھ پاؤں میں بھی ایک اضطراری جنبش پیدا ہونے لگتی ہے اور میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ اگر یہ مسلسل آمد و شد تیری کمر سے جدا

ہو گئی تو میری نبض بھی چلتے چلتے ٹھہر جائے گی، حالانکہ اس سے قبل میں نے بارہا تیری کمر کو چلتے ہنسنے جھکنے، اور بنا کر بالوں کو جھٹکا دینے میں بل کھاتے دیکھا ہے، مگر ایسی حالت میری کبھی نہیں ہوئی۔

وہ تیرا لحنِ گلوسوز، وہ ساز میں ڈوبی ہوئی آواز، ایسی ڈوبی ہوئی کہ یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ تیری آواز، صدائے ساز ہے یا صدائے ساز تیری آواز، وہ تیرا ایک قدم زمین پر جما کر دوسرے پاؤں کی ایڑی اٹھا کر صرف پنجہ سے زمین کو ٹھکرانا اور پھر تیرے گھونگرؤں کے اندر پہلے آہستہ آہستہ اور پھر با قاعدہ وقفوں کے ساتھ جلدی جلدی اسی ٹھوکر کا ایک مسلسل فریاد کی شکل اختیار کر لینا، ہنگام رقص وہ تیری شوخ و متحرک چتونیں جن کے نظام حرکت سے اصول ریاضی منضبط ہو سکتے ہیں وہ پھڑکنے والی ابروئیں جن کی لرزش سے ایک مصور کا قلم اپنی رفتار درست کر سکتا ہے وہ آنکھیں جن کی گہرائی میں سمندر کا عمق ڈوب سکتا ہے وہ نگاہیں جن کے بسط میں فضا کی وسعت گم ہو سکتی ہے، وہ کمر کا لوچ جو دنیا کو رعشہ بر اندام کر سکتا ہے، وہ گردن کی جنبش جو دنیا کی نیندوں میں تھرتھری پیدا کر سکتی ہے وہ نصف سر پر ترچھا آنچل رکھ کر ایک خاص انداز سے اپنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی نوک ٹھوڑی پر رکھ کر کھڑا ہو جانا جو ساری دنیا میں تیری حکومت کرا سکتا ہے یہ سب میرے نزدیک اسی وقت تک اپنا اپنا کام کر سکتے ہیں، جبتک تو خود اُن سے غرض نہ رکھے۔

اگر کہیں تو یہ سمجھ جائے کہ دنیا میں تو صرف اس لئے آئی ہے کہ دلوں میں جذبات پیدا کرے اور الگ ہو جائے۔ دلوں میں حوصلے، سینوں میں اُمنگیں پیدا کرے اور ہٹ جائے دماغوں میں جستجوئیں ہستیوں میں بیتابیاں پھیلائے اور علیحدہ ہو جائے تو خدا جانے تو کیا ہو جائے تیرے لئے تسکین خواہشات فرض نہیں تیرے لئے ضروری نہیں کہ تو اضطراب پیدا کرے تو اسے دور بھی کرے بے چینیاں پھیلائے

تو ان کا بھی علاج کرے۔ میں تیری قدر صرف اسوقت تک کرتا ہوں جبتک تو میرے لیئے صرف ایک خلش ہے۔ ایک مرض ہے۔ لیکن یہ جاننے کے بعد کہ تجھ سے خلش دور بھی ہو سکتی ہے، تو مرض کا علاج بھی کر دیتی ہے، میں اپنے اندر اضمحلال پیدا ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ میرا جوش کم ہو گیا اور اب میں دنیا میں کچھ نہیں کر سکتا۔

میں آرزومند ہوں کہ تجھے بلند دیکھوں، تجھے ارتقا کے اس نقطۂ عروج پر دیکھوں جہاں لوگوں کی تمنائیں بھی مشکل سے پہونچ سکیں چہ جائیکہ اُن کے ہاتھ، تو اپنے بالوں کو سلجھا اور شانوں پر بل دیکر چھوڑ مگر ہر شخص کو اُن کی خوشبو نہ لینے دے کی اُنکی رونق تنفس کے تنوع سے خراب ہو جاتی ہے، تو ریشمی ساری میں اپنے نازک جسم کو لپیٹ اور اسکے تناسب کو نمایاں کر لیکن ہر ہاتھ کو وہاں تک پہونچنے کی اجازت نہ دے کہ مس کی تبدیلیاں نزاکت کے لیئے جراحت ہیں، تو اپنے لبہائے میگوں سے شراب تبسم چھلکایا کر مگر ہر شخص کو یہ شراب نہ چکھنے دے کہ ذائقہ کا ردوبدل اس صہبا کے لیئے کیف شکن ہے، تو آنکھوں میں سُرمہ لگا اور جتنا جی چاہے ترچھی نگاہوں سے کلیجوں کے ٹکڑے کر ڈال مگر اُن آنکھوں تک ہر ایک کو پہونچنے کی اجازت نہ دے کہ آمدو شد کی کثرت وحشت رُبا ہے اور آنکھوں میں تیری ہی ایک خاص چیز ہے، تو اٹھکھیلیاں کرتی چل، اور اپنے کمر کے بل سے نظام کو درہم برہم کر لیکن خدا کے لیئے ہر بازو کو اجازت نہ دے کہ اسکا احاطہ کرے، کہ لہروں کے لیئے ساحل کا وجود قطع روانی ہے، الغرض تو جو چاہے کر، جو چاہے بن، مگر وہ آزاد و رمیدہ آغوش سے دور معانقہ سے الگ، اور پھر مجھ سے پوچھ تو کیا ہے؟ دنیا کی پروانہ کر، اسکے اصول پر نہ جا" اور وہ کر جو میں کہتا ہوں، پھر تو یہ میرا کام ہے کہ تیرے مجسموں کی پرستش عالم کے ہر ہر گوشہ میں اور تیری خدائی ساری دنیا میں قائم کر دوں میں کہہ چکا ہوں اب تجھے اختیار ہے خواہ پرستیدۂ عالم بن یا پرستارۂ دنیا۔

# ایک شب کی قیمت

شبستانِ ناز کے پُر لطف دقیقہائے برق کسی کی آرمیدہ مژگانی کی آغوش میں تھک کر سو گئے ہیں، مگر ایک حسرت آلود انتقام عشق ان لانبی گھنی پلکوں کا ماجرا، جو آسودہ آنکھوں کی لذّت سے مست و سرشار ہیں، سننے کے لئے بیتاب ہے، سمجھنے کے لئے تڑپ رہا ہے، اک طویل رات ایک مسلسل بے چینیوں میں گزر جانے والی تاریک رات! کون کہہ سکتا ہے کہ اسے محفل طرازیاں بھی آتی ہیں، کس کو خبر ہے کہ اس رات کا روشن رُخ، وہ مجالس حسن ہیں جہاں شمع گل ہونے پر بھی ایک مجسمۂ نور، ایک پیکر ضیاد کی خوابگاہ میں جگمگایا کرتی ہے، ہاں میں یہی کہوں گا کہ وہ جگمگایا کرتی ہے اور نہ صرف اسی قدر بلکہ وہ بے پردگی سے مس ہو کر، بے حجابی کے حلقۂ تنویر سے لپٹ کر عریاں ہو جاتی ہے، بیشک عریاں ہے وہ رات، جو ایک شانہ تک کھلی ہوئی بلوریں گردن، ایک بے نقاب صبیح چہرہ کی یاد مجھے دلائے، اور برہنہ ہے اس کا ہر ہر لمحہ جو کسی یاسمینی شباب کی خوشبو مجھ تک پہونچائے۔ بس، اس رات کو محفل طرازیوں کو طعنہ دینا اور آخر میں اسکو عریاں و برہنہ کہہ دینا یہی تھی اس انتقام کی حد، جو تخیلات صباحی کو مضطرب کئے ہوئے ہے!

یہ ہذیان ہے اور ایک شب کا تخیل، یہ شوریدہ سری ہے اور اس شب کی صبح مجھے معلوم تھا، میں کہتا جاتا تھا کہ میں رحم کے قابل نہیں، میں بار لطف نہیں اٹھا سکتا، مجھ پر عنایت کرنا مجھے برباد کرنا ہے۔ اور میری پرستش حال میرے ساتھ صریح ظلم، لیکن اس نے نہیں سنا، اس نے نہیں مانا۔

اے زہرۂ مخمور میں وہ ساعت تجھے یاد نہیں دلاتا، میں اس لمحہ کے بیان سے تجھے منغص کرنا نہیں چاہتا ورنہ میں کہہ دیتا کہ تیری چشم مے فروش، تیری مژگاں یاد لریز جب گراں خوابی سے مانوس ہو کر اک آخری ناتواں دورِ شراب کے ساتھ عالم کو بزمِ خرابات بنا سکتی تھی، اسوقت جب میں کائنات کے ہر ذرہ میں ایک لغزش بیخودی محسوس کر رہا تھا، ہاں، اس ساعت میں جب تو محوِ خواب ہونے کو تھی، اسی لمحہ میں، جب تیرا اسرار اجمال تیری گلابی نیم وا آنکھوں میں کھنچ کر آ گیا تھا، میں اور صرف میں ہی تیری اس نشہ کی پھانس اپنے جگر میں چھپائے ہوئے تھا اور تڑپ رہا تھا، تیری گھنی پلکیں ایک دوسرے سے مل گئیں یعنی تو سو گئی، تجھے کیا خبر ہے کہ تو سو جاتی ہے تو کیا ہو جاتی ہے۔ آہ، میں جانتا ہوں کہ حسن سکون کی حالت میں کیسا تلاطم خیز ہے، شراب رسا ہو کر کیسی تیز و تند ہو جاتی ہے، میں جاگ رہا تھا، اور عمیق مطالعہ حسن میں مصروف، کیونکہ اس ایک شب کے لئے میں اپنی ساری زندگی دے چکا تھا، اور میں یقین کرتا تھا کہ آفتاب کی سب سے پہلی کرن تجھے جگانے اور مجھے ہمیشہ سلا دینے کے لئے آنے والی ہے، اس لئے کوشش کر رہا تھا کہ جائزہ حسن کی جب آخری ساعت آئے تو اسکی لذتیں مجھے مٹا چکی ہوں، جب میں نے تیری نرم و نازک کلائی جو سر کے نیچے دبی ہوئی تھی آہستہ آہستہ ہٹائی اور اس پر تیرے ریشم سے بالوں کا معطر نشان، اک چھوٹے سے حلقۂ زلف کا مخطط دائرہ دیکھا، تو میں تیرے جسم میں ہاتھ لگانے کے خیال سے کانپ اٹھا، لرز گیا، میں جانتا تھا کہ تیری جلد بہت نرم و نازک ہے، لیکن نہ اس قدر کہ اگر بال بھی چھو جائے تو نشان چھوڑ جائے، شاید اس اضطراب میں تیرا ہاتھ میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ چھوڑا اور وہ بستر پر رہ گیا، ہائے وہ کچھ کھلے کچھ بند ہاتھ، وہ ہتیلی میں ہلکا سا عمق، یہ معلوم ہوتا تھا کہ تو چلو میں گلابی رنگ لیئے ہوئے ہے اور مجھ پر چھڑکنا چاہتی ہے، لیکن تیرے دوپٹہ کا رنگ کچھ اڑ گیا تھا اور اس لیئے اسکا زیادہ حق تھا کہ

وہ سینہ وشانہ سے ڈھل کر اس میں ڈوب کر رہ گیا، مگر اُف ری! وہ سینہ وگردن کی عریانی، ایک نزہت تھی یاسمینی، اک نظافت تھی صباحی یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا سارا وجود اک خمیازہ میں تبدیل ہوا جاتا ہے، اور میری ساری روح ایک انگڑائی بن کر نکل جانا چاہتی ہے، نظریں ہٹانا چاہتا تھا مگر نہ ہٹتی تھیں، روح کا اضطراب کم کرنا چاہتا تھا مگر نہ ہوتا تھا، ہاتھ اٹھا لیکن بے اختیارانہ، تیرا آنچل اٹھا کر تیرے سب سے زیادہ تباہ کن حصّۂ جسم پر ڈالنا چاہا، مگر بالکل بیتابانہ ——— سارا ذوقِ نظر، سارا خمیازۂ وجود، سارا ہیجانِ روح اب میری اس سرانگشت پر تھا جو آنچل کے ساتھ تیرے اُس جزوِ حسن سے مس کرنا چاہتا تھا، میں نے اسے محسوس کیا اور اس لیئے دور ہی سے تیرا آنچل چھوڑ دیا، مگر آنچل سے جھٹکے سے چھوڑنا تھا اور جسارتِ محبت کے ردّعمل کو برداشت نہ کر کے بیہوش ہو کر گر جانا۔ اب میرے کانپتے ہوئے ہونٹ تیرے کفِ پا میں سارے جذبات کو منتقل کرنا چاہتے تھے کہ کہ اس کے تعطر نے جو آفتاب کی شعاعِ اولیں کے ذریعہ سے تمام جو دسما میں پھیل جانا چاہتا تھا، اک ہلکی سی روشنی کے ساتھ میری مشنِ حیات پر قبضہ کر لیا پھر اب میری حیات کیسی، ——— یہ بھی کوئی زندگی ہے، یہ بھی کوئی جینے میں جینا ہے۔ آہ!

عیش بھی اندوہ فزا ہو گیا　　ہائے طبیعت تجھے کیا ہو گیا

# عورت

خدا معلوم اس سے قبل کتنی بار ارادہ کیا کہ خدا کی اس محترم ترین مخلوق پر کچھ لکھوں لیکن سوائے اس کے کہ جب تک ایسا خیال قائم رہا۔ اک خاص نوع کا لطف تو ضرور اٹھاتا رہا، یہ ہمت کبھی نہیں ہوئی کہ کچھ لکھتا ۔ اور لکھتا کیا خاک! مضبوط سے مضبوط ارادہ، مستحکم سے مستحکم خیال لیکر میز کے پاس آیا، لیکن عزم نا استوار، استقلال مضمحل، اور دماغ بیکار ثابت ہوا، گھنٹوں ہو گئے کہ میں سامنے والی تصویر کو دیکھ رہا ہوں اور تاثرات و جذبات کو دماغ میں منقوش کرتا چلا جاتا ہوں لیکن قلم لیا اور ہاتھ کانپا، اٹھا، ٹہلا، بیٹھا اور پھر سب پھینک پھانک کر ایک لمبی سانس کے ساتھ کرسی پر گر پڑا۔

بہت دن گذر گئے ہیں کہ میں اسی فکر میں مستغرق رہا ہوں کہ آخر حسن و محبت جس کے اثرات کا خلاصہ ہماری ناکامیوں اور کامرانیوں میں ایک طویل آہ، یا اُف سے زیادہ نہیں کیوں اس درجہ ہمارے نظام عصبی پر حکمراں ہے لیکن سوائے اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ حکمراں ہے اور اسکو حکمراں ہونا چاہیئے۔

---

متمدن سی متمدن قومیں ہوں، یا وحشی سے وحشی لیکن جب اُن کے جنس کرخت کو اک حقیقی الفت، ایک سچی خوشی، ایک اصلی تلطف کی ضرورت ہوتی ہے تو ہمیشہ عورت ہی کا نازک سینہ تلاش کیا جاتا ہے لیکن کیا پہلے اس تلاش کے لیے کوئی دلائل قائم کرتا

ہے؟ کیا کوئی اس جستجو کے اسباب سمجھ لیتا ہے؟ کوئی نہیں پھر جو بلا کسی نمایاں ذریعہ کے ہمکو اپنی طرف کھینچ لے جو بلا ہمارے علم کے ہم میں قوت انجذاب پیدا کر دے، جو غیر معلوم طریقہ سے ہم کو اپنی ناقابل فہم لذّات سے مخمور کر دے جو بلا کسی حجت کے تلطف، جو بلا کسی برہان کے لطف و کرم ہو، میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی پُر راز شے کا حال کوئی کیا لکھ سکتا ہے؟ اگر آج کوئی اُن مثالوں کو لیکر بیٹھ جائے جن سے اس جولانگاہِ محبت و جمال کا مطالعہ زیادہ قریب سے کیا جا سکتا ہے تو صرف ایک ادنیٰ سی فرد کے واردات حیات پر غور و تعمق کے ساتھ کسی نتیجہ پر پہونچنے کے لیئے عمر خضر بھی ایک سریع الفنا لمحہ ثابت ہوگا۔ وہ تھک جائے گا، اظہار عجز کر دے گا اور گو اس کا فیصلہ یہی ہوگا کہ عورت اک لذت ہے مجسم، اک تسکین ہے متشکل، اک سحر ہے مرئی، اک نور ہے مادی لیکن اُس سے سوال کرو کیوں؟ اور تحیر میں مٹ جانے کے لیئے اسے تنہا چھوڑ دو۔

پھر جو میں نے قدرت خداوندی کے اس جاذب ترین و دقیق ترین نمونہ کمال کو اپنے مضمون کا عنوان بنایا ہے تو اس سے یہ مقصود نہیں کہ میں کسی دلیل سے اس کا ایسا ہونا ثابت کروں گا، کیونکہ آفتاب روز صبح کو نکلتا ہے اور اسکے طلوع کا اعلان کسی دلیل کا محتاج نہیں، چاند ٹھنڈک پہونچاتا ہے اور تمام حجتوں سے بے نیاز ہے، صبح ہوتی ہے اور چڑیوں کو کوئی نہیں سمجھاتا کہ تمھیں اس سبب سے نغمہ سرائی کرنا چاہیئے۔ مگر ہاں سرکار حسن کے سامنے اپنی بیچارگی کا اعتراف اپنی بے مائگی کا اقرار میری عین خواہش ہے۔

اک قوم آگ کو پوجتی ہے، آفتاب کے سامنے سر جھکا دیتی ہے، ممکن ہے کسی مذہب میں یہ فعل ممنوع ہو لیکن میری رائے میں یہ اظہار منت کشی ہے جس سے بہتر طریقہ التفات ضیا کی شکر گذاری کا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لیئے آپ اس مضمون میں تو علم النفس کی بحث کہیں پائیں گے اور نہ فزیالوجی کی کیونکہ یہ بات میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں

عورت کے نظام عصبی عضلات کی ترکیب یا دماغ کی ساخت کا ذکر کر کے آپکی تحقیر کروں بلکہ یہ تو ہذیانات محبت ہیں. حکایات پرستاری ہیں یا اعتراف ندامت ہیں اسکے حضور میں جس کا عدم التفات بھی میرے لیئے عین الطاف، جس کا تغافل بھی میرے لیئے ایک دنیائے توجہ جس کی فراموش کاری بھی میرے لیئے ایک حیات بخش پیمان ہے، اور جس کا صرف عورت ہونا ہی میرے ساری قوتوں کو اپنا طرفدار منا لینے والا اور مجھ کو مجھ سے چھین لینے والا ہے۔

راتوں کی خلوت میں بارہا میں نے اس امر کی کوشش کی کہ میں حسن کو عورت سے جدا کر سکوں کوئی صورت ایسی فرض کر سکوں جس سے علیحدہ ان کا نظارہ ہو سکے لیکن سوا اسکے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ نسائیت ہی نام ہے حسن کا، اور جو چیز دنیا میں حسن کا مکمل نمونہ پیش کرتی ہے وہ نسائیت سے خارج نہیں ہے، یہانتک کہ میں فرط استغراق میں ہر ذرہ کو اسکے پرتو سے رنگین پاتا ہوں۔ آپ غالباً مجھے دیوانہ کہیں گے اگر میں یہ بتاؤں کہ مجھے ایک کلی۔۔ کیوں اچھی معلوم ہوتی ہے؟ ایک پھول کی خوشبو سے میں کیوں مست ہو جاتا ہوں؟ شفق کی رنگینی کیوں دل میں کھب کر رہ جاتی ہے؟ یہ نیلگوں آسمان کیوں دل میں سما کر رہ جاتا ہے؟ یہ موجوں کا لوچ کیوں مجھے وارفتہ بنا دیتا ہے، شاخ جھکی ہوئی کیوں بھلی لگتی ہے۔ بہ نسبت پورے چاند کے ہلال میں کیوں زیادہ کشش ہے حتی کہ مذاق طبیعت کی یہ خاص حد کہ مستقیم خطوط کی بجائے منحرف لکیریں ایک سیدھے راستے کے بجائے پرپیچ و خم سڑک زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کسی چشمہ کی روانی میں جا بجا بل پڑتے ہوں تو میں گھنٹوں اسے دیکھتا رہتا ہوں گاڑی جب سڑک کے موڑ پر گھومتی ہے تو میرے لیئے جاذب نظر ہوتی ہے قینچی پر آ کر جب ریل میں ایک خم پیدا ہو جاتا ہے تو میں پھڑک جاتا ہوں، یہ سب کیا ہے؟ آہ آپ یقین نہ کریں گے لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ دنیا میں کوئی چیز میرے دل کو دھڑکا دینے والی نہیں الا جبکہ اس میں نسائیت ہو، اور جب اس عالم کی کسی مادی یا

غیر مادی حسین شئے کو دیکھ کر میرا کلیجہ ملنے لگتا ہے تو بس اس میں ایک خاص قسم کی نسائیت سی محسوس کرتا ہوں۔

میں نے اسی ضمن میں اس پر بھی کامل غور کیا کہ کیا عورت اس وجہ سے دلکش ہے کہ اسکے خد و خال نازک، اسکی آنکھیں بڑی اسکا رنگ صاف، اسکی کمر نازک اسکے بال سیاہ و طویل ہیں؟ ممکن ہے کہ یہ سب باتیں مل کر اس میں دلکشی پیدا کر دیتی ہوں، لیکن میں تو سوائے اسکے اور کچھ نہیں سمجھ سکا کہ وہ عورت ہے اور بلا کسی سبب کے وہ سب کچھ ہے میں نے یہ بھی خیال کیا کہ شاید وہ از روئے علم النفس اس وجہ سے ہم میں انجذاب و شوق پیدا کر دیتی ہے کہ ہمیں دیکھ کر فطرتاً چھپ جانے، سمٹ جانے، بدن چرا لینے پر مجبور ہے، اس میں ایک خاص قسم کا استغنا و غرور ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان اصول سے بالا، ان قوائے دماغی کے قضایائے ادراک سے بھی بہت ارفع و اعلیٰ نظر آئی اور جملہ اصول مادیات، جملہ استدلالات علمی بیکار محض ثابت ہو گئے۔

مدتیں گزر گئیں زمانہ ہو گیا اور یہ راز بدستور سربستہ رہا۔

ایک شب عزیز اور اسکی بیوی اپنے کمرہ میں تھے، میں سُن رہا تھا، اس نے پاندان مانگا عزیز نے سرکا دیا۔ اس نے کھولا، دیکھا، اور پھر بند کر کے رکھ دیا، عزیز نے پوچھا "کیوں نہیں کھایا، جواب ملا" پان ایک ہی تھا پھر تمھیں تکلیف ہوتی۔" جیسے کوئی نگاہوں کے سامنے سے پردہ اٹھا دے، ایک عجیب کیف مجھ پر طاری ہو گیا میری روح اس لہجۂ محبت سے کانپنے لگی اور میں ایک ایسا غلبۂ روحانیت اپنے اندر محسوس کرنے لگا کہ اس وقت مجھے ذرہ ذرہ درد محبت سے بیتاب نظر آتا تھا۔

ایک واقعہ اور ـــــ آدھی رات سے زیادہ وقت گزر گیا، لیکن ایک نازک دل والی، ذرا سے خوف یا اندھیرے میں کانپ اُٹھنے والی، تنہائی میں خاموش بیٹھی ہوئی انتظار کر رہی ہے جی ہی جی میں بگڑ رہی ہے مگر ادھر کوئی آتا ہے اور ادھر

یہ سارے گلے شکوے بھول بیٹھی ہے اور اپنے حد انتظار کے اس منظر سے مسرور ہے کہ شوہر بگڑ بگڑ کر کہہ رہا ہے کہ "آخر تم نے کیوں نہ کھانا کھا لیا"۔ اور وہ ہے کہ ایک لفظ اس کے منھ سے نہیں نکلتا۔ دنیا میں کوئی مثال اس سے زیادہ درس انسانیت دینے والی، اس سے زیادہ حقیقی سکون روح مہیا کرنے والی اگر کوئی ہے تو افسوس یہ ہے کہ دنیا اسے پیش نہیں کر سکتی۔

یہ محبت کی خاموش صدا! آہ فرشتے اس نغمۂ رواداری کو ہمک کر لینا چاہتے ہیں! یہ نرمی ملاطفت! آہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالم اس سکون کے لیے تڑپ رہا ہے۔ بچہ بیقرار ہے۔ رو رہا ہے، ماں آغوش میں بھینچ بھینچ کے، سینہ سے لپٹا لپٹا کے، منھ چوم چوم کے، اپنی ساری قوت محبت سے اُسے چپ کرنا چاہتی ہے۔ یہ انہماک محبت، یہ استغراق مشقت، دنیا کی کسی مخلوق میں دکھا دو، ماں ٹہل ٹہل کر اپنی روح کی پوری توجہ کے ساتھ، پوری معصومیت کے ساتھ لوریاں سنا رہی ہے۔ آہستہ آہستہ تھپکیاں دے رہی ہے۔ آہ! آپ محسوس نہ کریں لیکن میں تو اس وقت یہ دیکھتا ہوں کہ ساری کائنات سو جانا چاہتی ہے دنیا کا ہر ہر ذرہ ایک غنودگی محسوس کرتا ہے اب، اب ہم جوان ہو کر اس رحم کی مقدس دیوی کو بھول گئے یہانتک کہ اب ایک ننھے سے روتے ہوئے بچہ کو دیکھ کر مشکل سے یقین کر سکتے ہیں کہ کبھی ہم بھی ایسے ہی رہے ہوں گے، لیکن یاد رکھو کہ یہ واقعات ہیں ہمارے دلوں سے مٹنے کو مٹ جائیں لیکن ساری فضائے عالم اُن کی شاہد ہے۔ آسمان و زمین کے صفحات ان کے تذکروں سے مالا مال ہیں حوریں انھیں گا گا کر عدن میں سکون پھیلا رہی ہیں۔ کیا تم بھول گئے کہ تمھاری عمر کے ہر ہر لمحہ میں کتنی نورانی تجلیات مرکوز ہیں، کتنے مقدس جذبات صرف ہوئے ہیں، کیا تم اُن احسانات کی وقعت نہیں کرتے؟ ادھر آؤ میری نگاہ سے دیکھو، آسمان و زمین کانپ رہے ہیں،

عرش لرز رہا ہے۔ دنیا تھرا رہی ہے۔

اے ناشکر کیڑے! تیرے مٹا دینے کے لئے کسی بہانہ کی ضرورت نہیں، مگر وہ سینہ جس کو تو اپنے کفران نعمت سے مجروح کر چکا ہے، اب بھی بد دعائیں دینے کے لئے تیار نہیں، وہ ہونٹ، جو تیری بے رحمیاں، تیری بے اعتنائیاں، دیکھ دیکھ کر فرط گریہ سے کانپ رہے ہیں، اب بھی گیتی کی ساری نعمتیں تیرے لئے طلب کر رہے ہیں۔

ہمارے جذبات محبت کس درجہ ناقص ہیں، ہم تاثرات کا ضبط گو چنداں مشکل نہ ہو لیکن آنسو کا نکل آنا محبت والی آنکھ کے اختیار سے باہر ہے، دنیا جانتی ہے کہ عورت مصائب برداشت کر لے، تکالیف کا مقابلہ کرنے کی اہل اسی وقت سے ہے جب وہ ایک فانی بچہ جنتی ہے، اسکی ادائے تسلیمیت کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ محنت و مشقت سے ہاتھ میں پڑ جانے والے چھالے ڈالوں کو بھی اپنے شوہر سے چھپاتی ہے۔ محنتیں کرتی ہے، اور کوئی اجر نہیں چاہتی لیکن بے اختیار کبھی کبھی مرد کے غیر معترفانہ طریقہ عمل سے متاثر ہو کر اس کا رد دنیا اک خاموش آنسو آستین یا دامن میں ٹپکا دینا اک غیر متزلزل ثبوت اسکے کمال محبت کا ہے جس سے مرد آشنا نہیں، جس طرح عورت اپنے جذبات کو خاموشی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے مدفون کر سکتی ہے۔ اسی طرح وہ اس طوفان گداز کو جو اسکے سینہ میں متلاطم ہے صرف ایک آنسو میں منتقل کر کے دکھا سکتی ہے لیکن کتنے ہیں جو اس آنسو کی وسعت اس مختصر سمندر کے حقیقی بسط سے واقف ہیں۔

محبت جس پر آفرینش ناز کر سکتی ہے ایک ایسا دل ڈھونڈھتی ہے جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جانے والا ہو، ایسی آنکھوں میں رہنا چاہتی ہے جو ذرا سی بات میں پرنم ہو جانے والی ہوں پھر اے مردو، اپنے دلوں کی مضبوطی پر دل دکھاؤ، اپنی آنکھوں کی خشکی پر آنسو بہاؤ۔ کیونکہ جس وقت محبت راتوں کو دروازہ کھٹکھٹاتی ہے، کوئی آرام

کی جگہ تلاش کرتی ہے، تو اسے مرد اسوقت تو اپنے نشۂ قوت میں غافل سوتا ہوتا ہے
عورت جو تیجھے پنکھا جھلاتی رہتی ہے، جو کھڑے ہو کر اپنے بچہ کو سلاتی رہتی ہے۔ دروازہ
کھول دیتی ہے اور اسے اپنے سینہ میں چھپا لیتی ہے، بچہ روتا ہے وہ اس محبت کو
اپنے ہونٹوں سے بچے کے اندر منتقل کر دیتی ہے، وہ سو جاتا ہے۔

ہم کشاکش زندگی سے پریشان ہو کر پڑ جاتے ہیں، وہ اس محبت سے ہماری
خستگی کو سلب کر لیتی ہے، ہم مسرور ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ ہماری روحی ایذائیں ایک
روحانی شفقت چاہتی ہیں ایک ملکوتی نرمی کی طلبگار ہیں اور اس لئے یہ ہم جستجوئیں
آخرکار اس طرف کھنچ جاتی ہیں جدھر انھیں کھنچ جانا چاہیئے۔ کیونکہ عورت ایک روحانیت
ہے قابل لمس، نورانیت ہے صاحب نطق، ایک روشنی ہے جسے ہم چھو سکتے ہیں۔
ایک نکہت ہے جس سے ہم گفتگو کر سکتے ہیں، ایک حلاوت ہے جو ہاتھوں سے چکھی
جاتی ہے، اک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سنی جاتی ہے۔

---

# برسات

## ایک صحرا نشین کے نقطۂ نظر سے

ساون کی وہ سیاہ رات، رات کی وہ امنڈ پڑنے والی تاریکی، وہ پہاڑوں اور جنگلوں کو ہلا دینے والی گرج اور پھر اسکے تاریک پردہ سے فطرت کا وہ زہرہ گداز تبسم یعنی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب اس رات کی صبح کبھی نہ ہوگی، یہ بارش کائنات کی ہر چیز کو بہالیجائیگی یہ گرج آسمان و زمین کو پاش پاش کر دے گی اور یہ برق تمام عالم کو پھونک کر رکھدیگی، اے انسانی آبادیو، مجھے یقین نہیں کہ تم آرام و سکون کے ساتھ اسوقت زندگی بسر کر رہے ہو گے، مجھے معلوم ہے کہ تمہارے بدن کانپ رہے ہوں گے، تمہارے دل لرز رہے ہونگے تمہاری جانیں گھل گھل کر تحلیل ہو رہی ہونگی اور تمہارے سینے منظرِ فطرت کے اس حسین رخ سے بے خبر دہل رہے ہوں گے، لیکن میرے غار میں آؤ اور سنگین فرش پر بیٹھ کر اس حسن کا نظارہ کرو جس کو تمہارے محلوں کی اونچی دیواریں، تمہارے کمروں کے بھاری پردے اور تمہارے دلوں کی بند آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں، یہ نگاہوں کے سامنے غیر محدود وسعت والا رفیق میدان، یہ غیر متناہی البسط والی سیال زمین، مجھ سے پوچھو کہ جب بجلی دفعتہً آسمانوں کو شق کرتی ہوئی تمام عالم کو منور کر دیتی ہے۔ تو اس روشنی میں سبزہ کا ہوا کے ساتھ لہریں سی لینا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت تمام صحرا، سارا میدان ہچکولے کھاتا ہوا چلا جا رہا ہے لیکن بجلی کے گم ہو جانے کے بعد اس تاریکی میں بھی میری نگاہ کا بڑا جزو اس درخشاں منظر کے ساتھ ساتھ ہے، وہ ہوا کی سرد سنسناہٹ، وہ آبشار کی پرشور روانی،

وہ کبھی کبھی درندوں کی ہولناک آواز اور غار کے اندر ان تمام باتوں سے لطف اٹھانے والی تنہا میری جان ہیں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میں نہ ہوں تو یہ سارا نظام بدل جائے، ہوا ساکن ہو جائے آبشار کا پانی جم جائے، بجلی مچلنا اور بادل برسانا چھوڑ دے۔ میں کیسا خوش ہوں کہ اس منظر سے لطف اٹھانے والا سوائے میرے اور کوئی نہیں ہے کہ اپنی نگاہ سے اس کو جھوٹا کر دے میں ہوں۔ اور فطرت کے یہ مناظر، میری نگاہ ہے اور ان مناظر کی یہ دوشیزگی۔ اگر میرے غار میں پانی بھر رہا ہے تو بھرنے دو کہ قدرت میرے مسکن کا فرش دھو رہی ہے، اور میرے پاس کوئی سامان نہیں کہ اس کی تباہی کا درد مجھے بیتاب کر دے اگر سرد ہوا سے میرا جسم کانپ رہا ہے تو کانپنے دو کہ صبح گرم آفتاب کا نکلنا صرف اسی پر منحصر ہے۔ اگر میرے بدن کو گرمی پہونچانا مقصود نہ ہو تو وہ نکلے کیوں۔

اے محفوظ محلوں میں آرام کرنے والو، اپنی زندگی پر تاسف کرو کہ تمہارا حصہ اس میں نہیں ہے، سو جانے کے بعد ایک ساون کی مست رات بھی اسی طرح عالم بے خبری میں بسر ہو جاتی ہے۔ جس طرح گرما کی خشک گھڑیاں پھر تمہیں کیا معلوم کہ زمانہ کا کونسا لمحہ تم سے بیداری چاہتا تھا جسے تم نے غفلت و خواب کی گردو ٹول میں بسر کر دیا، جس وقت صبح کو بارش بند ہو جاتی ہے تو تم اپنے سامان و اسباب کے جائزہ اور اسکی بربادی کے ماتم میں مصروف رہتے ہو اور میں ایک شفاف چشمہ کے کنارے اطمینان سے اس پھیلے ہوئے سکون کو دیکھتا رہتا ہوں جو اسوقت موجوں کو اضطراب کے ساتھ بھی بہتا نظر آتا ہے، آہ مجھ سے پوچھو کہ جس وقت صبح اپنے کاسہ طلائی میں شراب زر چھلکاتی ہوئی نکلتی ہے، اس وقت میری تنہائیاں، پہاڑ کی ویرانیاں صحرا کی وسیع خلوت زائیاں اس سے کیسی شرابور ہو جاتی ہیں تمہارے آئینے صرف تمہاری بگڑی ہوئی صورتوں کو پیش کر سکتے

ہیں، آؤ میرے ساتھ اس چشمہ میں فطرت کے اس حُسن کا مطالعہ کرو جس کو زوال نہیں اس دلکشی میں غرق ہو جاؤ جس کو کبھی انحطاط نہیں، تمہارے اسباب تعیش گراں ہیں اور ناپائدار میرے سامان تفریح مفت ہیں اور لازوال، اس سے تم تھک جاتے ہو کہ وہ بہت محدود ہیں اور تنگ، اس سے میں اپنے اندر ایک سچا جوش اور حقیقی مسرت پاتا ہوں کہ وسیع ہیں اور غیر محدود۔

(۲)

افق بعید کے وہ ساحر بادل جن کے حیات بخش کناروں سے آفتاب کی کرنیں چھو کر آبشار رنگ میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اسوقت جبکہ شفق کی ارغوانی شراب ساری وادی کو کناروں تک لبریز کرتی ہوئی بہہ نکلتی ہے، ہاں مجھ سے پوچھو کہ پہاڑ کی چوٹی پر ایک سنسان اور ویران جھونپڑے میں وہ بادل مجھے کیا نظر آتے ہیں، میں اپنی آنکھوں میں طوفانِ رنگ کی روشن لہروں کو لیے بیٹھا ہوں اور ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری آنکھوں سے اسوقت موسیقی نکل نکل کر تمام وادی میں گونج رہی ہے، پہاڑ اور اسکے درختوں کا سکوت، وادی اور اسکی گہرائی کی خاموشی، پانی اور اسکی موجوں کا سکون یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اس موسیقی میں ڈوب کر سو گئی ہے۔

میری وہ ایک چیز جو غار کی تنگ آغوش اور تاریکی کے ایک محدود قفس میں اپنی وسعت کو سمیٹے ہوئے پڑی سو رہی تھی، اسوقت بیدار ہو کر انگڑائی لیتی ہے اور آفتاب کے چہرہ سے نقاب زرا اٹھا کر اس کا منھ چوم لیتی ہے اور اسکی کرنوں کے ساتھ آغوش سحاب میں کھل کھلا کر گر پڑتی ہے اور پھر روشنی کی ہلکی ہلکی موجوں کے ساتھ میری آنکھوں میں اتر آتی ہے اور خون میں رقص کرنے لگتی ہے، اب میں سمجھنے لگتا ہوں کہ یہ روح ہے۔ یہ حیات ہے اس کا نام زندگی

اور زندگانی ہے، میں اسوقت غار میں غار کے چاروں طرف پہاڑ ہیں، پہاڑ کے ہر ہر جامد پتھر میں، اور درخت ہیں، درخت کی ہر ہر پتی میں، زمین میں آسمان میں یا ساری کائنات میں اور خود اپنے اندر ایک جنبش بیداری محسوس کرتا ہوں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کے اندر اس وقت شباب موجزن ہے اور اگر کوئی چیز دوسری سی مل گئی تو پھر کبھی جدا نہ ہوگی۔

کسے خبر ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اسوقت میری پلکوں کی ہر جنبش ایک آغوش ہے جو کامیابی سے معمور اور اس معموری سے مطمئن نظر آتی ہے۔

آزاد اور سچی موسیقی کی لذتیں، پاک وغیرہ آلودہ مسرت کا جوش، نزاکت و لطافت کی فراوانی پر تکلف محفلوں، آراستہ مجلسوں اور اُن افسردہ مضمحل آغوشوں میں نہیں ہے جن کو صرف تمہاری دولت نے مہیا کیا ہے، ادھر آؤ اور اس شفق کے سمندر میں شاخ بلوط کی لوچ کو دیکھو اور رشک کرو اس شاما پر جس کی ننھی سی منقار سے نکل کر سچی موسیقی کی روشنی تمام دنیا میں پھیل جانا چاہتی ہے، بجز نغمہ سے کائنات مضطر ہے۔

وہ صنوبر کی چوٹی پر فاختہ کا جوڑا یہ معصوم و پاک محبت کا اظہار، یہ اطمینان قلب یہ جمع خاطر معلوم ہوتا ہے کہ فطرت اس سکون مسرت کو لیکر ہر ہر ذرّہ پر چھڑک رہی ہے، یہ جنگلی پھولوں کی شراب لالہ رنگ سے بھرے ہوئے کٹورے! تیتری سے پوچھو جو ابھی ابھی ایک جرعہ پیکر اپنے رقص سے فضا کو مست بنائے ہوئے ہے۔ یہ نازک پتیوں کی شاداب و مسکر شیرینی! جھینگیوں کو دیکھو اور ان کی مخمور تھرتھری سے ارتعاش نگاہ کو کہ کیا تمہاری شراب رنگین نے کبھی یہ موج پیدا کی ہے؟

میں تو یہی سمجھتا ہوں، اچھا اگر غلط ہے تو مجھے بتاؤ، اپنے تمدن کی دلچسپیوں میں میرے لئے کوشش پیدا کرو، اپنے مادی اسباب طرب میں میرے دل کے لئے کوئی

جاذبیت ثابت کرو، میری روح کو اپنی مسرتوں کی طرف کھینچ لو، مجھے اپنی لذتوں کی طرف بلا لو اگر بلا سکتے ہو، تم کو اگر میری ویران زندگی پر افسوس ہے، اگر میری تنہائیوں یا میری بے سروسامانیوں پر تم اپنا دل دکھاتے ہو، تو اپنی منہمکِ حیات، اپنی عشرت سامانیوں اپنی محفل طرازیوں سے اس تفحص و اضمحلال کو پہلے دور کردو، جس سے ہر صبح تمھاری روح مغلوب نظر آتی ہے تم اپنے اندر ایک تھکن محسوس کرتے ہو اور چاہنے لگتے ہو کہ کچھ زمانے کے لئے اپنے اسباب طرب سے جدا ہو کر کہیں اور زندگی گذار دی جائے۔

میں تو اپنی صبح و شام سے کبھی بیزار نہیں ہوتا، میرے رات دن تو مجھ میں کبھی حزن و ملال پیدا نہیں کرتے، تمھاری مادیت ایک فریب ہے، خدا کے لئے میری روحانیت کو اس میں مبتلا نہ کرو، فطرت کی طرف سے مجھ میں خواہش انحراف پیدا نہ کرو، میری زندگی مجھ سے چھیننے کی کوشش نہ کرو کہ میرے نزدیک

حیات نام ہے صرف اُن تاثرات کا جو مناظر فطرت کی چھوتی فضا میں پیدا ہوں اور اسی میں تحلیل ہو جایا کریں۔

# ایک قافلۂ صحرا کو دیکھکر

اے آسمان کے نیچے، فرش زمین پر صحیح معنی میں زندگی بسر کرنے والے وحشیو، اے بادلوں کی طرح اپنی خانہ بدوش آوارگیوں میں گم رہنے والے صحرائیو، کیا مجھے بھی تم اپنے اس نشۂ وارفتگی میں کبھی شریک کر سکتے ہو، جس سے تم نے صحرا کے ذروں کو مخمور اور پہاڑ کی وادیوں کو معمور کر رکھا ہے؟ کچھ تو بتاؤ کیونکہ تمھاری اس لبریز سکون پراگندگی کی جمعیت کو اپنے دل میں بھر لوں؟ میں کس طرح تمھاری اس مرتحل معاشرت کے اندر چھپا ہوا جنگلوں کا سکوت، راتوں کا سکون چھین کر اپنی حیات کو دیدوں۔ تمدن کی ساری ہنگامہ خیزیاں، تہذیب و ترقی کی تمام جلوہ آرائیاں، دولت و حکومت کی جملہ نخوت سامانیاں اور سب کچھ وہ جو شاید تمھیں اپنی ایک بوسیدہ سی تہ ہوئی چادر کے اندر میرے پاس قابل رشک نظر آتا ہے، ہاں یہ سب لے لو، ابھی لے لو، اور ہمیشہ کے لئے، لیکن خدا کے لئے مجھے اپنی زندگی کی ایک گھڑی، اپنی حیات کا کوئی لمحہ دیدو کہ کچھ دیر تو اس سکون و اطمینان کو اپنے سینہ سے لگا سکوں جو بازار عالم میں ایک جنس نایاب ہے اور شاید کونین کے عوض بھی نہیں خریدا جا سکتا۔

تمھیں کیا بتاؤں کہ میں کس قدر بیتاب ہوں، کیسا تڑپ رہا ہوں، کیونکہ تم اس کرب و اضطراب سے واقف ہی نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر کہیں تم اس پر راضی ہو جاؤ اور میں ایک چاندنی رات، ایک صبح و شام بھی تمھارے ساتھ اک کھلے

ہوئے میدان میں اس اطمینان کے ساتھ بسر کرسکوں، تو شاید میں مر جاؤں گا اور اس مسرت کو برداشت نہ کرسکوں گا۔

وہ جنگل ہو یا بستی، ویرانہ ہو یا آبادی، تمہارا اسی طرح کسی صاف جگہ میں چار گز زمین پر چادر تان کر اپنے سارے خاندان اور نہایت محدود اسباب زندگی کو لیکر ساری عمر کاٹ دینا، اگر کچھ مل جائے تو کھا کر زمین پر چین سے سو جانا اور نہ ملے تو صبر کر کے خاموش رہ جانا آہ! تم انسان ہو لیکن پھر جی چاہتا ہے کہ تمھیں معصوم کہدوں اور تمہاری اس معصومیت کی داستانیں گا گا کر کائنات پر ایک غنودگی طاری کردوں اور خود بھی کہیں کسی پتھر پر سر رکھ کر ہمیشہ کے لئے غافل ہو جاؤں۔

ہاں، کہدو، اجازت دیدو کہ میں بھی تم میں آکر مل رہوں، میں چاہتا ہوں کہ دنیا پر کبھی تو ایک نگاہِ مستغنی ڈال کر دیکھوں کہ کیسا معلوم ہوتا ہے۔ میں عہد کرتا ہوں کہ کبھی تم سے وہ طلب نہیں کروں گا جو تمہارے پاس نہیں ہے، کبھی میں اپنی راحت و عشرت نظر آنے والی کلفت و صعوبت کے بیان سے تمہارے امن کو آزار نہ پہونچاؤں گا، میں تمہارے ساتھ وہی خشک روٹی کھاؤں گا جو تم مجھے دیدوگے، یا پھر بھوکا رہوں گا، اگر کبھی یہ بھی میسر نہ آئے، میں تمہارے ہمراہ سارا دن برہنہ پا چل کر کاٹ دوں گا، اس امید پر کہ شام کو تمہارے قیام کی سادگیوں میں حصہ لے سکوں اور میں تمہارے قافلہ کی اکیلی ہرنی، یعنی اس سانولی لڑکی کے ساتھ محبت کرنا سیکھونگا جس کی سیاہ پھڑکتی ہوئی آنکھوں کی وحشت سے ملا ہوا اسکی شوخ و پرصحت جوانی کا متوالا پن مجھے ایک ہی رات میں، اگر وہ چاہے تو ہمیشہ کے لئے چھلکا سکتا ہے اور جس کے سامنے صبح کو میں اپنی روح کی آسودہ نذر یعنی اک خمیازۂ خمار پیش کر کے نہایت مسرت سے اس دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں، میں نے عالیشان قصر کے اندر راحت وناز میں نشو ونما پانے والے حسن کی آرزو کر کے دیکھ لیا، میں نے زرکار درخشاں طبقوں

# کہکشاں کا ایک سانحہ

(۱)

ہاں اگر کہکشاں اور ملکۂ کہکشاں پر آسمان کی تمام دوسری سلطنتوں اور فرمانرواؤں کو رشک تھا تو جائے حیرت نہیں، کیونکہ کہکشاں سے زیادہ شاداب، کہکشاں سے زیادہ حسین ملک؛ حقیقت یہ ہے کہ کرہ ہوا کے معلق ملکوں میں کوئی اور نہ تھا۔ یہ ایک ایسا ملک تھا جسے قدرت نے پھولوں میں بھی یاسمین و نیلوفر کی پیداوار کے لیے مخصوص کر دیا تھا اور اس میں کلام نہیں کہ اگر یہاں کی فرمانروا ہستی کبھی چند دنوں کے لیے، خاص اسباب یا مصلحت کی بنا پر اپنے ہاں کی اس تبسم و خنداں پیداوار کی برآمد دوسرے ممالک کے لیے بند کر دیتی تو سارا آسمان اور آسمان کے تمام دوسرے ملک چیخ اٹھتے، محافل طرب سنسان ہو جاتیں اور اتنے دنوں کے لیے تمام مراسم تہنیت و مسرت مسدود، کیونکہ آسمانی مخلوق میں اظہار شادمانی و نشر طرب کا مفہوم سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہے کہ ہر شخص پھولوں کے ساتھ ہنسے اور کلیوں کے ساتھ مسکرائے وہاں اتنے دنوں کے لیے نیند مفقود ہو جاتی اور معابد ویران کیونکہ آسمانی بستیوں میں سو جانا صرف یہی تھا کہ پھولوں کی بیدار شگفتیوں میں راتیں بسر کر دی جائیں اور وہاں کی پرستش کچھ نہ تھی مگر یہ کہ پھولوں کو سونگھ سونگھ کر معابد کی کنواری لڑکیاں بے ہوش ہو جائیں۔

کہکشاں کا دوسرا نام بلوۃ النساء بھی تھا کیونکہ یہاں کی آبادی عورتوں، اور صرف عورتوں کی تھی اور جب دوسرے ملکوں کے مردوں کو ضرورت ہوتی کہ وہ یہاں

کی لڑکیاں حاصل کریں، تو وہ اپنی التجاؤں کو جنھیں وہ صرف آہ کی صورت شہاب ثاقب کے ذریعہ سے پہونچا سکتے تھے ملکۂ کہکشاں کے سامنے پیش کیا کرتے اور اسے اختیار ہوتا کہ اس مرد کی تمام حیثیات کو دیکھ کر وہ ایک لڑکی منتخب کرے اور کثیر دولت کے عوض میں جو زیادہ تر موتیوں اور جواہر کی صورت میں قبول کی جاتی، اسکے پاس کسی رات اس حال میں کہ وہ اپنے بستر پر انتظار کروٹیں لیتا لیتا کچھ غافل سا ہو گیا ہو دفعۃً پہونچا دے پہلے چند دنوں تک تو یہی دستور جاری رہا کہ لڑکیاں دوسرے ملکوں میں اس طرح بھیج دی جاتی تھیں اور پھر واپس نہ آسکتی تھیں، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ کہکشاں کی لڑکیاں دوسرے ملکوں میں زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتیں تو پھر ملکۂ کہکشاں نے لڑکیوں کو باہر بھیجنا قریب قریب بند کر دیا، اور بجائے اسکے لڑکیاں باہر بھیجی جائیں مردوں کو اجازت دیدی کہ وہ اپنی مطلوبہ کے پاس مہینہ میں چند دن یہیں آکر بسر کیا کریں، ہر چند کہکشاں کے آئین سلطنت و نظام مملکت کے خلاف تھا کہ کوئی مرد یہاں آکر ایک رات بھی گزار سکے لیکن ملکہ نے یہ معلوم کر کے کہ اس کے ملک کا بہترین حسن باہر جا کر فنا ہو جاتا ہے، اپنے قانون میں تھوڑی سی تبدیلی کو گوارا کیا اور اس طرح مردوں کی آمد و رفت کہکشاں میں شروع ہو گئی، اگر اس مواصلت عارضی کا نتیجہ اولاد نرینہ کی صورت میں ظاہر ہوتا تو مرد مجبور کیا جاتا کہ اسے اپنے ملک میں لیجائے۔ اور اگر لڑکی ہوتی تو یہیں رکھ لیجاتی اور مرد کو بالکل اختیار نہ ہوتا کہ وہ کبھی اس کے لیئے جانے کی خواہش کرے۔ الغرض کچھ اس قسم کا نظام مملکت کہکشاں کا اسوقت تھا جبکہ ملکۂ لالہ رخ وہاں حکمراں تھی۔

یہ ملکہ کچھ تو اس دولت پر مغرور ہو کر جو بے اندازہ و بے شمار اسکی سلطنت میں ہر جگہ بکھری ہوئی نظر آتی تھی اور کچھ اس خشونت مزاج کی بنا پر جو اسکی فطرت تھی ہر وقت چیں بہ جبیں نظر آتی اور یہ بات تمام آسمانی مخلوق میں اس قدر مشہور ہو گئی تھی کہ مردوں

کو اپنی التجائیں پیش کرتے خوف معلوم ہوتا تھا اور بارہا ایسا ہوا کہ اس نے اگر وہ کسی وقت خوش نہ ہوئی، ان درخواستوں کو بغیر سمجھے ہوئے رد کر دیا اور اس پر ایک لمحہ کے لئے بھی تاسف نہ کیا، تاہم اسے مردوں سے نفرت نہ تھی اور یہ جذبہ اسکے دل میں ابھی پیدا نہ ہوا تھا کہ ایک رات جب کہ وہ کسی تاثر سے مغلوب و ملول تھی اسکا شوہر ملک عطارد کا بادشاہ آیا اور وہ اس طرح کچھ مسرور رسی نظر آنے لگی، لیکن آدھی رات گذر جانے کے بعد جب لالہ رخ نے اس کو لیٹ جانے پر مجبور کیا اور وہ نہیں مانا کیونکہ وہ اشعۂ نکہت پر اپنے جدید تجربات کو جو اسی دن حاصل ہوئے تھے جلدی جلدی لکھ رہا تھا کہ کہیں بھول نہ جائے۔ تو اس کو مردوں سے نفرت بھی ہو گئی اور اسی واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کی آمد و رفت اس نے بالکل بند کر دی اور رسم مناکحت قاطبۃً مسدود، جس زمانہ کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ یہی زمانہ تھا جب لالہ رخ کے سامنے یا کہکشاں کے ملک میں کسی جگہ مرد کا نام لینا بھی سخت جرم سمجھا جاتا تھا، اس نے حکم دیدیا تھا کہ اس کے دربار میں، اس کے ملک میں کسی جگہ مرد کا ذکر بھی نہ کیا جائے اور مرد کی اس خود غرض جنس کو جو، عورت نہ ملے تو یکسر اضطراب و اضطرار ہے اور اگر مل جائے تو سراپا غفلت و پندار، بالکل بھلا دیا جائے کہ اب یہ جنس پیدا ہونا ہی بند ہو گئی ہے جس وقت ملکہ کہکشاں نے یہ اعلان اپنے ملک میں شائع کیا اس وقت اس کی لڑکی ریحانہ کی عمر صرف دو سال کی تھی اور اس کا نشو و نما ایسے زمانہ میں ہوا جب مرد کا وجود کہکشاں میں مفقود تھا اور اس کا ذکر ممنوع۔ اس اعلان کو پندرہ سال ہو گئے اور لالہ رخ نے باوجود اس کے کہ تمام سلطنتوں نے اپنے آہ و شیون سے سارا آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اپنے ارادہ کو بالکل متزلزل نہ ہونے دیا اور وہ اپنے عہد پر بدستور قائم رہی۔

---

(۲)

شاہزادی ریحانہ اپنے حسین بالوں کے سیاہ و دراز ریشم کو پیٹھ پر منتشر کئے ہوئے بیاضِ گردن کی نہ چھپنے والی برق صبح کی عریانیوں کو ان بادلوں کی آغوش میں چھپائے ہوئے، اپنے یاسمینی شانہ و دوش پر یہ آبشارِ سنبلیں لیے ہوئے ساحلِ بحر پر کھڑی دیکھ رہی تھی کہ جب آفتاب سمندر کے اندر سے تازہ تازہ نہا کر باہر نکلتا ہے تو کائنات کی ہر چیز اس کی پذیرائی کس طرح کرتی ہے، وہ صبح کی ہلکی ہلکی ہوا میں اس طرح جنبش کھا رہی تھی جیسے ساحل پر ایک سروِ زریں جھوم رہا ہو، اسکے بالوں کو نرم نرم جنبش، ہوا کے ساتھ چھوٹے چھوٹے پھلوں کا پیٹھ پر گھوم گھوم کر رہ جانا کچھ اس درجہ لطافت پیدا کر رہا تھا کہ انھیں دیکھ کر یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ بال ہیں، بلکہ وہی ہوا کی ہلکی ہلکی موجیں ہیں جو ریحانہ کی پشت اور شانہ و دوش کو چھو چھو کر سیاہ ریشمی لچھوں میں تبدیل ہوتی جاتی ہیں، ایک چادر جو صرف جوہی کے پھولوں کو گھاس کے تنکوں میں پرو کر اور تنکوں کو باہم ایک دوسرے سے ملا کر تیار کی گئی تھی، اسکے بلور سے شفاف جسم کو لپیٹے ہوئے تھی، اسکے گورے گورے ہاتھ شانوں تک کھلے ہوئے تھے اور اسکی گردن بھی سینے کی اس حد تک جہاں سپید پھولوں کے محرم میں اس کا طوفانِ شباب کسی طرح چھپائے نہ چھپتا تھا، کھلی ہوئی تھی ہاں وہ، اسوقت سپید پھولوں کے اس ملبوس میں جو اسکے جسم پر ایک ہلکے گلابی رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا تھا، اپنے خوبصورت جسم، اپنے حسین اعضا کے تناسب کو بغیر اس خواہش کے کہ انھیں پوشیدہ رکھے، کسی کی نگاہوں میں ایک حریص جستجو، اک پرشوق نفوذ کی کیفیت پیدا کرے۔ چھپائے ہوئے طلوعِ آفتاب کے نظارہ کو اپنی نگاہوں کے مس سے شاندار بنا رہی تھی، وہ آفتاب کے ارغوانی چہرہ میں خدا جانے کیا چیز ایسی محسوس کر رہی تھی کہ ٹکٹکی باندھے کھڑی ہوئی تھی، وہ اسوقت کے خاموش منظر میں جیسے

سمندر کی لہریں ضیاء آفتاب کے ٹکڑے کرنے میں ایک طرف خاموشی سے مصروف تھیں، تنہا نہ تھی۔ لیکن اسکی کنیزیں جو دور ایک مودب فاصلہ پر کھڑی ہوئی شاہزادی کی اس محویت کو اپنے اندر سکوت و خاموشی میں تبدیل کئے ہوئے دم بخود کھڑی تھیں کچھ بول نہ سکتی تھیں کیونکہ شاہزادی کے سکوت میں دخل دینا ریحانہ ایسی جلیل القدر شاہزادی کے انہماک میں بات کرنا خلاف تہذیب تھا، وہ جنبش نہ کر سکتی تھیں کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ جب ریحانہ کا جسم کسی خاص وجہ سے حرکت کو قبول نہ کرے تو انھیں بھی اپنی ہستیوں کو مجسمہ بنالینا چاہیئے اسوقت تک کہ ریحانہ خود ہی اپنے چشم سامری فن کے اشارہ سے ان میں جان ڈالکر بولنے کی اجازت نہ مرحمت کرے صنوبر اپنے بربط کو اور سنبل اپنے ارغنوں کو ہاتھ پر لئے ہوئے ریحانہ کے قریب ہی پیچھے کھڑی ہوئی تھیں اور منتظر تھیں کہ شاہزادی اس طرف مخاطب ہو تو وہ اپنے نغمۂ صباحی کے ہدایائے لطیف کو پیش کریں، لیکن شاہزادی کی کیفیت وہی قائم رہی یہانتک کہ صنوبر و سنبل تھک گئیں اور ان کے ہاتھوں سے ساز چھوٹ کر زمین پر گر پڑے اور تار کی جھنکار نے ریحانہ کے خیال کو اپنی طرف مائل کیا، سنبل و صنوبر دونوں کھڑی کانپ رہی تھیں، گویا التجا کر رہی تھیں کہ اگر ساز کے اندر بلا اجازت آہنگ ارتعاش پیدا ہو گیا ہے تو ہمارے جسموں کی تھرتھری پر رحم کھا اور معاف کردے۔ ہمارے اعضاء کی کپکپی کو دیکھ اور سمجھ لے کہ تیرے ساز کے تاروں کا ارتعاش ہم نے ہوا میں نہیں مل جانے دیا بلکہ اپنے جسم پر طاری کرلیا ہے اور اس طرح ہم مستحق عفو ہیں۔ صنوبر و سنبل نے چاہا کہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا ساز اٹھائیں، لیکن ریحانہ نے منع کردیا۔ اور کہا کہ "نہیں ان کو یوں ہی پڑا رہنے دو جب ساز سے نغمہ جدا ہو جائے، جب موسیقی تاروں سے برہم ہوکر اپنا التفات ہٹائے تو پھر ساز کا ٹوٹ جانا اور تاروں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ہی خوب ہے، صنوبر تیرا بربط اور اے سنبل تیرا ارغنون ہی کب میری تسکین تھے،

کہ اب انھیں پھر درست کر کے میرے کانوں میں خراش اور میرے دل میں اضطراب پیدا کیا جائے گا۔"

ریحانہ کو گفتگو کرتے ہوئے دیکھ کر بنفشہ بڑھی اور اپنے دامن کے پھولوں اور کلیوں کا ایک انبار اسکے قدموں پر ڈال کر ادب سے خاموش کھڑی ہوگئی، ریحانہ نے سر سے پاؤں تک بنفشہ کو دیکھا اور بولی کہ کیوں تو نے ان نازک مخلوق کو صدمہ پہونچایا جبکہ ان کی نکہت کی خنکی مجھے مسرور نہیں کر سکتی، میرا بدن آپ سرد ہے، میرا خون خود رگوں میں جما جاتا ہے، تیرے باغ میں کوئی آتشیں پھول نہیں، تیرے چمن میں کوئی درخت ایسا نہیں، جو اپنی شاخوں سے انگارے پیدا کرے اور تو انھیں لا کر مجھے دے کہ میں انھیں اپنے سینہ سے لگا کر دل تپش میں کمی، اور ہونٹوں سے چھو کر انکی جنبش میں کچھ تو سانس کی حرارت محسوس کروں۔ ہاں، اے سوسن تو ہر رات میرے سرہانے بیٹھ کر اپنے افسانوں سے میری پلکوں کو ایک دوسرے سے ملا دینے کی کوشش کیا کرتی ہے چلی جا اور اسوقت تک میری خوابگاہ میں آنے کا ارادہ نہ کر جبتک تو مجھے یہ نہ بتا سکے کہ بلبل ایک پھول کے لئے کیوں سر دھنا کرتا ہے۔ ایک بھنورا کلی کو اپنی آغوش میں لے لینے کے لئے کیوں اس درجہ بیتاب نظر آتا ہے۔ ایک فاختہ کے سامنے دوسری فاختہ کیا چیز مست ہو ہو کر سنایا کرتی ہے۔ ایک طائر کیوں خوش نظر آتا ہے۔ جبکہ تم سب کسی کی بات اب مجھے پسند نہیں آتی اور نہ کسی کی معیت مجھے مسرور کر سکتی ہے، میں تم سے پوچھتی ہوں تم صرف ایک دوسرے کا منھ تکنے لگتی ہو۔ میں کہتی ہوں جواب دو تم گردن جھکا لیتی ہو، میں جانتی ہوں کہ تم سب مجھ سے کوئی بات چھپانا چاہتی ہو، اچھا تو جاؤ سب جاؤ، آج میں تنہا سمندر کے اندر لہروں کی آغوش میں اپنی کشتی سونپ دوں گی، اور کوشش کروں گی کہ اس ساحل پر جا کر اگر کوئی ساحل اس طرف ہے اس ساحل کی اذیتوں کو بھلا دوں۔"

کنیزیں منھ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں، اور ریحانہ جلد جلد قدم اٹھا کر اپنے تئیں کشتی کی آغوش

میں اور کشتی کو سمندر کے آغوش میں آزادانہ چھوڑ کر نگاہوں سے غائب ہو گئی۔

(۳)

آفتاب جو صرف چند ساعتوں کے لئے ملک کہکشاں کی زمین پر چمک کر غائب ہو جاتا تھا تھوڑی دیر میں سمندر کے اندر کہیں غرق ہو گیا اور ریحانہ کے سر پر ہلالوں کے جھرمٹ نے اپنا نورانی سایہ ڈالنا شروع کیا، کہکشاں کی مملکت میں پورا چاند کبھی طلوع نہ ہوتا تھا، بلکہ وہ اتنے ہلالوں کی صورت میں جتنے کہ ایک پورے چاند سے تیار ہو سکتے ہیں ایک زنجیر ہلالی کی صورت میں نمودار ہوا کرتا تھا۔ اسوقت سمندر پر، سمندر کی موجوں پر اک سکون طاری تھا اور کوئی ہلکی سی ہلکی آواز بھی علامت حیات کا پتہ دینے والی کانوں میں نہ آتی تھی، ریحانہ جس نے اس سے قبل کبھی ایسی جسارت نہیں کی تھی، جس نے اسوقت تک کبھی اپنے تئیں تنہا نہ دیکھا تھا گھبرا گئی، ڈر گئی وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح واپس جائے اور رات کے اس سنسان منظر سے جو اس پر مستولی ہوتا نظر آ رہا تھا کسی طرح سمٹ کر الگ ہو جائے اور وہ اسی فکر میں محو تھی کہ دفعتہً سمندر کی سطح میں اس نے ایک جنبش محسوس کی اور پانی کے اندر سے نہایت تیز اور لانبی لانبی شعاعوں کو نکلتے ہوئے اور اس کی کشتی کو چھوتے ہوئے اس نے معلوم کیا کہ ان شعاعوں کا اثر کشتی پر اس طرح ہوتا ہے جیسے کوئی ہاتھ سے اُسے ڈھکیلے، اور یوں ساحل کی جانب اس نے بڑھنا شروع کیا۔ وہ اس منظر سے جو اس کے لئے بالکل عجیب و غریب تھا بہت متاثر ہوئی اور تھوڑی دیر کے لئے بالکل بھول گئی کہ یہ شعاعیں اسے کہاں لئے جا رہی ہیں اور کیوں۔ وہ اسی خیال میں مستغرق اور اسی لذت میں سرشار تھی کہ کشتی دفعتہً ساحل سے ٹکرائی اور ریحانہ اس طرح اک لخت خشکی پر جا پڑی جیسے کسی نے اٹھا کر پھینک دیا ہو، نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس صدمہ سے کتنی دیر بیہوش و بے حس و حرکت پڑی رہی، لیکن جس وقت اس کی آنکھ کھلی

تو اس نے ایسا محسوس کیا کہ اس کا سر کسی آغوش میں ہے اور اس کے جسم کو کوئی چیز مس کر رہی ہے، وہ سمجھی کہ یہ کوئی خواب ہے اور نہایت پُر لطف خواب کیونکہ باوجود رات کی خنک ہواؤں کے وہ اپنے اندر اس آغوش سے گرم گرم شعاعوں کو سرایت کرتی محسوس کرتی تھی، اور چاہتی تھی کہ اسی طرح پڑی رہی اور ہمیشہ اس خواب کو دیکھتی رہے اسے کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی، وہ کبھی کبھی یہ معلوم کرتی تھی کہ اس کے لبوں کو کسی چیز نے چھوا، اسکے جسم کو مس کیا وہ ہر مس کے ساتھ اپنے خون کے اندر ایک عجیب پرمزہ حرارت نفوذ کرتی ہوئی پائی، مگر اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ چھونے والی چیز وہ اسکے جسم سے مس ہونے والی کیا شے ہے، وہ رات بھر اسی حال میں پڑی رہی اور صبح کو جس وقت آنکھ کھلی تو اس نے رات کی پرمزہ کیفیات کی کوئی علامت اپنے پاس نہ پائی سوائے ایک تحریر کے جو اس کے بالوں کی ایک لٹ سے بندھی ہوئی تھی اور جسے ریحانہ نے پڑھنا شروع کیا۔

" اے ریحانہ، اے ملکۂ کہکشاں کی بیٹی تجھے خبر نہیں کہ تیرے لئے تجھ سے دور کسی دوسرے ملک میں کیا کیا اضطراب برپا ہے۔ تیرا افسانۂ حسن رات کے تارے مجھے روز سنایا کرتے تھے میں کڑھا کرتا تھا کہ تجھے کس طرح دیکھوں، کیونکر اپنے شوق کو تیرے نازک قدموں پر ڈال کر تجھ سے رحم کی درخواست کروں۔ آج میں نے تجھے دیکھ لیا۔ آہ! میں نے کیوں دیکھا میں تجھے کس طرح سمجھاؤں کہ اب میرے شوق کا کیا عالم ہے اور میرے اضطراب کا کیا رنگ، تیری اتنی عمر جو میری جنس کے ذکر سے ناآشنا ہونے کی حالت میں گزر گئی ہے، کیونکر خفتہ تجھے سمجھنے دیگی کہ میں کون ہوں، اور تیرے لئے کیوں اس قدر بیتاب۔ تو، افسوس ہے کہ جذبۂ محبت سے بالکل بیگانہ ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک بیگانہ رکھی جائیگی، ورنہ تو سمجھتی کہ محبت کیا ہے اور محبت ایک شخص کو کس قدر تڑپا سکتی ہے میں چاہتا ہوں کہ تو میرے پاس ہو اور کبھی جدا نہ ہو، بیتاب ہوں کہ تو میرے پہلو میں ہو اور میں تجھے وہ

نغمۂ محبت سناؤں جس کے سننے کے لئے تیری ہستی ایک مجہول خلش اپنے اندر لئے ہوئے ہے، لیکن ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ ملکۂ کہکشاں نے مردوں کی آمد و رفت اپنے ملک کے اندر ممنوع اور انکی التجاؤں کے لئے در قبول کو بند کر دیا ہے اور اس طرح اگر اس نے ایک طرف آسمان کے تمام دوسرے ملکوں میں بے چینی پھیلا رکھی ہے تو دوسری طرف خود اسکے ملک میں بھی اک خاموش ماتم بپا ہے وہ چاہتی ہے کہ مرد عورت سے نہ ملے۔ کہکشاں کی کوئی لڑکی کسی مرد کی صورت نہ دیکھ سکے، اس لئے کہ میں مرد ہوں، کیونکر خواہش کر سکتا ہوں تیری کہ تو عورت ہے۔ آج جبکہ تو ساحل پر کھڑی ہوئی آفتاب کی شعاعوں کو اپنی نگاہیں، اپنے جسم کا لوچ اپنے بدن کا گداز چومنے کی اجازت دے رہی تھی میں بھی تجھے افق سے دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا جو تو اپنی کنیزوں سے کہہ رہی تھی۔ میں نے تجھے سمندر میں جاتے ہوئے دیکھا اور تڑپ گیا کہ آج شاید وہ وقت آگیا ہے کہ تجھے اپنے شوق کی کہانی سناؤں، اپنا افسانۂ محبت تجھ سے بیان کروں، شام ہوئی اور میں نے تیری کشتی کو اپنے ہاتھوں پر لیکر ساحل تک پہونچایا، تو بیہوش تھی اور میں بیان کر رہا تھا جو کچھ مجھے بیان کرنا تھا، میں نے رات بھر اپنے شوق کی کہانی اپنے لبوں سے تیرے لبوں کو اپنے ہاتھ سے تیرے جسم کو سنائی، لیکن اپنی صورت تجھے نہ دکھا سکا، کیونکہ میں ایسا نہ کر سکتا تھا۔ ملکہ لالہ رخ کی اجازت حاصل کئے بغیر اس ملک میں میری، اور کسی مرد کی صورت تیرے اور کسی عورت کے لئے مرئی نہیں ہو سکتی اب میں جاتا ہوں اور بتائے جاتا ہوں کہ اگر تو اب موسیقی میں کوئی لذت حاصل کر سکتی ہے صرف نغمۂ عشق ہے، وہ خوشبو جو ایک لڑکی کے شباب کو مسرور کر سکتی تھی صرف نکہت محبت ہے اور وہ افسانہ جو تیری عمر کی ایک دوشیزہ لڑکی کے لئے راحتیں مہیا کر سکتا ہے وہ صرف افسانۂ پرستارکا ہے جو تجھے اب کہکشاں کے ملک میں نصیب نہیں ہو سکتا؟ اپنی ماں سے پوچھ کہ یہ سب کہاں میسر آئے گا۔ اگر یہ سن کر وہ تجھ سے

برہم ہو جائے تو یقین کر لینا کہ اگر وہ میری دشمن ہے تو کچھ تیری بھی دوست نہیں اور پھر تجھے اختیار ہے چاہے اپنی ماں کے ان مظالم کو اپنے اور میرے لئے قائم رہنے دے چاہے ہمیشہ کے لئے اسکی ہو جائے جو تیرے لئے اتنا ہی بیقرار ہے جیسی تو ایک نامعلوم شے کے لئے"۔

ریحانہ اس تحریر کو پڑھ کر اچھی طرح سمجھ بھی نہ چکی تھی کہ اسکی ماں کنیزوں کے ایک ہجوم کے ساتھ دفعتہً آگئی اور اس کو اپنے گلے سے لگا کر ساتھ لئے ہوئے چل دی۔

(۴)

ملکۂ کہکشاں اپنے قصر میں خاموش و متفکر بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی کہ ریحانہ کے دل و دماغ سے اس غم کو کیونکر دور کر سکے، جس کے متعلق وہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ کس طرح پیدا ہوا۔ اسکو معلوم تھا کہ اسوقت تک مرد کا نام ریحانہ کے سامنے کبھی نہیں لیا گیا اسکو یقین تھا کہ کوئی افسانۂ حسن و محبت ریحانہ کو اسوقت تک نہیں سنایا گیا پھر ریحانہ نے یہ سوال اس سے کیوں کئے اور اسے کیونکر معلوم ہو گیا کہ مرد اور محبت کا بھی دنیا میں کوئی وجود ہے۔ میں نے بہت پوچھا لیکن اس نے نہیں بتایا۔ وہ کہتی ہے کہ خواب میں اس نے کچھ دیکھا اور سنا ہے اور اسوقت سے اسکے دل میں ایک خاص اضطراب کی کیفیت پیدا ہے۔ مگر خواب دکھانے والا۔ نیند کو آکر بے چین کرنے والا سوائے شاہزادۂ قمر کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تو کیا میں اپنے عہد پر اب ثابت قدم نہیں رہ سکتی کیا میں مجبور ہو جاؤں گی کہ اپنی ریحانہ کو ظالم و خود غرض مرد کے سپرد کر دوں صرف اس لیے کہ جب وہ سیر ہو جائے تو اسکا دل دکھانے لگے۔ اور جب اسکی خواہشات پوری ہو جائیں تو وہ تنفر کرنے لگے۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا مجھے منظور ہے کہ ریحانہ اس غم میں گھل گھل کر ہلاک ہو جائے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ مرد، ظالم و خود غرض مرد کی نفس پرستیوں پر اپنی بیٹی یا اپنے ملک کی کسی لڑکی کی قربانی کو جائز رکھوں، اس نے اپنی کنیزوں سے ریحانہ کو طلب کیا اور بولی کہ:۔

"اے ریحانہ یقیناً مرد کی ایک جنس ہے جو تیری پیدائش سے قبل یہاں آمد و رفت رکھتی تھی اور جس سے ہمارے ملک کی لڑکیاں ملتی جلتی تھیں میں نے انکی ادائیں پسند نہیں کیں اور ان کا آنا جانا بالکل بند کر دیا اور حکم دیدیا کہ میرے ملک کی لڑکیاں اس کا ذکر بھی نہ کریں، کیونکہ یہ جنس جس کے لیئے تیرے دل میں ایک خلش اک جستجو پیدا ہوئی ہے بڑی خود غرض جنس ہے اور ہرگز اس قابل نہیں کہ اس پر اعتماد کیا جائے اسکی محبت جھوٹی اسکے وعدے ناااستوار اسکی باتیں ناقابل اعتبار ہیں، وہ بیتاب رہتے ہیں کہ ہماری جنس کا کوئی فرد ان کو مل جائے، لیکن صرف اس لیئے کہ اسکی معیت کی لذت کچھ دن حاصل کر کے اسکی طرف سے بے پرواہ ہو جائیں، پھر یہ کلی کو کچھ دیکھ کر مل ڈالنے والا طبقہ، یہ پھول کی خوشبو سے چند لمحے مسرور ہو کر اسکی پنکھڑیاں توڑ کر منتشر کر دینے والا گروہ، اگر اب بھی کسی چمن کے اندر پذیرائی کرنے والی کلیاں، اپنی نمائشی شگفتگی پر مٹ جانے والے پھول رکھتا ہے تو ایک باغبان کا فرض ہے کہ وہ ان کلیوں، ان پھولوں کو گلبن پر یوں ہی خشک ہو جانے دے، اور اس لیئے ریحانہ اگر آج میں تیری خواہش پوری کرنے پر راضی نہیں ہوں کہ مرد کا حال تجھ سے بیان کردوں یا تیرے کسی شوق کی رعایت کو ملحوظ رکھ کے اس کی صورت تجھے دکھاؤں تو تجھے معذور سمجھ کر میرے چمن ہستی کی کلی صرف تو ہی ایک ہے اور میرے باغ حیات کا پھول صرف اک تیرا وجود۔ اس لیئے میں گوارہ نہیں کر سکتی کہ وہ میرے سامنے یوں تباہ و برباد ہو اور میں خاموش دیکھا کروں، مجھے معلوم ہے کہ تیرے دل کے اندر خلش کیونکر پیدا ہوئی اور وہ کون ہے جو تجھے مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے لیکن یہ یقین کر لے کہ میں اپنے عزیز سرمایہ مسرت و راحت کو یوں ارزاں و آسان نہ جانے دوں گی اور اپنی زندگی میں یہ کبھی روا نہ رکھوں گی کہ تجھے خود اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کردوں، دیکھ اے ریحانہ تو ایسی بات کے لیئے

ملول نہ ہو جو اگر تجھے آج حاصل ہو جائے تو کل اور زیادہ ملول کر دے تو ایسی چیز کے لیے مضطرب نہ ہو کہ اگر وہ تجھے صبح کو میسر آجائے تو وہ شام کو تیرے اندر اور اضطراب پیدا کر دے۔"

وہ اپنی تقریر کو ختم بھی نہ کر چکی تھی کہ دفعتہً دربار کے اندر اک لقبۂ نور پھیل گیا اور شاہزادی ریحانہ اسکے اندر وہی شعاعیں دیکھ کر جنھوں نے اسکی کشتی کو ساحل تک پہونچایا تھا، مبہوت و متحیر رہ گئی، ملکہ لالہ رخ نے فوراً سب کو رخصت کر دیا کیونکہ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ شاہزادۂ قمر کا پیام ہے جو ریحانہ کے لیے آیا ہے اور اس نے یہ پیام سننے اور جواب دینے کے لیے اپنے تئیں مع چند خاص کنیزوں کے کمرے کے اندر بند کر لیا۔

(۵)

ریحانہ پھولوں کے بستر پر پڑی ہوئی اپنی ٹھنڈی سانسیں ان کے خوشبو کے ساتھ فضا میں منتشر کر رہی تھی، زنجیر ہلالی اسکے سامنے جگمگا رہی تھی اور وہ اپنی نگاہوں میں ان کی برودت سے آنسوؤں کے ننھے ننھے موتی بنا بنا کر پلکوں سے ڈھلکا رہی تھی کہ دفعتہً اسکی یہ دایہ آئی اور ریحانہ کو اس قدر مغموم و افسردہ دیکھ کر بیتاب ہو گئی۔ اسکو ریحانہ سے بڑی الفت تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح اسکے غم کو دور کر سکے لیکن اسکے بس میں نہ تھا کہ وہ ملکۂ لالہ رخ کو اس عزم سے ہٹا دے یا ریحانہ کے دل سے اس جذبۂ مہلک کو دور کر سکے، ہفتوں گذر گئے اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور اس طرح ریحانہ کی حالت بد سے بدتر ہو گئی، اس نے اپنے تمام مشاغل تفریح ترک کر دئے اور ساری خواہشیں محو، اگر اسکا جی چاہتا تھا تو صرف اس بات کو کہ ایک بار وہ پھر اسی طرح کشتی میں تنہا نکل جائے اور پھر ساحل پر بیہوش ہو کر اسی خواب کو دیکھے جس کی لذتوں سے وہ اب بھی اپنی ہستی کو لبریز اور اپنے دل کو مالا مال

باتی تھی لیکن وہ ایسا نہ کر سکتی تھی کیونکہ ملکۂ کہکشاں نے سخت ممانعت کردی تھی اور بغیر اجازت قصر سے باہر قدم بھی نہ نکال سکتی تھی اس غم نے ریحانہ کو بالکل نڈھال اور اس سوگ نے اس کو افسردہ کر رکھا تھا جس کو دیکھ کر اسکی دایہ کڑھتی تھی، اور پریشان کہ کیا کرے۔

ایک رات جبکہ ریحانہ کی بیقراریوں کی کچھ انتہا نہ تھی اسکی دایہ سے نہ دیکھا گیا اور بولی کہ:۔

" اے ریحانہ بتا میں کیا کروں، میں آمادہ ہوں کہ تیری ماں کی بالکل پروا نہ کروں اگر اس طرح تیری مسرت واپس آسکے، مجھ سے اب یہ تیرا حال نہیں دیکھا جاتا، اس دن جب شاہزادۂ قمر کا پیام تیرے لئے آیا تو میں نے دبی زبان سے کہا تھا کہ یہ رد نہ کیا جائے لیکن ملکہ نے نہیں مانا اور مجبوراً خاموش رہنا پڑا، ریحانہ یہ سن کر چونک پڑی اور بولی کہ:۔

" شاہزادہ قمر کہاں ہے کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں اور مجھ سے کیا چاہتا ہے"۔

دایہ نے کہا " اے ریحانہ آسمان کی تمام مخلوق میں، کرۂ ہوا کی ساری آبادی میں قمر سے زیادہ حسین شاہزادہ کوئی نہیں۔ وہ بھی ایک وسیع سلطنت کا مالک ہے اور تم اسے تو نہیں لیکن اسکے چند خادموں کو ہر رات دیکھتی ہو اور اب بھی دیکھ رہی ہو یہ بلاؤں کا جھرمٹ جو تم اپنے ملک میں اسوقت درخشاں دیکھ رہی ہو۔ اسی کے ادنیٰ ملازم ہیں" ریحانہ نے کہا " اگر یہ اسی کے خادم ہیں تو پھر کیوں انھیں واپس بلا کے کہکشاں کو تاریک نہیں کر دیتا" دایہ بولی:" کہ یہ اصول نظام کے خلاف ہے، جب ایک ملک کے بعض خادم یا کارکن دوسرے ملک میں چلے جاتے ہیں تو پھر واپس نہیں آسکتے مثلاً جب کرۂ ارض میں راتیں تاریک ہوتی ہیں تو کہکشاں کے تمام قطعات گلزار مجبور ہو جاتے ہیں کہ رات بھر کھلے رہیں، اور اس طرح زمین کی تاریکی کو کچھ کم کرسکیں

اب اگر ملکۂ کہکشاں چاہے بھی تو اس کے خلاف نہیں ہو سکتا اور یہ ممکن نہیں کہ یہ اپنی خدمت کو زمانۂ قدیم سے چلی آتی ہیں چھوڑ دیں۔ یہی تو بات ہے کہ ہماری ملکہ اس طرف سے مستغنی ہے ورنہ آج سارے کہکشاں میں اندھیرا ہوتا اور کہکشاں کے تمام سمندروں کا مدوجزر مفقود۔"

ریحانہ (بے قرار ہوکر) "اچھا تو تمھیں کیونکر معلوم ہوا کہ شاہزادۂ قمر بہت حسین ہے"۔

دایہ:۔ "اسکا اندازہ تم خود کر سکتی ہو کہ جس کے ادنیٰ خادم ایسے ہوں گے وہ خود کیسا ہوگا۔ وہ تو اس درجہ حسین ہے کہ اسکی ہر گفتگو شعاع ہے اور اس کا ہر لمس درخشندگی"۔

ریحانہ:۔ "ہاں میں سمجھ گئی اس رات میں جب تنہا کشتی میں چلی جارہی تھی تو اس نے مجھ سے گفتگو بھی کی تھی، اور اس نے میری کشتی کو چھوا بھی تھا۔ کیونکہ میں نے ایسی درخشاں شعاعیں اس سے قبل کبھی نہیں دیکھیں، اچھا تو کیا میری مدد تم کر سکتی ہو اور کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بار پھر اس ساحل پر پہونچ جاؤں، آہ، کاش یہ میری آرزو پوری ہو سکتی۔" ریحانہ نے یہ کہا اور بے قرار ہوکر زار زار رونے لگی۔

(۲)

سارے کہکشاں پر ایک سکون مطلق طاری تھا، رات کے سناٹے میں ہر چیز اپنی اپنی جگہ مصروف خواب تھی، ہلال اپنی متین و سنجیدہ شعاعوں کو سمندر کی سطح پر پھیلائے ہوئے پانی کی موجوں میں جھولا جھول رہا تھا اور ریحانہ اپنی کشتی میں خاموش تنہا بیٹھی ہوئی چلی جارہی تھی وہ متحیر تھی کہ آج وہ شعاعیں کیوں نمودار نہیں ہوتیں آج اسکی کشتی کو ساحل کی طرف کیوں نہیں کوئی لے جاتا۔ کیا شاہزادہ قمر اب ملتفت نہیں رہا۔ کیا وہ اپنی رات کو اسی طرح مایوسی کے عالم میں سمندر پر تیرا کر گذار دیگی۔ وہ سخت مضمحل تھی اور نہایت

آزردہ کہ دفعتہً سمندر ایک نہایت تیز نورانی لہر کے ساتھ شق ہوا اور کشتی تیر کی طرح سمندر کی تہہ کی طرف خود غرق ہوتی چلی گئی۔

سب نے، ساری کائنات نے، تمام آسمان والوں نے، آسمان کی ہر مخلوق نے دیکھا کہ کہکشاں کا ایک نہایت ہی منور درخشاں تارا ٹوٹا اور بہت دور تک ایک سیمین خط بناتا ہوا چلا گیا۔ کہکشاں کا رنگ پھیکا پڑ گیا لیکن سارا آسمان جگمگا اٹھا، تمام دنیا چمک اٹھی، کچھ دنوں تک دیکھا گیا کہ ایک تارہ چاند کے پہلو میں جلوہ گر ہے اور اب بھی کبھی کبھی نظر آجاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قمر نے اسکی وہ عزت نہیں کی جس کا نہ وہ مستحق تھا اس سے وہ محبت نہیں کی جس کی توقع کی جاتی تھی، کبھی کبھی راتوں کی صرف چند ساعتوں میں اس افسانۂ محبت کی یادگار ہماری نگاہوں کے سامنے نمودار ہوکر غائب ہوجاتی ہے۔"

آہ! کیسی دردناک ہے اس دل کی داستانِ محبت جو اپنے محبوب کے لئے اپنی زندگی کی محفل کو اجاڑ دے، اپنی ہستی کی ساری رونق بزم خاک میں ملا دے صرف اس توقع پر کہ محبت کا جواب صرف محبت سے دیا جاتا ہے صرف اس امید پر کہ جس جلوۂ محبت کے توید سے دل کو گرویدہ بنایا گیا وہ ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا اور کیسی خطرناک ہے وہ داستان شوق جو ایک نازک دل والی کو صرف اس لئے سنائی جاتی ہے کہ اسکی تاب نہ لاسکے گی، اور رودیگی، وہ اسکو سنے گی اور اسکو صحیح جان کر اپنی زندگی کو قربانگاہ فریب پر چڑھادیگی، حالانکہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر اظہار تاسف نہیں کیا جاتا کہ ہم اپنی ایک ادنیٰ خواہش کے لئے کیسی کیسی حسین صورتوں کو برباد، کیسی کیسی بلند فطرتوں کو پست و ذلیل کر دیتے ہیں، سچ ہے دنیا میں عورت محبت کرتی ہے صرف اس لئے کہ وہ محبت پر مجبور ہے اور مرد محبت کرتا ہے صرف اس لئے کہ وہ اسکی مسرت ہے پھر یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ مجبوری جاتی رہے اور ہمیشہ ہوتا ہے کہ یہ مسرت ناپائدار ثابت ہو۔

# قربان گاہِ حسن

ظہور مسیح سے سیکڑوں برس قبل، جب ارض بابل کی ترقی اور بابل والوں کی تہذیب عروج کے بلند ترین نقطہ پر پہونچ گئی تھی، شہر اریدو، جو ساحل خلیج فارس پر واقع تھا ملک کے بہترین شہروں میں شمار کیا جاتا تھا، شہر اریدو ہر چند اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے بھی کچھ کم ممتاز درجہ نہ رکھتا تھا لیکن اسکی تمام عزت و عصمت زیادہ تر اس معبد سے وابستہ تھی، جو شماس (سورج کے دیوتا) کے نام سے منسوب تھا چونکہ ملک کے تمام دیوتاؤں میں شماس نہایت ہیبت و جبروت والا دیوتا تھا، اس لیئے اسکی آرام گاہ اپنی زینت و آرائش اپنی وسعت و بزرگی کے لحاظ سے تمام ارض بابل میں بے نظیر معبد سمجھی جاتی تھی اور ملک کا کوئی شخص ایسا نہ تھا، جو اریدو کا نام سنتے ہی ایک خیال عظمت اپنے دل میں پیدا ہوتے ہوئے محسوس نہ کرتا ہو اور وہاں پہونچ کر سر عقیدت آستانۂ شماس پر جھکا دینے کا جذبہ اسے بے قرار نہ بنا دیتا ہو۔

ملک کے امراء، رؤساء، ملک کے شعراء و حکما، اپنے والہانہ جذبات کو لیکر وہاں آتے، اور مہینوں صرف اس امید پر پڑے رہتے کہ شاید کوئی رات ایسی میسر آجائے کہ ان کی عینیں شماس کی شعاع جلوہ سے منور ہو جائیں۔ جب مردوں کا یہ عالم تھا تو ظاہر ہے کہ عورتوں کا کیا حال ہوگا۔ اور ان کے جلد متاثر ہو کر دیر تک متاثر رہنے والے دلوں کی کیا کیفیت رہی ہوگی۔

جس طرح یورپ کے قرون وسطیٰ میں تائب و تارک الدنیا عورتیں۔ پاکباز و

عفت مآب کنواریاں کلیسا کی خدمت کے لیئے اپنے تئیں وقف کردیتی تھیں، بالکل اسی طرح معبد اریدو میں بھی ایک بڑی جماعت ایسی عورتوں کی پائی جاتی تھی' بڑے بڑے امراء کی لڑکیاں بڑی بڑی دولتمند بیوائیں وہاں آتی تھیں اور راہبانہ زندگی کا وہ حسین و قاتل سوگ جس کی روحانیت میں خدا جانے کتنے اسباب مادہ کو ہیجان میں لانے کے لیئے مضمر ہوتے تھے' نہایت صدق و خلوص کے ساتھ اپنے اوپر طاری کرلیتی تھیں، ان میں سے بعض لڑکیاں ایسی تھیں جو اپنی ساری جوانی معبد شماس کی خدمت کے لیئے وقف کردیتی تھیں اور بعض ایسی بھی ہوتیں جو صرف ایک مخصوص زمانہ تک احرام عصمت باندھتیں اور پھر وہاں سے نکل کر نکاح کرلیتیں چونکہ ان کنواریوں اور عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی اس لیئے وہ صرف احاطۂ معبد ہی میں نہ رہتی تھیں' بلکہ شہر میں اور بھی متعدد مکانات ایسے تھے جہاں وہ ایک راہب یا راہبہ کی نگرانی میں اپنی باعصمت زندگی بسر کرتیں۔ بعض امیر گھرانوں کی بیٹیاں ایسی بھی تھیں جو سب سے الگ تنہا مکانوں میں رہنا پسند کرتیں اور اسی تزک و احتشام کے ساتھ رہتیں جس کی وہ اپنے گھروں پر عادی تھیں۔

جس وقت تک ارض بابل اپنے ارتقا کے مدارج طے کررہی تھی اسوقت تک یقیناً اس معبد کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں بہت ہی ہیبت و خشیت پائی جاتی تھی لیکن جب بابل کی ترقی انتہا کو پہونچ گئی جب تکمیل تہذیب میں کسی اضافہ کی گنجایش باقی نہ رہی' جب دولت نے عشرت اور عشرت نے اخلاق پر اپنا پورا اثر قائم کرلیا تو اریدو اور معبد اریدو کی شہرت بھی اپنا مفہوم بدلنے لگی، اور رفتہ رفتہ یہ مقدس مقام صرف عشق و محبت کرنے کی جگہ بن کر رہ گیا۔

وہ اُمراء جو پہلے صرف اس لیئے آتے تھے کہ اپنی دولت کو شماس کے آستانہ پر ڈال کر روحانی نجات حاصل کریں، اب بھی آتے تھے' لیکن صرف اس غرض سے کہ

شاید کوئی حسین نگاہ ان کی جاہ و ثروت، دولت و امارت کے سامنے جھک جائے،
چونکہ ان عورتوں سے ملنے کی اجازت ہر شخص کو تھی، اس لیے معبد اریدو کا ایک
مکان جہاں کنواری لڑکیاں رہتی تھیں ہر وقت ملک کے نوجوانوں سے آباد نظر آتا تھا
ارض بابل میں پردہ کا رواج نہ تھا، لیکن معبد اریدو سے تعلق رکھنے والی عورتیں
بے نقاب نہ رہتی تھیں اور کہا جاتا ہے کہ ملک کے نوجوانوں پر جو شدید دیوانگی کی
سی کیفیت طاری ہوگئی تھی وہ گورے گورے رنگ پر انھیں سیاہ ریشمی نقابوں کا
کرشمہ تھا، جو نگاہیں بچا کر دلوں کو اپنی طرف کھینچنے میں از بس کارگر ثابت ہو رہے تھے۔
جس زمانہ میں ہمارا یہ فسانہ شروع ہوتا ہے، معبد اریدو اپنی عشق خیزیوں کے
لحاظ سے حدِ کمال کو پہونچا ہوا تھا، اور وہاں کی تمام کنواریوں میں مراندا اپنے حسن و
جمال، اپنے کرشمہ و ناز کے لحاظ سے نہایت ممتاز درجہ رکھتی تھی، یہ ایک امیر گھر کی لڑکی
تھی جس کے والدین مر چکے تھے اور ساری دولت و جائداد، مراندا اور اس کی دوسری
چھوٹی بہن کے لیے چھوڑ گئے تھے، اس کی چھوٹی بہن نے اپنے بوڑھے چچا کے
پاس رہنا پسند کیا۔ مراندا، پانچ سال کا عہد دوشیزگی کر کے معبد اریدو میں آگئی۔
مراندا کے حسن میں وہ تمام رعنائیاں جنھیں فطرت کسی کو عطا کر سکتی ہے بدرجۂ اتم
موجود تھیں اور اس لیے معبد اریدو کی تمام کنواریاں اسے حاسدانہ نگاہ سے دیکھتی
تھیں۔ وہ کشیدہ قامت۔ چھریرے بدن کی نہایت متناسب الاعضاء لڑکی تھی، اسکے
لانبے لانبے سیاہ بال اسکی بڑی بڑی مست و سیاہ آنکھیں، اسکے نازک خد و خال
یہ تھیں وہ خصوصیات، مراندا کے حسن کی جن کو نہ صرف اریدو بلکہ ملک کا ہر رنگین
مزاج نوجوان اچھی طرح جانتا تھا۔ مراندا، حسین ہونے کے ساتھ ہی متین و خوددار
بھی اس درجہ تھی، کہ لوگ اس کے سامنے آتے ہوئے کانپتے تھے، اور خائف تھے
کہ کہیں یہ حسن کی متین دیوی اپنے غرور نگاہ سے زندگی کو خراب نہ کر دے، علاوہ حسن

ظاہر کے وہ جمال معنوی بھی، بدرجۂ کمال رکھتی تھی وہ تمام علوم مروجہ کی ماہر تھی اور ملک کی مختلف زبانوں کی شاعرہ، وہ اگر کبھی اپنا بربط لیکر بیٹھ جاتی اور اپنی نازک انگلیوں سے اس کے تاروں کو جنبش میں لاتی تو سننے والوں پر ایک سحر کی کیفیت طاری ہو جاتی اور اگر کبھی وہ ساز کے ساتھ گانے لگتی تو لوگ ایسا محسوس کرنے لگتے کہ شاید سورج کا دیوتا شماس، مراندا کی آواز اور مراندا کے بربط کے ذریعہ سے مخلوق کو اپنا معجزہ دکھا رہا ہے، وہ جانتی تھی کہ دنیا اسکے لئے تڑپ رہی ہے، اسے علم تھا کہ دنیا میری طرف کھنچی چلی آرہی ہے، اسے یقین تھا کہ خدا کی مخلوق اس کی نگاہوں کی زخم خوردہ ہے۔ لیکن اسے مطلق پروانہ تھی وہ ایک لمحہ کے لیئے بھی کسی کے دل میں یہ جسارت پیدا نہ ہونے دیتی تھی کہ اپنے جذبات کا اظہار کرسکے، وہ لوگوں کو سرد آہیں بھرتے دیکھتی تھی اور مسرور تھی، وہ نوجوانوں کو اپنی جانیں دیتے ہوئے سنتی تھی اور خوش ہوتی تھی حقیقت یہ ہے کہ اسے اپنے حُسن پر بڑا غرور تھا، بڑا پندار تھا اور وہ اپنی جگہ ایک مستقل دیوی بنی ہوئی تھی۔

ایک زمانہ اسی حال میں گزر گیا، یہانتک کہ مراندا نے اپنے حُسن کے اٹھارہویں سال میں ایک اور قیامت خیز قدم رکھا۔ چونکہ اریدو کی فضا میں اب اس قدر گنجائش بھی نہ تھی کہ وہ ہلکی سے ہلکی کراہ کو اپنے اندر جگہ دے سکے۔ اس لیئے عشق کا دیوتا چونکا اور مراندا کی یہ ستم رانیاں دنیائے محبت میں دیکھ کر اُس سے انتقام لینے کے لیئے آمادہ ہوگیا، معبد اریدو میں یہ دستور تھا کہ ہفتہ میں ایک بار عبادت سے فارغ ہونے کے بعد چند راہب شہر میں مصارف معبد کے لئے چندہ جمع کرنے نکل جاتے اور شہر کے عمائدین سے ایک معقول رقم فراہم کرکے لوٹتے۔ ایک دن مراندا اپنے مکان میں تنہا بیٹھی ہوئی کچھ گنگنا رہی تھی کہ ایک راہب کے آنے کی اطلاع اس کو ملی، اس نے راہب کے آنے کی غرض کو سمجھ لیا، اور اندر بلالیا، یہ ایک

نوجوان راہب تھا جو حال ہی میں داخل ہوا تھا مرانڈا نے غور سے اس کو دیکھا تو اس کے دل میں ایک حرارت سی محسوس ہوئی اور چہرہ کا رنگ متغیر ہونے لگا، راہب قریب آیا اور نگاہیں نیچی کر کے اپنا دامانِ سوال مرانڈا کے سامنے پھیلایا، لیکن مرانڈا نے انتظار کیا: اتنا انتظار کہ راہب نے اپنی نگاہیں اُٹھا کر اسے ایک بار دیکھا اور دیکھتے ہی پھر شرم سے اگر دن جھکالی۔ اس تصادم نگاہ نے مرانڈا کے دل کو ایک کاری زخم پہونچایا، جس سے بیقرار ہو کر اس نے اپنے چہرہ پر نقاب ڈال لی۔ اور اپنا ہاتھ بڑھا کر ایک طلائی سکہ اس کو دیا۔ حالانکہ وہ اپنا دل اس سے پہلے اسی وقت راہب کی جھولی میں ڈال چکی تھی جب اندر آتے ہی اس نے اپنا دامن مرانڈا کے سامنے پھیلا دیا تھا۔ وہ خیرات لیکر چلا گیا، لیکن مرانڈا ایک خاص حالت تاثر میں خاموش پلنگ پر لیٹی رہی، وہ مرانڈا جس نے آج تک مردوں کا مصرف صرف یہی سمجھ رکھا تھا کہ وہ عورتوں کے لئے بیقرار ہوں اور فنا ہو جائیں، وہ مرانڈا جو مردوں کے جذبات محبت کو اپنی نخوت و خودداری کے سامنے پامال ہوتے ہوئے دیکھ کر مسرور ہونے کی عادی تھی، وہی مرانڈا اس وقت بے قرار و مضطرب بھی تھی اور وہی اس خیال سے کانپ بھی رہی تھی، کہ کہیں اس کی خواہشیں پامال نہ کر دی جائیں۔ عشق کا دیوتا اسے دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

مرانڈا اسی فکر و استغراق کی حالت میں تھی کہ خادمہ آئی اور مرانڈا کو خلافِ معمول افسردہ مضمحل دیکھ کر متعجب ہوئی، کیونکہ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس نے مرانڈا کو، جس کی زندگی یکسر عیش و مسرت تھی، ملول دیکھا ہو۔ اس نے تھوڑی دیر انتظار کیا کہ شاید مرانڈا کچھ کہے، لیکن جب اس نے کوئی گفتگو نہ کی تو خود اس نے سوال کیا اور مرانڈا نے قصداً کوشش سے چہرہ کو متبسم بنا کر کہا۔

"یہ نیا راہب جو آج میرے پاس آیا تھا کون ہے۔ میں نے تو اسوقت تک اُسے نہیں دیکھا تھا" خادمہ نے جواب دیا کہ اس راہب کو آئے ہوئے ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا ہے۔ یہ شہزادۂ کپا دوشیا ہے۔ جو ایک سخت حادثہ سے متاثر ہو کر یہاں چلا آیا ہے اور اپنی ساری زندگی معبد اریدو کے لئے وقف کر چکا ہے"۔ مراندا نے حیرت سے پوچھا" ساری زندگی! حیرت ہے وہ تو ابھی بالکل نوجوان ہے، ہاں وہ حادثہ کیا ہے؟"...... خادمہ بولی" اس کا نام حیرون ہے وہ ایک خاتون سے محبت کرتا تھا، لیکن لڑکی کے باپ نے جو ایک خود غرض و طامع شخص تھا حیرون کے بڑے بھائی سے اسے منسوب کر دیا تھا، کیونکہ وہی تخت کپا دوشیا کا مالک ہونے والا تھا، تاہم چونکہ حیرون اس خاتون میں باہم بہت محبت تھی، اس لئے دونوں کبھی کبھی ملتے تھے، یہ خبر رفتہ رفتہ حیرون کے باپ اور اس کے بھائی تک پہونچی اور انھوں نے کچھ آدمی متعین کئے کہ حیرون کو جہاں کہیں وہ ملے ہلاک کر ڈالیں ایک رات جبکہ حیرون اپنی وحشت و جنون کے عالم میں شہر سے باہر پھر رہا تھا، اس پر حملہ کیا گیا اور دشمن اسے خون آلود چھوڑ کر چلے گئے، اتفاق سے ایک مسافر ادھر سے گزرا اور اس نے حیرون کو اٹھایا اور اپنے گھر لے گیا جب چند دن کے بعد وہ صحتیاب ہو گیا تو اس نے مفصل حالت اپنی محبوبہ کو لکھی جس سے متاثر ہو کر وہ بیمار ہو گئی اور چند دن میں مر گئی، حیرون کو جب اپنی محبوبہ کی موت کا حال معلوم ہوا تو وہ اریدو چلا آیا، اور اپنی تمام زندگی معبد شماس کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔"

مراندا نے یہ سنکر، حالانکہ وہ حیرون ہی کا ذکر کرنا اور سننا چاہتی تھی، کوئی اور سوال نہیں کیا مبادا خادمہ مشتبہ ہو جائے علاوہ اسکے اب شام بھی ہو گئی تھی اور زائرین مراندا جمع ہو چکے تھے، اس لئے یوں بھی کوئی موقعہ گفتگو کا نہ تھا۔

(۲)

شام کو مراندآ کا مکان شہر کے امراء و روٗساء سے بھر جایا کرتا تھا اور وہ اپنی نگاہوں کے افسوں اور باتوں کے جادو سے سب کو مسحور کیا کرتی تھی، لیکن آج وہ کچھ افسردہ تھی، اس کا چہرہ ضرورت سے زیادہ متین نظر آرہا تھا۔ سب نے اسکو محسوس کیا اور آہستہ آہستہ خود ہی کچھ سمجھ کر رخصت ہوگئے۔

مراندآ اپنے تنہا رہ جانے سے بہت خوش ہوئی کیونکہ اب اس کا خیال صرف اس نوجوان راہب کے ساتھ پھر رہا تھا اور کسی بات کو اسکا جی نہ چاہتا تھا جیروٗن کی صورت، اسکے خوبصورت خدوخال، اس کا حُسن مردانہ اور پھر سب سے بڑھ کر اسکی نوخیز جوانی، یہ تھی وہ سب باتیں جو اسوقت مراندآ کے دل پر قابض ہوئی جاتی تھیں۔ اب اس کے لیے کسی چیز میں لذت نہ تھی مگر جیروٗن میں اور جیروٗن کے ذکر میں وہ کبھی اپنے اوپر ملامت کرتی کہ میں جو دنیا کی بڑی سے بڑی قوت کو نگاہ کی ایک جنبش سے اپنا مطیع و فرمانبردار بنا سکتی ہوں۔ ایک پریشان حال مفلس سے کیوں محبت کروں، لیکن اسکا ہیجان پھر سمجھا دیتا کہ جیروٗن تو شاہی خاندان کا ایک فرد ہے، نوجوان ہے، حسین ہے، کبھی مراندآ یہ خیال کرتی کہ جب اس نے تمام عمر معبد رشماس کی خدمت کے لیئے وقف کردی ہے تو وہ شادی کے لیئے کیوں آمادہ ہونے لگا، لیکن یہاں بھی مراندآ کا وہ جوش جو اس کو مبہوت و دیوانہ بنائے ہوئے تھا، کچھ سمجھا دیتا اور مراندآ خوش ہوجاتی کہ مقصود کے لحاظ سے شادی اور یوں ہی مل رہنا ایک ہی چیز ہیں اور جوانی کی بھڑکتی ہوئی آگ کو کبھی کبھی لوگوں سے چھپ کر یوں ہی بجھا لینا بُرا نہیں۔ کبھی مراندآ یہ سوچتی کہ جب اس نے ایک خاتون کی محبت میں اپنے اوپر تمام لذتیں حرام کرلی ہیں تو وہ شاید اس پر راضی نہ ہو، مگر وہ اس خیال کے آتے ہی کن انکھیوں سے

آئینہ کو دیکھتی اور فرطِ غرور سے تن جاتی، وہ یہ سمجھتی کہ میں کسی کو مفتوح کرنے کا قصد کروں اور ناکامیاب رہوں محال ہے، وہ ہزار پاکباز سہی، اسکی رہبانیت لاکھ قوی سہی، مگر یہ ناممکن ہے کہ میں خلوت میں محبت آمیز نگاہ سے دیکھ کر اپنی آغوش اس کی پذیرائی کے لیئے کھول دوں اور وہ مجبور ہو کر اپنا سر نہ جھکا دے، وہ سمجھتی تھی کہ اگر میری زلفوں کی تاب سے وہ بچ گیا، تو نگاہوں کے تیر سے کیونکر جانبر ہو سکے گا اگر میری کشیدہ قامتی پر فریفتہ نہ ہوا تو میرا رکھ رکھاؤ یا میری زیبائش و آرائش کب، اسے چین لینے دے گی۔ اگر میرا سارا حسن و جمال، میرا تمام فنِ دلبری کارگر نہ ہوا تو بھی میری جوانی، یہ میری موسم کی مستیاں کہاں جائیں گی، راہب کیا اگر خود شماس (سورج کا دیوتا) ہو تو وہ بھی اس کتاب کی تاب نہیں لا سکتا اور اسے بھی ایک بار میرے سامنے سر جھکا دینا ہے، بہر حال مراندا نے غروب حیرون کو مغلوب و مفتوح کرنے کا عزم کر لیا اور اس خیال سے وہ اب روز معبد جانے لگی۔

جاتی اور کسی نہ کسی طرح حیرون کو دیکھ لیتی، ادھر غریب حیرون کو یہ خبر نہ تھی کہ وہ کس طرح بیخبری کے عالم میں مراندا کو زخمی کرتا چلا جاتا ہے، اور مراندا کس درجہ بیتاب ہے۔

(۳)

چار مہینے گذر گئے اور کوئی تدبیر اس کے ذہن میں نہ آئی آخر کار اس نے حیرون کے پاس ایک تحریر روانہ کی جس کا مفہوم یہ تھا:۔

" اے حیرون تو کس قدر خوش نصیب ہے کہ اس عہد کی ایک نہایت حسین دولتمند نوجوان خاتون تجھ سے محبت کرتی ہے اور اپنی ساری دولتِ حسن جو دنیا کی تمام سلطنتوں کو مول لے سکتی ہے۔ تجھ پر نثار کرنے کے لیئے آمادہ ہے، کیا تو اس خاتون کی پذیرائی کر سکتا ہے۔"

یہ تحریر اس نے کسی اور کی طرف سے بھیجی تھی، جس وقت حیرون کے پاس یہ

تحریر پہونچی وہ سخت متحیر ہوا کہ اس اجنبی مقام میں وہ کون سی خاتون ہے جو مجھے زیر بار احسان کرنا چاہتی ہے، لیکن اس نے کوئی جستجو نہ کی اور یہ تحریر دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ جب کئی روز مرانڈا کو حالت انتظار میں گزر گئے اور کوئی جواب اسے نہ ملا تو بیتاب ہوکر دوسری تحریر بھیجی۔

" تونے تحریر کا جواب نہ دیا۔ اب میں پھر لکھتی ہوں اور بتاتی ہوں کہ جس نے پہلی تحریر تیرے پاس بھیجی تھی وہ میں ہوں مرانڈا اور مجھی کو تیرے ساتھ محبت ہے۔ میں تیری مجبوریاں جانتی ہوں لیکن مجھے بتا کہ آخر اس معبد میں کیا رکھا ہے، خدا کی دنیا بہت وسیع ہے آتا کہ میں تیرے ساتھ نکل چلوں۔ تیری محبت جو سانپ کے زہر کی طرح چڑھتی جاتی ہے، مجھے دیوانہ کئے دیتی ہے اور نہیں کہہ سکتی کہ کس وقت میں بے اختیار ہوکر تیرے قدموں پر گر پڑوں، تو کیا اسوقت تو مجھے ٹھکرا دے گا؟ "

حیرون نے اس تحریر کو بھی پڑھا اور خاموش ہوگیا، اس نے جواب نہ دیا تاہم وہ فکر مند ضرور تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے اضطراب کو کیونکر دور کرے۔ کچھ زمانہ اس طرح بھی گزر گیا۔ مرانڈا کی بیقراریاں اب سب پر نمایاں ہونے لگیں، اس نے لوگوں سے ملنا ترک کر دیا تھا اس کی محافل طرب ویران تھیں اور اس کے سارے مشاغل تفریح متروک، یہانتک کہ اریدو میں یہ خبر عام طور سے پھیل گئی کہ مرانڈا کسی خاص آزار میں مبتلا ہے جسے وہ کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔

جب مرانڈا نے دیکھا کہ حیرون اسکے جذبات محبت کی قدر کرنے کے لیے آمادہ نہیں تو اس نے اپنی دولت کو کامیابی کا ذریعہ بنانا چاہا اور نہایت قیمتی تحائف حیرون کے پاس بھیجنے شروع کئے، اب حیرون مجبور ہوگیا کہ مرانڈا

کو جواب دے چنانچہ ان تحائف کو واپس کرتے ہوئے لکھا کہ

"اے محترم خاتون، یہ تحائف میرے کس کام کے ہیں، وہ شخص جس نے دنیا کی لذتوں سے بیزار ہو کر معبد کے صرف ایک سنسان کونہ کو اپنی ساری دنیا قرار دے لیا ہو وہ تیری ان دولتوں کو لیکر کیا کرے گا، میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کہ تو دولتمند ہے میں یہ معلوم کر کے مسرور ہوتا ہوں کہ تو ذہین وقابل ہے میں اس خیال سے بھی مطمئن ہوں کہ خدا نے تجھے دولت حسن سے مالا مال کیا ہوگا۔ اس لیئے ایسی ذات کے لیئے جس پر اس قدر مہربان ہے جس کو اپنے انعام و اکرام اس قدر دے رکھا ہے، میری تمام دعائیں حاضر ہیں، لیکن اسکے عوض میں میری التجا صرف اس قدر ہے کہ تو میرے حال سے تعرض نہ کر کہ میں اس قابل نہیں۔ میں غریب ہوں اور بیکس، میں گدا ہوں اور ہیچکارہ، مجھے پڑا رہنے دے مجھے اپنی بقیہ زندگی یوں ہی ایڑیاں رگڑ کر بسر کر لینے دے کہ میری بیکسی، میری بے نوائی کفارہ ہے میرے ان معاصی کا جن سے میں اپنی روح کو داغدار دیکھتا ہوں۔ کاش میرے دل میں گنجائش ہوتی کہ میں تجھے دیکھ سکتا، میری آنکھیں بند نہ ہوگئی ہوتیں کہ میں تیری تصویر ان پر نقش کر سکتا، لیکن ایک مجبور پر رحم کر، ایک معذور کو معاف رکھ، اس کے لیئے ماضی کی حسرتیں کیا کم ہیں کہ وہ حال و مستقبل سے آرزوئیں وابستہ کر کے انھیں بھی مایوسیوں میں تبدیل ہوجاتے ہوئے دیکھے۔

میں تیرے حسین تحائف واپس کرتا ہوں کہ یہ تیرے ہی حسین جسم کے لیئے موزوں ہیں اور تیرے قیمتی ہدایا تیرے پاس ہی بھیجتا ہوں کہ تیری زندگی مجھ سے زیادہ قیمتی ہے۔"

جس وقت یہ تحریر مراندا کے پاس پہونچی تو وہ راہب کے انداز تحریر کو دیکھ کر اور دیوانہ ہوگئی اور اس نے عہد کر لیا کہ جبتک اس کے تقدس و رہبانیت کو داغدار

نہ کرلوں گی چین سے نہ بیٹھوں گی۔

اسی کشاکش میں چار مہینے اور گذر گئے، یہاں تک کہ آخر کار مرآندا نے اپنے آخری حربہ کی تیاری شروع کر دی جس کی نسبت اسکو کارگر ہونے کا پورا یقین تھا۔ یورپ کے کلیساؤں کی طرح معبد شماس میں بھی یہ دستور جاری تھا کہ ہر شخص اپنے لئے کسی راہب کو مخصوص کر لیتا تھا، تاکہ وقتاً فوقتاً اسکے سامنے اپنے معاصی کا اعتراف کرکے اپنے ضمیر کے بوجھ کو ہلکا کر سکے، مرآندا کا بھی ایک مخصوص راہب تھا۔ لیکن ایک شام جبکہ وہ معبد شماس کے احاطہ میں زیر نقاب، دوسری کنواریوں کے ساتھ آزادانہ پھر رہی تھی، اس نے حیردن کو دیکھا اور وقت کو غنیمت جان کر آگے بڑھی اور بولی:۔

اے مقدس راہب، میرا راہب کہیں چلا گیا ہے اور مجھے ضرورت ہے کہ شام ختم ہونے سے پہلے اپنے معاصی کا اعتراف کر دوں۔ کیا تو یہ خدمت میرے لیئے انجام دیگا"۔ حیردن مذہبیاً اس خواہش کو مسترد نہ کر سکتا تھا، اسے راضی ہونا پڑا اور معبد کے خلوت کدہ میں جو اسی رسم کے لیئے مخصوص تھا مرآندا کو لے گیا۔

معبد کی اس تاریک و تنہا خلوت میں، مومی شمعیں روشن تھیں، چاروں طرف سیاہ پردے پڑے ہوئے تھے، اور بخور ساری فضا کو معطر کئے ہوئے تھے حیردن وسط میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مرآندا قربان گاہِ شماس پر راہب کے قدموں کے پاس دونوں زانو ٹیک کر جھک گئی، جس وقت راہب نے کہا وہ تو یہ سننے کے لیئے آمادہ ہے، تو مرآندا نے دفعتاً اپنا سیاہ ریشمی نقاب الٹ کر روشنی کے سامنے ایک ایسا چہرہ راہب کی نگاہوں کے روبرو پیش کیا جس کا مثل اس نے شاید کبھی دیکھا نہ ہوگا۔ مرآندا کا لباس ایسا حسین، اس قدر قیمتی تھا، جیسے کسی دُلہن کا ہو، اسکے سنہرے ہوئے بال سیکڑوں حلقوں کی صورت میں شانہ دوش پر بکھرے ہوئے تھے جن کے

اندر بڑے بڑے الماس چمک رہے تھے، اسکی حسین و قاتل آنکھیں جو اسوقت راہب کو ایک ملتجی انداز سے دیکھ رہی تھیں، سرمہ آلود تھیں، اس کا سینہ جس پر جواہر کار زیور جگمگا رہے تھے، ہانپ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مراندا کا قیامت خیز شباب اسوقت حیرون کو چھو کر پھٹ جانا چاہتا ہے۔ اس نے اپنے گورے گورے ہاتھ جو صیقل کیے ہوئے بلور کے معلوم ہوتے تھے کہنیوں تک برہنہ کر کے راہب کے سامنے توبہ کرنے کے لیئے بڑھادیئے حیرون نے جو اسوقت طوفان حُسن میں اپنے قدموں کو لغزش کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا انتہائے ضبط سے کام لیکر، اپنے منتشر حواس کو یکجا کیا اور نگاہیں نیچی کر کے مرانداکے اعتراف معاصی سننے کے لیئے تیار ہوگیا۔

مراندا نے کہا۔" اے مقدس راہب، میرے تمام گناہوں میں جو گناہ میرے لیئے سب سے زیادہ باعث اذیت ہے، یہ ہے کہ میں ایک شخص سے محبت کرتی ہوں، میں جانتی ہوں کہ محبت کوئی معصیت نہیں، لیکن اے میرے اچھے راہب میری محبت تو یقیناً ایک شدید معصیت ہے کیونکہ اب وہ عقل و احتیاط عفت و عصمت کے اقتدار سے باہر ہے، جس سے میں محبت کرتی ہوں اسکو نہیں پاسکتی جبتک معصیت میں مبتلا نہ ہوں اور نہ وہ مجھ سے مل سکتا ہے جبتک کہ اپنی پاکبازی کو خیر باد نہ کہدے"۔

" راہب نے سوال کیا۔" اس کی شادی ہوچکی ہے؟"

" نہیں"۔

راہب:۔" کیا تیری شادی ہوچکی ہے؟۔"

" نہیں"۔

راہب:۔" کیا اس سے کوئی تعلق خون کا رکھتی ہے؟"

مراندا:۔" نہ اسکی شادی ہوئی ہے نہ میری، نہ وہ میرا عزیز ہے، نہ کسی اور سے منسوب، مگر وہ میری التجاؤں پر رحم نہیں کرتا وہ میری نہیں سنتا۔ اے میرے راہب

کیا تو ایسے شخص کو ظالم نہ کہے گا؟"

راہب: "بیشک"۔

مراندا: "تو پھر اے راہب وہ ظالم تو ہی ہے، جو میرے جذبات کو پامال کر رہا ہے، وہ سفاک تو ہی ہے جو مجھے ہلاک کیئے ڈالتا ہے، وہ بیرحم تو ہی جو میرے دل کو زخمی کرتا جا رہا ہے اور مطلق پروا نہیں کرتا، اے فسوں ساز، اے ساحر میں تیرے لئے تڑپ رہی ہوں، میرے دل کے اندر تیرے لیے شعلے بھڑک رہے ہیں، شماس کا واسطہ مجھے سکون دے میری آگ کو ٹھنڈا کر دو۔ ورنہ میں پھنک جاؤنگی، مرجاؤں گی، میں تیرے قدموں پر پڑی ہوں، اور اسی طرح پڑی رہوں گی جبتک تیرے قوی ہاتھ میرے کانپتے ہوئے ہاتھوں اور تیرے لب میرے لبوں سے نہ مل جائیں"۔

مراندا کی آواز جوش میں بلند ہوتی جاتی تھی، اور راہب ڈر رہا تھا کہ کوئی سُن نہ لے، اس نے جواب دیا۔ "اے خاتون مجھے تو ہمیشہ اپنا سچا دوست اور ہمدرد خیال کر، لیکن خدا کے لیئے مجھ سے کوئی ایسی خواہش نہ کر جس کا پورا کرنا میرے امکان میں نہ ہو، میں تیرے لیئے سب کچھ کر سکتا ہوں، مگر میں تجھے چھو نہیں سکتا، کہ یہ میرا عہد ہے جو میں نے آسمان کے سب سے بڑے دیوتا شماس کے سامنے کیا ہے"۔

یہ سنتے ہی مراندا کی حالت بدل گئی، اسکا چہرہ غصّہ سے تمتما اٹھا، غیرت و غرور کی سرخی آنکھوں میں دوڑ گئی، گردن تن گئی۔ بھویں کھنچ گئیں اور پیشانی پر شکنیں ڈال کر بولی: "اے راہب تو نے یہ جواب دیکر میرے تمام شریفانہ ذرائع کو پامال کر دیا، اور میں اب مجبور ہوں کہ تجھ سے اس کا انتقام لوں، اگر تو اپنے راہبانہ غرور پر میرے جذبات کی قربانی چڑھانے کے لیئے آمادہ ہے، تو سن لے کہ میں بھی تجھے اس بات کے کرنے پر مجبور کروں گی، جس سے تو اسوقت انکار کرتا ہے۔ پھر یا تو اپنی جان دینے کے لیئے آمادہ ہوجا، یا تو اس آگ کو جو تیری آنکھوں نے میرے دل کے اندر بھڑکائی

ہے ٹھنڈا کر۔ ورنہ میں اس لمحہ میں تیری عزت خاک میں ملا دوں گی اور تجھے تباہ و برباد دیکھ کر خوش ہوں گی"۔

راہب ڈر رہا تھا کانپ رہا تھا، اور اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیونکر اپنے تئیں اس حسین آفت سے بچائے۔ آخرکار اس نے اپنا گریہ آلود اور رحم طلب آواز میں پوچھا"۔ اے خاتون تو مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ میں کیا کروں؟"

مراندا بولی۔" وہی جو تیرے حسن جوانی کا اقتضا ہے، معبد کا یہ حصّہ تنہا اور سنسان ہے، یہاں کی معصوم خلوت میں کوئی دخل نہیں دے سکتا، ہم مداخلت کے خوف سے ایسے ہی آزاد ہیں، جیسے کسی ویران جنگل، پہاڑ کے غار میں۔ میں یہ شمعیں بھی گل کردونگی سوائے ایک شمع کے جو ہماری محبتوں کے اس پرمزہ منظر کی تماشائی ہو سکتی ہے لیکن کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتی، آ میری آغوش، میری کانپتی ہوئی پُرشوق آغوش میں آجا اور اپنے زہد و اتقا سے باز آ، جس نے مجھے اتنی طویل مدت تک اس نعمت سے محروم رکھا"

مراندا نے یہ کہا اور شمعیں گل کرکے فوراً راہب کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا، اور اس کا منھ چومنے لگی، راہب گھبرا کر بولا۔" اے بیوقوف عورت شمعیں گل کرنے سے فائدہ، جبکہ خدا اس تاریکی میں بھی عہد شکنی کو دیکھ رہا ہے۔ میں تیرے اس حسن کی قوت کو تسلیم کرتا ہوں، میں تیرے جسم سے چھو جانے کی لذتوں کو محسوس کرتا ہوں، بہرحال میں گوشت اور خون کا بنا ہوا انسان ہوں، لیکن اسوقت تک میرے حواس سلب نہ کرلئے جائیں، اسوقت تک کہ ایک سانس بھی میری حیات کے ثبوت میں پیش کی جاسکے، میں تیری ان خوفناک ترغیبات کے سامنے سرِ عجز نہیں جھکا سکتا۔ مجھے چھوڑ دے اور ہوش میں آ۔ اب بھی وقت ہے جو کچھ تو کررہی ہے۔ اس پر نادم ہو کر اپنی روح کو زیادہ داغدار ہونے سے بچالے"۔

مراندا نے جس وقت راہب کی گفتگو سنی اس کی برہمی کی کوئی انتہا نہ رہی اور

انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں کرسی پر بیٹھ کر راہب کو اپنے اوپر گرا لیا اور دونوں ہاتھوں سے اسی حالت میں اسے مضبوط پکڑ کر بلند آواز سے چیخنے لگی"۔ دوڑو دوڑو مجھے راہب سے بچاؤ۔"

یہ آواز خلوت خانہ سے نکل کر چاروں طرف پھیل گئی اور راہبوں کا سردار بھی کنواریوں اور دوسرے راہبوں کے ہجوم میں اندر داخل ہوا۔ سب نے دیکھا کہ حیردن اور مراندا دونوں گتھے ہوئے ہیں۔ مراندا کے بال پریشان ہیں، لباس بے ترتیب ہے اور زار و قطار رو رہی ہے۔ جس وقت راہبوں کا سردار قریب آیا۔ مراندا اٹھ بیٹھی اور اس کے قدموں پر گر کر بولی:" اے معبد شماس کی مقدس ترین ہستی، مجھے اس ناپاک اور شریر راہب نے تباہ کر ڈالا میری عصمت جس کی قیمت کونین کی دولت ہو سکتی تھی، اس نے زبردستی مجھ سے چھین لی' میں اس پاک و متبرک خلوت گاہ میں خدا کے سامنے اس وحشی راہب کے آگے قدموں پر جھکی ہوئی تھی کہ اس راہب نے بجائے اسکے کہ میرے گناہوں کے بار کو کم کرتا۔ ایک نہایت ہی سخت و شدید گناہ سے میری روح کو اور زیادہ داغدار کر دیا۔ مجھ کو دیکھتے ہی اس کی حالت بدل گئی اُس نے روشنی گل کر دی۔ اس نے مجھے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ اس نے اپنی کرسی پر زبردستی مجھے لٹا دیا۔ اور پھر۔ آہ۔ اے راہب اعظم اس سے زیادہ کہنے پر مجھے مجبور نہ کر۔" مراندا نے یہ سب کچھ اس قدر بے ساختہ انداز سے بیان کیا کہ لوگوں کو بالکل یقین ہو گیا اور راہب نے حیردن سے جو وہیں سر جھکائے کھڑا تھا پوچھا۔

" اے بدبخت راہب تو نے کیا کیا۔"

حیردن یہ سن کر تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر جواب دیا۔" اے راہب اعظم میرے پاس اس الزام کا کوئی جواب سوائے اسکے نہیں ہے کہ خدا اس عورت کی

حالت پر رحم کرے اور اپنے گناہوں سے اس کو شرم آئے"۔

حیرون یہ کہہ کر خاموش ہو رہا۔ اس کے بعد حیرون گرفتار کر لیا گیا اور حاکم معبد کے سامنے پیش کیا گیا اس واقعہ سے تمام معبد شماس میں ہلچل پڑ گئی اور وہ لوگ جو حیرون کی مرتاض زندگی اور مراندا کی طینت سے واقف تھے، چاہتے تھے کہ اصل حقیقت کو حیرون ظاہر کر دے، لیکن حیرون جسے اپنی زندگی کی مطلق پروا نہ تھی، اس پر راضی نہ ہوا، اور آخر کار ایک ہفتہ کے بعد فیصلہ سنا دیا گیا کہ حیرون ایک سال تک مقید رہنے کے بعد بازار میں جلا دیا جائے۔

(۴)

اس واقعہ کو گذرے ہوئے کئی مہینے گزر چکے ہیں اور مراندا اپنے مرض محبت سے صحتیاب ہو کر پھر اپنے مشاغل لطف و تفریح میں بدستور نظر آتی ہے، اسی اثناء میں ناگہاں شہر کے اندر یہ خبر مشہور ہوئی کہ شاہزادۂ اُر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اریدو میں آیا ہے اور کچھ دن یہاں صرف کرے گا۔ اس شاہزادے کے حسن و جمال و شان و شوکت کے افسانے تمام ملک میں مشہور تھے، اور اس لیے جب وہ اریدو پہونچا تو طبقۂ نسواں میں ایک ہلچل مچ گئی، یہانتک کہ ان کی ساری آرائش ملبوس اور نمائش حسن صرف اسی کے لیے ہونے لگی، جب مراندا نے یہ خبر سنی تو اس کے دل میں بھی شوق و ولولہ پیدا ہوا، اور آخر کار ایک شام جب شاہزادہ معبد شماس میں آنے والا تھا، مراندا بھی وہاں پہونچ گئی۔

جس وقت شاہزادہ معبد میں داخل ہوا تو ایک شور مچ گیا اور ہر شخص اسکے دیکھنے کے لئے دوڑ پڑا۔ لیکن مراندا اپنی جگہ پر قائم رہی، کیونکہ اس نے شہزادہ کو دیکھنے کے لیے اور اپنے دکھانے کے لئے ایک مخصوص ساعت سوچ رکھی تھی۔ جس وقت قربان گاہ کے سامنے شہزادہ آیا اور جھک کر عبادت میں مصروف ہوا تو سب سے

پہلے آنکھ کھولتے ہی جس چیز کو اپنے سامنے دیکھا وہ مراندا کی تصویر تھی جو قربان گاہ کی دوسری طرف بالکل محاذ میں اپنی تمام رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی، اس منظر کا صرف ایک ہی ہو سکتا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ شہزادہ اس سے نہ بچ سکا جب مراسم عبودیت ختم ہو گئے اور مراندا اپنے مکان جانے لگی، تو شہزادہ نے اپنا ایک خاص خادم اس کے پیچھے روانہ کیا کہ اس کا مکان دیکھ آئے۔ آخرکار چند دنوں میں ہر شخص کو معلوم ہو گیا کہ شہزادہ' مراندا پر مفتون ہو گیا ہے اور شہر کی نوجوان عورتیں جنھوں نے مراندا کے مقابلہ میں' اپنے اپنے تیر و کمان شہزادہ کو زخمی کرنے کے لیے سنبھالے تھے مایوس و ناامید ہو گئیں۔ شہزادہ کو لوگوں نے سمجھایا، مراندا کے گزشتہ واقعات زندگی سے مطلع کیا۔ لیکن مراندا کا سحر نہ تھا کہ یوں آسانی سے دور ہو جاتا، شہزادہ نے سنا سب کچھ لیکن کیا وہی جس کے لیے دل بے قرار تھا، اور ایک ہفتہ گزرنے سے قبل مراندا کے ساتھ شادی کر لی۔

اب یہ دونوں شہر کی ایک عالیشان عمارت میں فروکش تھے، اور دنیا کی تمام وہ لذتیں جو دولت سے مل سکتی ہیں' مراندا کو حاصل تھیں' خادموں کی ایک جماعت، شاہانہ ملبوس، و اسباب آرائش کا انبار، دعوتیں' ضیافتیں' محافل رقص و سرود' یہ تھیں سب چیزیں جن میں مراندا مصروف نظر آتی تھی اور شہزادہ کی دولت بے دریغ صرف کر رہی تھی۔

اتفاق سے اسی وقت مراندا کا چچا' جس کے پاس مراندا کی چھوٹی بہن رہتی تھی مر گیا۔ اور اپنی ساری دولت دونوں بہنوں کے لئے چھوڑ گیا۔

سلینہ، مراندا کی چھوٹی بہن ابھی کمسن تھی، اس لئے مراندا ہی اکی دولت کی مالک ہوئی اور نہایت بیدردی کے ساتھ اسے لٹانا شروع کیا، سلینہ گو مراندا کے برابر حسین نہ تھی' لیکن بہرحال اس کی چھوٹی بہن تھی اور از حد دلفریب و دلکش،

اسکے علاوہ ترکہ کے لحاظ سے ایک بڑی دولت کی مالک تھی، اس لئے ملک کے بڑے بڑے رؤساء اس سے شادی کرنے کے خواہشمند تھے، لیکن مراندآ کو سلینہ کی شادی منظور نہ تھی، وہ ہر درخواست کو کسی نہ کسی عذر کے ساتھ رد کر دیتی تھی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شادی ہونے کے بعد ساری دولت ہاتھ سے جاتی رہے گی اور جو کچھ وہ صرف کر چکی ہے اس کا بھی مطالبہ کیا جائے گا ایک زمانہ تک مراندآ اس میں کامیاب رہی۔ لیکن اتفاق سے ایک ایسے امیرزادے نے سلینہ کی خواہش کی، جس کے ساتھ اسے بھی محبت تھی اور جب مراندآ نے اس مواصلت کو بھی منظور نہ کیا تو سلینہ جو اپنی بہن کے مظالم سے اب بالکل بیزار تھی منحرف ہوگئی اور اپنے ایک دوسرے عزیز کے پاس جو شہر کا ایک بڑا ذی اثر تاجر تھا چلی گئی۔ یہاں پہونچ کر سلینہ نے اپنے عاشق کے ساتھ ملنا شروع کیا اور یہ عزم کر کے وہ اس سے شادی ضرور کرے گی۔، مراندآ سے اپنی جائداد کا مطالبہ کیا یہ وقت مراندآ کے لئے بہت سخت تھا، کیونکہ وہ اپنی بہن کی دولت کا بڑا حصہ صرف کر چکی تھی، اور یہ ناممکن تھا کہ وہ اسے واپس کر سکے، وہ مختلف تدابیر سوچتی تھی اور کسی پر مطمئن نہ ہوتی تھی، آخر کار اسکی ذہین طبیعت نے ایک تدبیر نکالی اور اپنے ایک خادم خصوصی کو جو علاوہ فہیم ہونے کے خوبصورت بھی تھا، طلب کیا اس کی عمر ۱۷ سال کی تھی، اور جس وقت سلینہ اپنی بہن کے پاس رہتی تھی اس وقت سے یہ اس سے محبت کرتا تھا، ہرچند وہ محبت حد سے آگے نہ بڑھنے دی گئی تھی، تاہم اس کی گرمی برونی کے دل میں موجود تھی اور وہ اب بھی کبھی کبھی سلینہ کے خیال سے بے قرار ہو جاتا تھا۔

مراندآ نے اس نوجوان کو اپنے خلوت کدہ میں جہاں پہونچنے کے لئے ملک کے بڑے بڑے رئیس تمنائیں کرتے تھے اور نہ پہونچ سکتے تھے، بلایا اور اسکے اندر

آتے ہی دروازہ بند کرلیا۔ بروَنی کے لئے زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے تئیں مراندا کی خلوت گاہ میں تنہا پایا ہو۔ وہ متحیرانہ کھڑا دیکھ رہا تھا کہ مراندا نے پوچھا "اے بیروَنی تجھے معلوم ہے کہ مجھ کو تیرے اوپر کس قدر اعتماد ہے؟"

بروَنی:۔ اے محترم خاتون یہ تیرا لطف و کرم ہے اور شاید میں کبھی اس عنایت کو فراموش نہیں کر سکتا۔

مراندا آگے بڑھی اور اپنے گورے گورے ہاتھ اسکے شانہ پر رکھ کر نہایت محبت آمیز لہجہ میں مسکراتی ہوئی بولی "میں تجھ سے ایک کام لینا چاہتی ہوں کیا تو اسے کریگا"۔ بروَنی نے جو مراندا کے حسین جسم سے چھو کر جوش مجسم ہو گیا تھا ایک شرم آلود شوق کے ساتھ جواب دیا۔ "دنیا میں وہ کون سی بات ہے جو میں تیرے حکم کی تعمیل میں نہیں کر سکتا"۔

مراندا یہ سنکر اور آزاد ہوئی، اور بروَنی کے شانہ کے قریب جاکر کئی بار اپنے ہاتھوں سے دبادیا، جوش و ہیجان اسکی آنکھوں سے ٹپکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور بے اختیار مراندا کے قدموں پر گر پڑا۔ اور بولا "اے خاتون مجھے جلد کوئی حکم دے تاکہ میں اسکی تعمیل کردوں"۔ یہ سن کر مراندا مسکرائی اور بولی "اے بروَنی ممکن ہے وہ کام ایسا ہو کہ بجائے محبت کے میری طرف سے تجھے نفرت ہو جائے"۔ بروَنی نے جواب دیا "دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو مجھے تجھ سے متنفر کردے، خدا کے لیے جلد بتا کہ میری بے قراریاں اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتیں"۔

مراندا بولی۔ "اگر تو نے یہ خدمت انجام دی، تو اطمینان رکھ کہ اس کے اعتراف میں میری طرف سے وہ طرزِ عمل دیکھے گا جس کی خواہش اس وقت تیرے دل کو مضطرب کئے ہوئے ہے"۔ یہ سُن کر بیروَنی پھر اسکے قدموں پر گر پڑا،

لیکن مراندا نے فوراً اسکو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بولی ۔ " اچھا جا اور جس طرح ممکن ہو سلینہ کو ہلاک کر ڈال " بروّنی نے یہ سنا اور بغیر اس پر دہ کچھ اظہار حیرت و استعجاب کرتا فوراً تعمیل حکم کے لیئے نہایت مسرت سے آمادہ ہو گیا۔ مراندا چاہتی تھی کہ اسکو کوئی تدبیر بتائے بروّنی نے کچھ نہ سُنا اور دیوانہ وار دروازہ سے باہر نکل کر چلا گیا۔

(۵)

سلینہ شام کو اپنے مکان میں بیٹھی ہوئی تھی ، خادم نے اطلاع دی کہ بروّنی مراندا کا خادم پریشان و مضطرب آیا ہے اور کچھ کہنا چاہتا ہے۔ سلینہ نے اندر بلا لیا ۔ بروّنی روتا ہوا آیا اور زمین پر گر کر بولا " مجھے مراندا نے نکال دیا ہے اور چونکہ میں نے اسی خاندان میں پرورش پائی ہے، میرا جی یہ نہیں چاہتا کہ کہیں اور چلا جاؤں، اس لیئے تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو ہی اپنے پاس رہنے کی اجازت دے"۔ سلینہ جو بروّنی کو اچھی طرح جانتی تھی ، اور کبھی اسکی محبت آمیز نگاہوں کو دیکھ کر خوش ہوا کرتی تھی، فوراً راضی ہو گئی اور اسے اجازت دیدی کہ وہ نہایت اطمینان و مسرت سے یہاں زندگی بسر کرے، بروّنی رہنے لگا ، اور شب و روز اسی فکر میں مستغرق کہ اسے موقع ملے اور وہ سلینہ کے جام شراب میں زہر ملا دے ، جسے وہ ہر وقت اسی غرض سے اپنے پاس رکھتا تھا، ۔

آخر کار ایک صبح سلینہ نے اس سے جام شراب طلب کیا اور بروّنی نے زہر ملا کر پیش کر ہی دیا ، جس کو سلینہ اٹھا کر فوراً پی گئی ۔ ایک گھنٹہ کے بعد سلینہ کی طبیعت بگڑی ، جسم میں آماس آنا شروع ہوا ۔ آنکھیں اُبل پڑیں اور سخت کرب و اضطراب میں مبتلا ہو گئی ، معالجین طلب کیئے گئے ۔ اور سلینہ کا مسموم ہونا سب پر ظاہر ہو گیا ، بروّنی گرفتار کر لیا گیا ، کیونکہ اس دن صبح کو سوائے اس کے

اور کسی نے کوئی چیز سلینہ کو نہیں دی تھی، سارے شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ بردنی نے مراندا کی سازش سے سلینہ کو زہر دیا ہے اور سلینہ قریب بمرگ ہے اس واقعہ سے ہر طبقہ میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی، اور قریب قریب ہر شخص اس سے دلچسپی لے رہا کیونکہ اب کوئی شخص ایسا نہ تھا جو مراندا کی حالت سے واقف نہ ہو اور اس کے عادات اطوار سے بیزار نہ ہوگیا ہو۔

دوسرے دن حاکم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا اور بردنی نے جس کو انکار کر دینے کا کوئی موقع حاصل نہ تھا، اعتراف جرم کرتے ہوئے ظاہر کیا کہ مجھے مراندا کے مواعید نے بالکل مست و بیخود کر دیا تھا، اور میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ کس قدر نادرست و نازیبا ہے، بردنی کے اس بیان پر مراندا بھی گرفتار کی گئی اور اسی مجلس میں جہاں بردنی قید کیا گیا تھا رکھی گئی۔ دوسرے دن جب حاکم فیصلہ سنانے والا تھا۔ سارا شہر امڈا چلا آرہا تھا۔ اور ہر شخص مراندا کے خلاف حکم سننے کے لیئے بیتاب نظر آرہا تھا، شاہزادہ اُرؔ، مراندا کا شوہر بھی عدالت گاہ میں آیا اور اپنی محبوب بیوی کو اس حال میں دیکھ کر سخت متاثر ہوا، لوگوں کو یقین تھا کہ اب شاہزادہ کو مراندا سے نفرت ہو جائے گی اور طلاق دے دے گا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہاں اس واقعہ سے محبت بجائے گھٹنے کے اور بڑھ بڑھ گئی جس کا سبب محبت کے بے اصول دنیا میں کوئی قائم نہیں کیا جا سکتا۔ آخر کار مقدمہ پیش ہوا اور مراندا کے سامنے بردنی نے ان تمام واقعات کو دہرایا جو خلوت گاہ مراندا کی یادگار تھے، مراندا نے سنا اور اقرار کیا حاکم نے اس اقرار کو لکھا اور فیصلہ سنایا۔

"کل صبح بردنی کو مجمع عام میں سُولی دی جائے اور مراندا ۲ گھنٹے سُولی کے نیچے کھڑی رہے اس حال میں اس کی گردن میں

ایک رسّی ہو، جس کا دوسرا کنارہ سُولی سے بندھا ہو اور اس کے سینہ و پشت پر اس ذلّت کے اسباب نہایت روشن حروف میں لکھ کر مشتہر کئے جائیں“۔

بعض کا خیال تھا کہ مرانداؔ کے ساتھ رعایت کی گئی اور حاکم اس کے حُسن سے مرعوب ہو گیا۔ تاہم یہ مسرت بھی کچھ کم نہ تھی کہ مراندا کی ذلت اچھی طرح ہو جائیگی اور اس) کے غرورِ حُسن کو جس نے اس کے دماغ کو اس درجہ خراب کر دیا تھا، کافی صدمہ پہونچ رہے گا۔

دوسرے دن نفاذ حکم ہونے والا تھا، اور صبح ہی سے قصاص گاہ پر اس قدر لوگوں کا ہجوم تھا کہ کہیں تل رکھنے کو جگہ باقی نہ تھی، سارے میدان میں چاروں طرف کے مکانات اور ان کی چھتوں پر آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے اور لمحہ کے لیے بے قرار جب مرانداؔ اور اسکے فریب میں مبتلا ہونے والا بیرونی میدان لائے جانے والے تھے۔

کسی نہ کسی طرح انتظار کی یہ سخت گھڑی ختم ہوئی۔ اور مرانداؔ ہجوم کے اندر سے نمایاں ہوئی۔ وہ اسوقت بھی نہایت مکلف زرکار ملبوس سے آراستہ تھی، سیاہ ریشمی چادر جس پر جا بجا الماس ٹنکے ہوئے تھے۔ اس کے بدن سے لپٹی ہوئی تھی اور موتیوں کے ہار گلے میں تھے، بالوں میں سپید پھول گندھے ہوئے تھے اس کے آگے آگے ایک خادم مخمل سے منڈھی ہوئی چوکی لا رہا تھا، اور ساتھ ساتھ اس کا شوہر مرانداؔ کو سنبھالے ہوئے تھا، پیچھے بہت سے خادموں کی قطار تھی، جو مرانداؔ کی ضروریات کے متعلق بہت سی چیزیں اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے نہایت ادب سے آہستہ آہستہ آرہے تھے، مراندا کا چہرہ اسوقت تبسم آشنا نہ تھا لیکن مضمحل افسردہ بھی نظر نہ آتا تھا وہ آہستہ آہستہ بڑھی اور مخملی

چوکی پر قصاص گاہ میں کھڑی ہو گئی۔ دو کنیزوں نے اس کے دامن کو جو زمین پر لٹک رہا تھا اٹھا لیا اور تمام خدام پیچھے ادب سے کھڑے ہو گئے جس وقت مراندا آدمیوں کے ہجوم سے برآمد ہوئی، لوگوں میں ایک شور نفرت و استکراہ بلند ہوا لیکن جب اسے متانت و غرور کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو سب پر حیرت طاری ہو گئی اور ہر شخص اپنی جگہ ساکت و دم بخود ہو کر رہ گیا۔

اب وہ وقت آیا کہ حکم کا نفاذ ہوتا۔ مراندا کے گلے میں ایک رسّی باندھی گئی اور اس کا دوسرا کنارہ سُولی سے باندھ کر سینہ و لپشت پر ایک تحریر آویزاں کی گئی، جس میں اسکے جرم و ذلّت کا اعلان تھا، مراندا کو اسی حال میں کھڑے ہوئے دس منٹ گذرے ہوں گے کہ بردونی لایا گیا۔ اس کا رنگ زرد تھا اور چہرہ سخت افسردہ اس کا ملبوس سیاہ تھا، سر برہنہ تھا اور بال اُلجھے ہوئے اور پریشان تھے، جب وہ سُولی کے پاس آیا تو اس نے مراندا کو دیکھا اور دیکھتے ہی قدموں پر گر پڑا اور بولا:۔

"اے مراندا میں سخت نادم ہوں کہ میں نے تجھے اس قدر بدنام کیا میں جانتا ہوں کہ یہ میری خطا ہرگز معافی کے قابل نہیں، لیکن اگر تو نے اسکو کھلا دینے کا وعدہ نہ کیا، تو میری جان نہایت دشواری سے نکلے گی۔ میں اپنی کمزوریوں کو محسوس کرتا تھا کہ میں نے صرف اپنی جان بچانے کے لیئے تجھے رسوا کیا، جو دنیائے محبت کا شدید ترین جرم ہے۔ لیکن اب جبکہ سارے تعلقات دنیا والوں سے قطع ہو رہے ہیں۔ اگر تو معاف کر دے گی تو میں یقیناً کچھ آسانی سے دم توڑ سکوں گا جس میں تیرا کوئی نقصان نہیں ہے۔ کیا میں پھر التجا کروں اور تجھ سے طلب عفو؟"۔

مراندا نے حد درجہ غرور و استغنا سے بردونی کی اس التجا کو سنا اور بولی۔

"میں معاف کرتی ہوں۔ اگر تیرے لیئے اس میں کچھ تسلّی ہے"۔

یہ سُن کر بردونی خوش خوش اٹھا اور سُولی کے زینے پر چڑھ گیا۔

مراندا چاہتی تھی کہ وہ اس منظر کو نہ دیکھے۔ لیکن حاکم نے اسے مجبور کیا کہ وہ اوپر کی طرف نگاہ اٹھائے اور اس شخص کو دیکھے جسے اس نے اس حال میں مبتلا کیا ہے۔

مراندا نے گردن اُٹھا کر اوپر دیکھا ہی تھا کہ برونی سُولی پر چڑھا دیا گیا اور سارے مجمع میں ایک شور بلند ہو گیا۔ برونی تڑپ رہا تھا، ہاتھ پاؤں اینٹھ رہے تھے اور مراندا متحیرانہ کھڑی دیکھ رہی تھی۔ جب دو گھنٹے کے بعد برونی کا جسم سرد ہوا تو مراندا کو وہاں سے جانے کی اجازت دی گئی۔ لیکن جب مراندا قصاص گاہ سے لوٹی ہے تو اس کے غرور کا وہی عالم تھا، اور اس کے عدم تاثر کی وہی کیفیت۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی تفریح گاہ سے، کسی باغ سے تفریح کے بعد خراماں خراماں چلی آرہی ہے، اور اس کا چہرہ فرطِ انبساط سے جگمگا رہا ہے۔

(۶)

چند دن گذر گئے۔ اور اس لئے اگر کوئی تاثر مراندا کے قلب میں تھا بھی تو وہ بالکل زائل ہو چکا تھا۔ مراندا کی بہن اب صحتیاب ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے اپنی جائداد کا مطالبہ نہایت شدت سے شروع کیا۔ اس کے ہونے والے شوہر نے عدالت سے چارہ جوئی کی اور وہاں سے ایک افسر مطالبہ وصول کرنے کے لئے مراندا اور اس کے شوہر کے پاس بھیجا گیا۔ چونکہ مراندا اپنی خیانت و تصرف ناجائز کی تلافی کسی طرح نہ کر سکتی تھی۔ اس لیئے حاکم نے دو افسر اور مراندا کے مکان پر متعین کر دئے تاکہ وہ نگرانی رکھیں اور کوئی اسباب مکان سے باہر نہ جانے دیں۔ مراندا کے لئے یہ صدمہ حقیقتاً ناقابل برداشت تھا، اور اسوقت وہ اپنے عزم و استقلال، اپنے غرور و استغنا کو بہت کمزور محسوس کرتی تھی، اس کو یقین تھا کہ اگر روپیہ نہ ادا کیا گیا تو اسکا شوہر قید ہو جائے گا اور وہ خود بالکل تباہ و برباد۔ اسے اپنے شوہر کے ساتھ کوئی

ہمدردی نہ تھی، بلکہ وہ اپنے اوپر آنے والی مصیبت سے کانپ رہی تھی وہ مضمحل اور افسردہ ہو کر پڑگئی، غذا ترک کر دی اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ حقیقی معنی میں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے، اسکے سینے میں اک آگ بغض و فساد کی اپنی بہن کی طرف سے مشتعل ہو رہی تھی اور چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح سلینہ کا وجود دنیا سے معدوم کر دیا جائے، اس کا شوہر جس کو مراندا کے ساتھ عشق تھا اور ایک لمحہ کے لئے بھی اسے پریشان نہ دیکھ سکتا تھا بیتاب ہو گیا، اور بولا۔

"اے مراندا، اب میں کیا کروں۔ اگر تیری سمجھ میں کوئی تدبیر اس بلا سے نجات حاصل کرنے کی آتی ہے تو بتا۔ میں اس پر عمل کرنے کے تیار ہوں"

مراندا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور شوہر کی تمام الحاح وزاری اسے کوئی تسکین نہ دے سکی۔

ایک ہفتہ اسی حال میں گذر گیا، یہانتک کہ مراندا کا شوہر سخت بے تاب ہو گیا اور پھر ایک بار اس کی تسکین و تسلی کے لیے گیا۔ مراندا اس کو دیکھ کر اور زار و قطار رونے لگی اور بولی۔

میں کیونکر زندہ رہ سکتی ہوں۔ جب کہ سلینہ زندہ ہے"۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنی باہیں شہزادے کے گلے میں ڈال دیں اور ہچکیاں لینے لگی۔ مراندا کی یہ حالت اُس سے نہ دیکھی گئی۔ اور بے اختیار ہو کر بول اٹھا۔ مراندا میں تیار ہوں کہ سلینہ کو ہلاک کر ڈالوں اور تیری مسرتوں کی راہ سے اسے خس و خاشاک کی طرح کاٹ کر پھینک دوں میں اس کے لیے ایک مردانہ عزم کرتا ہوں۔ لیکن خدا کے لئے تو اپنی حالت سنبھال۔ ورنہ میں کچھ نہ کر سکوں گا، اور ہلاک ہو جاؤں گا"

مراندا اس حد تک اپنے شوہر کو آمادہ کر کے کچھ مطمئن ہوئی، اور مشورہ کے بعد یہ قرار پایا کہ بروتی کے اعزہ و احباب کی طرف سے گمنام خطوط سلینہ کے پاس

بھیجے جائیں تاکہ سلینہ کی ہلاکت اس جانب منسوب کی جائے اور مرانڈا پر کسی کو شک نہ ہو چنانچہ یہ خطوط بھیجے گئے اور تمام شہر کو معلوم ہو گیا کہ بردنی کے احباب واعزہ سلینہ کے دشمن ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد شہزادہ نے قصد کیا کہ وہ خود سلینہ کو ہلاک کرے اور کسی خادم کو ذریعہ نہ بنائے چنانچہ وہ تلوار و خنجر سے آراستہ ہو کر نکلا سلینہ پر ان کا استعمال کرے۔ کئی راتیں اسی فکر میں گذر گئیں لیکن وہ کامیاب نہ ہوا بالآخر کار ایک شب سلینہ جبکہ معبد شماس سے واپس آ رہی تھی، اور شاہزادہ بھی سیاہ لباس میں لپٹا ہوا موقع کا منتظر تھا، وہ وقت آ ہی گیا، جس کے انتظار میں مرانڈا بے قرار تھی۔ اس نے پشت کی طرف آ کر سلینہ کے شانہ پر خنجر کا وار کیا۔ اور سلینہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

شاہزادہ بھاگا۔ لیکن اسی وقت معبد شماس سے بہت سے لوگ واپس آ رہے تھے سب کے سب دوڑ پڑے اور اس کا تعاقب کیا۔ مرانڈا کے شوہر کے لئے یہ وقت نہایت سخت تھا۔ کیونکہ متعاقبین کی جماعت بڑھتی جاتی تھی، اور راہ فرار اسے کوئی نظر نہ آتی تھی، مجبور ہو کر ٹھہر گیا اور دونوں ہاتھوں میں تلوار لیکر اپنی جان بچانے میں مصروف ہو گیا، لیکن جب اس کے ہاتھ شل ہو گئے اور تھک کر گر پڑا تو لوگوں نے گرفتار کر لیا اور یہ معلوم کر کے کہ سلینہ کا قاتل مرانڈا کا شوہر ہے تو لوگوں کو سخت حیرت ہوئی۔

دوسرے دن عدالت میں شہزادہ پیش کیا گیا اور اس نے نہایت جراءت و دلیری سے اعتراف جرم کیا۔ اس کا مکان اور سارا اسباب ضبط کر لیا گیا، اور مرانڈا بھی شام تک اس مجلس میں آ گئی۔ جہاں اس کا شوہر مقید تھا، مرانڈا کی حالت اب یہ تھی کہ کبھی وہ رونے لگتی اور کبھی اپنے اوپر ملامت کرتی، لیکن اس کا شوہر صرف اس خیال سے مطمئن تھا کہ اسکی محبوبہ اسکے پاس ہے۔ چونکہ شاہزادہ نہایت

شریفانہ خصائل کا شخص تھا۔ اس لیے تمام لوگوں کو اسکے ساتھ ہمدردی تھی مگر یہ ہمدردی اس کی قسمت کا فیصلہ نہ ٹال سکتی تھی۔ جو نہایت سخت اور دلدوز تھا۔

فیصلہ کا دن آیا اور عدالت نے حکم سنایا۔

"شہزادہ کا سر بازار میں قطع کیا جائے اور مرانڈا خارج البلد۔"

(۷)

دوسرے دن لوگوں کے ہجوم میں شہزادہ قصاص گاہ پر لایا گیا، اس حال میں کہ مرانڈا ابھی اسکے ساتھ تھی مگر فرق یہ تھا کہ وہ افسردہ و مضمحل تھی اور یہ مسرور و مطمئن۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجی۔ جس سے مقصود تھا کہ مجرم کو اب اپنے احباب وغیرہ سے رخصت ہو لینا چاہیئے۔ یوں تو شہزادہ کے ساتھ اریدو کا ہر شخص ہمدردی رکھتا تھا لیکن اسکی نگاہ میں صرف ایک ہی ہستی ایسی تھی جس سے اسے رخصت ہونا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور مرانڈا کے قدموں پر گر پڑا۔ شاہزادہ اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور مرانڈا اپنی جگہ مجسمہ کی طرح قائم تھی، تھوڑی دیر تک گفتگو نہ ہو سکی، لیکن اس کے بعد دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ساری جماعت پر ایک گہرا اثر طاری ہو گیا جب شاہزادہ کا جوش کچھ کم ہوا۔ اور ہچکیاں رکیں تو وہ اٹھا، تاکہ مرانڈا سے اپنے سر کو جلاّد کے سامنے پیش کرنے کی اجازت طلب کرے۔ شہزادہ نے کہا:۔

" اے پیاری مرانڈا، افسوس ہے کہ میری زندگی تیری خدمت کے لیئے بہت مختصر ثابت ہوئی۔ اور اپنے حوصلہ کے مطابق پرستش نہ کر سکا پھر جس وقت یہ خیال کرتا ہوں کہ تجھے میری وجہ سے تکلیفیں بھی پہونچیں، تو میں اپنی قطع حیات سے خوش ہونے لگتا ہوں کہ شاید یہ اسی کی سزا ہے۔ بہر حال میں اب تجھ سے جدا ہوتا ہوں کیونکہ یہ جدا ہونا ناگزیر ہے۔ کاش مجھے معلوم ہو جائے کہ تو اس جدائی کو آسانی سے برداشت کرلے گی تاکہ میں اپنی اس روح و تن کی جدائی کو آسانی سے برداشت کرسکوں"۔

یہ کہا اور پھر قدموں پر گر پڑا، اٹھا اور پھر رونے لگا۔ اس کے سینہ میں اس وقت عجیب وغریب قسم کے جذبات کا ہجوم تھا، اور اسے کسی طریق اظہار سے تسکین نہ ہوتی تھی، وہ اس حال میں تھا کہ دوسری گھنٹی بجی، جس کے سنتے ہی مرآندا بے ہوش ہو کر گر پڑی اور شہزادہ پکڑ کر قصاص گاہ پر لایا گیا۔ قصاص گاہ بازار کا ایک میدان تھا جہاں ایک جگہ نشیب میں پتھر کی ایک بڑی سل رکھی ہوئی تھی اور اس پر لکڑی کا ایک تختہ نصب تھا۔ شاہزادہ خراماں خراماں آیا اور تختہ کے پاس پہونچ کر اپنے کرتے کی آستین الٹی، گلے سے رومال کھول کر ہاتھ میں لیا، اور جلاّد کو جو قریب ہی ایک برہنہ تلوار لئے کھڑا تھا۔ بیس اشرفیاں دیکر بولا:۔

"اسے قبول کر اور جس وقت میں رومال کو تیسری بار جنبش دوں اپنی خدمت تکمیل کے ساتھ انجام دے۔"

یہ کہا اور اپنا سر تختہ پر رکھدیا، شہزادہ نے سر رکھتے ہی اپنے رومال کو پہلی بار جنبش دی اور جلاّد مستعد کھڑا ہو گیا۔ جب شاہزادہ نے دوسرا اشارہ کیا تو اس نے اپنی تلوار سونت لی۔ اور اس کے بعد ہی تیسرے اشارہ پر ہوا میں شہزادے کے سر پر ایک چمک سی پیدا ہوئی اور تلوار اس کی گردن میں پیوست ہو گئی، ہجوم میں ایک شور پیدا ہوا۔ دیکھنے والوں کے چہرے متغیر ہو گئے۔ اور دلوں پر حسرت و تاسف کا ایک گہرا سکوت مستولی ہو گیا، مرآندا بے ہوش تھی۔ اور تیاری کی جارہی تھی کہ اسے یہاں سے اٹھالے جائیں۔ لیکن ابھی ایک رسم اور باقی تھی یہ قاعدہ تھا کہ قصاص کے بعد جلاّد مقتول کے سر کو ایک نیزہ پر بلند کر کے سب کو دکھاتا تھا، اس غرض سے جلاّد شہزادہ کی پھڑکتی ہوئی نعش کے پاس پہونچا تو اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ سر جسم سے علٰحدہ نہیں ہوا۔ اور شہزادہ ہنوز زندہ ہے۔ یہ دیکھ کر جلاّد تلوار کی دوسری ضرب سے سر جدا کرنا

چاہتا تھا کہ مجمع میں ایک شور بلند ہوا اور اسکی سخت مخالفت کی گئی۔ یہ بھی قانون تھا کہ اگر ایک ضرب میں مجرم ہلاک نہ ہو تو دوسری ضرب نہیں پہونچائی جاتی تھی، خواہ وہ جانبر ہی کیوں نہ ہو جائے چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے اور شہزادے کے جسم کو اٹھا کر لے گئے، شہر کے بہترین معالجین جمع کئے گئے اور انھوں نے دیکھ کر جانبر ہونے کی امید دلائی۔ کیونکہ تلوار بجائے گردن کے شانے کی ہڈی میں تیر گئی تھی اس لئے نہ گردن کو جدا کر سکی تھی اور نہ شہ رگ کو کوئی صدمہ پہونچا تھا۔ اس واقعہ کے بعد بھی لوگوں نے اس بات پر زور دیا کہ مراندآ کی جلاوطنی شہزادہ کی صحت تک ملتوی رکھی جائے لیکن وہ عام برہمی جو مراندآ کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں تھی اسکی مخالفت ہوئی، اور اسی وقت مراندآ جلاوطن کردی گئی۔

ادھر شہزادہ کا علاج جاری تھا، اور اسکی حالت بہتر ہوتی جاتی تھی، لیکن خون کے ضائع ہوجانے سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ جلد گفتگو یا حرکت کرنے کے قابل ہوگا وہ ایک عرصہ تک مسلسل بستر علالت پر پڑا رہا۔ لیکن جب دو مہینے کے بعد اس نے اپنی آنکھ کھولی تو سب سے پہلے جو بات اس نے کی یہ تھی کہ:۔

"مراندآ کہاں اور کیسی ہے"۔

(۸)

ایک سال گزر گیا۔ اریدو نے مراندآ کے افسانوں اور اسکے حسن کی خونی داستانوں کو بھلا دیا۔ لیکن شہزادہ آر جو اب شہزادہ نہیں ہے، بلکہ ایک معمولی حیثیت کا انسان ہے اور مراندا جواب سفاک و بیرحم مراندآ نہیں ہے، بلکہ حقیقی معنی میں تائب و مرتاض عورت ہے۔ اریدو کے ایک سنسان گاؤں میں فقیرانہ زندگی بسر کر رہے ہیں اب ان کی تنہا دولت و مسرت صرف ایک بچی ہے جو کبھی ماں کے آغوش میں آکر باپ کو اور کبھی باپ کی آغوش میں آکر ماں کو اپنی معصوم نگاہوں سے دیکھا کرتی ہے۔

# مُحَبّت کی دیوی

زمین خدا جانے کتنی بار آفتاب کے گرد تصدق ہو چکی، معلوم نہیں چاند کتنی مرتبہ کرۂ ارض کی اوٹ سے اپنی پیشانی کا ہلال دکھا دکھا کر غائب ہوا اور زمین کے بخارات نہ معلوم کتنی دفعہ فضائے آسمانی میں ابر بن بن کر قطرہ زن ہوئے، لیکن رادھا نے جو عزلت نشینی اختیار کرلی، وہ اسی طرح قائم رہی اور دیپل کے مندر میں پوجا کرنے کے لیئے وہ پھر کبھی نہ آئی۔

صبح و شام، مندروں کے گھنٹے اب بھی ہوا میں گونجا کرتے ہیں، دیپل کی آبادی اب بھی بدستور اپنی خلوص پیشانیوں کو مندر کے مقدس آستانہ کے سامنے گھستی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن رادھا پھر اپنے مکان سے نہیں نکلی اور مندر میں آنے والا ہر نوجوان یہ محسوس کرنے لگا کہ شاید اب رادھا کبھی نظر نہ آئے گی"۔

نغمہ ہائے پرستش معبد کے در و دیوار سے اب بھی ٹکراتے رہتے ہیں، چنگ و رباب کے تاروں کی فضائیں اب بھی کانپتے رہتے ہیں۔ لیکن اک رادھا کے نہ آنے سے جو اُداسی وہاں کی فضا میں پیدا ہوگئی ہے۔ گو اس کا علم مندر کے پوجاریوں کو نہ ہوا لیکن دیپل کا ایک ایک نوجوان اسکا زخم اپنے دل میں لیئے ہوئے ہے۔

(۲)

آفتاب غروب ہو رہا ہے اور قریب کی پہاڑی جو بارش کے اثر سے زمردین ہو چکی ہے ان گلہ بانوں کی بانسریوں سے جو اپنا وداعی راگ قدرت کے اس

شاداب چراگاہ کو سنا رہے ہیں، مسحور ہے۔

رادھا اپنی جھونپڑی کے سامنے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی اس منظر کو دیکھ رہی ہے اور اس طرح متحیر ہے، گویا وہ ایک بُت ہے، جسے یونان کے عہد زریں میں یہاں نصب کیا گیا تھا اور اب اسکی پرستش کرنے والے دنیا سے اٹھ گئے ہیں، اسکی صورت سے عشق کا ایسا سوگ ٹپک رہا ہے، محبت کا وہ سوز ظاہر ہو رہا ہے گویا کہ وہ اندر ہی اندر ستی ہوئی جا رہی ہے اور دنیا میں اس رسم کا دیکھنے والا اور نوجوان غمزدہ لڑکی پر آنسو بہانے والا کوئی نہیں۔

رادھا، دیبل کی ان چند لڑکیوں میں سے تھی، جن کے حُسن کی داستانوں سے دہاں کی رنگین محفل خالی نظر نہ آتی تھی، لیکن رادھا اس لئے زیادہ تباہ کن تھی کہ ایسے حُسن کے ساتھ کوئی آرزو وابستہ نہ ہو سکتی تھی اور وہ اپنی سیرت کے لحاظ سے اس قدر بلند تھی کہ ایک انسان کا اس سے محبت کرنا، گویا ملاء اعلیٰ کی کسی مخلوق سے محبت کرنا تھا، اس لیئے جبتک وہ ایک مندر میں آتی رہی، ایک دیوی کی ہی طرح اسکی عزّت کی گئی اور جب اس نے آنا ترک کر دیا تو کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اسکے مکان تک جائے کیونکہ ایک دیوی کے خلوت خانہ میں کسی انسانی ہستی کا گذر نہیں ہو سکتا۔

(۲)

اے پرماتما، میں کیا کروں؟ میں اس شرم کا اظہار کیونکر کروں، جو تیرا نام لیتے ہی میرے سارے جسم کو ایسا بنا دیتی ہے جیسے بید کی نازک شاخ جو ہوا کا ہلکا سا جھونکا گذر جانے کے بعد گھنٹوں تھرتھرایا کرتی ہے لوگ کہتے ہیں رادھا نے تیری پوجا چھوڑ دی لیکن انھیں کیسے یقین دلاؤں کہ رادھا اب تیرا نام لینے اور تیرے سامنے سر جھکانے کے قابل نہیں رہی۔

اپنے دل میں جس آرزو کی پرورش کر رہی ہوں، اسکا تعلق اسی جسم سے ہے جسے میں نے تیرے لئے تج دیا تھا، مگر وہ آرزو تجھ سے علٰحدہ ہے۔ پھر جس نے تیری پرستش اس طرح کی ہو کہ جسم کے ساتھ اسکی روح بھی تیرے روبرو جھک جائے وہ کیونکر تیرا نام لے سکتی ہے جبکہ دل میں تیرے سوا کسی اور کی صورت موجود ہو، اور روح تیرے علاوہ کسی اور صورت کے لئے بیتاب۔

میں جانتی ہوں کہ تو میری پرستش کا محتاج نہیں، تجھ پر قربان ہونے کے لئے مجھ سے زیادہ اچھی روحیں موجود ہیں۔ لیکن میں اپنے دل کے اس درد کو کہاں لے جاؤں، جو تیری جدائی سے پیدا ہو گیا ہے، اے پرماتما، یہ کس قسم کا عذاب ہے کہ میں نہ تجھ سے جدا ہو سکتی ہوں، اور نہ مل سکتی ہوں۔ یہ کس آگ میں تو نے مجھے ڈال دیا ہے جو نہ جلاتی ہے نہ ٹھنڈا کرتی ہے۔

وہ دن جب تیرے استھان پر تیرے پوجاریوں کی قربانی ہو رہی تھی۔ اور میں بھی اس خیال سے اس شخص کی طرح جس نے کوئی تیز شراب پی لی ہو، مست و مخمور تھی کہ عنقریب کسی ظالم کی تلوار میرے سینے میں تیر جائیگی اور میں اپنی حیات کا آخری قطرہ رنگین تیرے حضور میں پیش کر سکوں گی، آہ وہ وقت میں کبھی نہیں بھول سکتی، جب اسی حال میں ان ظالموں کے سردار نے دفعتاً آکر اس خونریزی کو روک دیا، اور اسکو دیکھتے ہی میرا وہ سجدہ جو تیرے لئے مخصوص تھا چپکے ہی چپکے اسکی حسین ظالم صورت کی طرف منتقل ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ تو نے اپنے آسمان سے اٹھا کر مجھے نیچے پھینک دیا، اپنے تخت الوہیت سے گرا کر زمین کے نہایت گہرے عمیق میں گرا دیا۔ لیکن روح پھر بھی اسی کے لئے سر بسجود تھی اور تجھے بھول جانے اور تجھ سے جدا ہو جانے پر زیادہ مغموم نہ تھی۔ لیکن اے پرماتما تیرا احسان کیونکر بھلا سکتی ہوں کہ اس پر بھی تو نے مجھے بچایا اور میرے

لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ اس کے سامنے ایک بار بے حجابانہ چلی جاتی اور محبت کی وہ تمام لذتیں حاصل کر لیتی، جن کے لئے میں اب بھی ویسی ہی بیقرار ہوں جیسی کبھی تیرے قدموں میں ہوا کرتی تھی، پھر جبکہ تو نے میری ناپاک ہستی پہ اتنا کرم کیا اس کو اور زیادہ وسیع نہیں کر سکتا، کیا تیری انگلیاں میرے دل سے اس محبت کو نکال کر پھینک نہیں دے سکتیں، جس نے تیری پرستش کو چھین لیا ہے۔ میں راضی ہوں اگر اس محبت کا نکلنا جان کا نکلنا ہو، اور اس خلش کا دور ہونا جسم سے روح کا جدا ہو جانا۔

مہینوں ہو گئے کہ صبح و شام مندر کے گھنٹوں کی آواز سن کر کانپ کانپ اٹھتی ہوں۔ اک زمانہ ہو گیا کہ روز تیرے استھان پر جا کر جان دینے کے لئے تڑپ تڑپ گئی ہوں، لیکن ڈرتی ہوں کہ کہیں میرے ناپاک قدم تیرے مقدس معبد کو خراب نہ کر دیں کہیں تو اس گستاخی سے برہم ہو کر میرے دل کے اندر وہ جذبہ پیدا نہ کر دے، جو ایک عورت کے دل سے پاکدامنی کی عزت کو نہ کر دیتا ہے، اے پرمیشور، رحم کر اور محبت کے اس طوفان کو، جس کی لہروں پر میں نے اپنی نازک اور ٹوٹی ہوئی کشتی اس قدر بے رحمی سے ڈال دی ہے دور کر دے، تیرے غصہ کی آگ میں جل جانا مجھے منظور ہے، لیکن اس طوفان کی موجوں میں اپنی لاش دفن کرنا مجھے گوارا نہیں، کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا، جب میں اس کافر کی صورت و سیرت میں ہزاروں عیب نہ نکالتی ہوں، میں دل کو ہر طرح سے یقین دلاتی ہوں کہ اس کی آنکھیں خونخوار ہیں، اس کی فطرت جفا کار ہے اس کی چتون غضب آلود ہے اور اس کی ساری ہستی ناپاک و مردود، لیکن عین اسی وقت جب کہ میں یہ سب کچھ سمجھنا چاہتی ہوں دل تڑپ کر خون کی ایک گرم موج میری شرائین میں دوڑا دیتا ہے، اور میں اس

شراب کے نشہ سے مغلوب ہوکر پھر اسی کو پوجنے لگتی ہوں جس کو ذلیل سمجھنا چاہئے۔
پھر تو ہی بتا کہ اس جنگ میں کب تک مصروف رہوں اور کیونکر اپنی شکست کی لذت کو محو کر دوں۔"

رادھا پر اس حال میں چند مہینے گذر جاتے ہیں اور اس کی محبت کی حرارت برابر بڑھتی جا رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ محبت، جو چنگاری کی صورت میں اس کے دل کے اندر متمکن ہوئی تھی، رادھا کی ہر سانس اس کے لئے ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی یہاں تک کہ چند ماہ کے اندر وہ چنگاری بھڑک اٹھی اور اب صرف یہی رہ گیا تھا کہ وہ کسی دن اپنے جھونپڑے کے اندر خاکستر کا ڈھیر نظر آئے۔

اس کی غریب بیوہ ماں نے علاج و چارہ سازی میں پوری کوشش صرف کر دی جس حد تک اسکا افلاس اجازت دے سکتا تھا، اس نے کوئی دقیقہ اس کوشش میں نہ اٹھا رکھا دیپک کا یہ چاند گہن سے نکل جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوئی اور رادھا روز بروز نڈھال ہوتی گئی گویا وہ صبح کا چراغ تھی جس کی روشنی صرف شمعدان ہی کے پاس کچھ کچھ نظر آتی ہے۔

اس کا جسم جو پہلے بھی بہت نازک تھا، اب خطرناک حد تک نازک ہوگیا تھا اور اس آبگینہ نے اب ایک نہایت ہی نازک حباب کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اس کا وہ رنگ جو کبھی کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ جلد کے نیچے پگھلا ہوا سونا دوڑ رہا ہے رفتہ رفتہ زعفرانی، زرد، اور سفید ہو کر اب ایسا نظر آتا تھا، گویا رادھا کوئی چاند کی مورت ہے جس پر پارہ کی صیقل کر دی گئی ہے، اس کی لانبی پلکیں جو حسین آنکھوں پر چارشف کے سیاہ ریشمی نقاب کی طرح

رہتی تھیں، اس کی خوبصورت لانبی گردن جس کی صباحت میں کوثر و تسنیم کا رنگ جھلکا کرتا تھا، اس کا وہ جسم جو سینہ و کمر کے تناسب اور نشیب و فراز کو پیش کر کے دنیائے جذبات میں خدا جانے کس قسم کا تلاطم برپا کر رہا تھا، اس کی وہ پیاری پیاری پیشانی جس کا صندل و عبیر مل کر ایک ملکوتی منظر پیش کیا کرتا تھا، اس کے وہ لانبے لانبے بال جو ہزاروں حلقے بنائے ہوئے اُلجھی حالت میں بھی کمر کو عبور کر جاتے تھے اس کے وہ رخسار جن کو دنیا نے ہمیشہ شعلۂ بلوریں سمجھا، اس کا وہ شباب جس کے اقرار کائنات کے تمام سمندروں کا شدید طوفان اندر ہی اندر جوش کھاتا ہوا معلوم ہوتا تھا الغرض رادھا اپنی تمام خصوصیات جمال کے ساتھ جنھیں فطرت مشکل ہی سے کبھی ایک میں جمع کر سکتی ہے، اس وقت بہت مضمحل تھی، لیکن باوجود اس کے اس کی آنکھوں کا جن کی کیفیات کو دنیا کا کوئی لٹریچر قلمبند نہیں کر سکتا یہ عالم تھا کہ بجائے نگاہوں کے ان سے کہربائی خطوط نکلتے ہوئے نظر آتے تھے اور ان کی چمک "تماشا سوز" حد تک بڑھ گئی تھی۔

(۴)

دیبل میں آج ماتم بپا ہے، ہر طرف حزن و ملال کے آثار نمودار ہیں اور ہر شخص بے تاب و مضطرب ہے، دوکانیں بند ہیں، بازار کی چہل پہل موقوف ہے اور لوگ پریشان ہیں کہ انھیں اب ایسا حکمران کیونکر نصیب ہوگا، دنیا میں کون ایسا ہے جو ان کے ساتھ اس رواداری کو جائز رکھے گا، ایسا فرمانبردار جس نے باوجود اجنبی ہونے کے کبھی ہماری پرستشوں سے تعرض نہیں کیا جو ہماری ناقوس کی آوازوں سے کبھی چیں بہ جبیں نہ ہوا، جس نے ہمارے حقوق کبھی پامال نہیں کئے جس نے ایک معمولی جزیہ کے عوض میں ہمارے جان و مال

کی پوری حفاظت کی اور ہمیشہ ہمارے نزاعات کو ہمارے ہی مذہب کے مطابق فیصل کرتا رہا اب دوبارہ نہیں آسکتا فطرت اس راحت رسانی کی تکرار مشکل سے کرتی ہے۔

سندھ کے عامل کو گئے ہوئے مہینوں ہو گئے اور اسکی عزت و عظمت کی یادگار آخر اس صورت سے پرستارانہ جذبات میں منتقل ہو گئی کہ برہمنوں نے اس کا بت تیار کیا تاکہ روز صبح کو اس کے سامنے سر اعتکاف جھکا کر اسکی روحانی برکت حاصل کیا کریں۔

رات کا سکون عالم کو محیط ہے چاند، دیبل کی خون آلود آبادی پر اپنی شعاعیں ڈالتا ہوا گذر رہا ہے اور رادھا بھی آہستہ آہستہ سپید چادر اوڑھے ہوئے اک نورانی سایہ کی طرح اپنے جھونپڑے سے نکلتی ہے اور مندر میں داخل ہو جاتی ہے۔

(۵)

اے میری روح پر ظلم کرنے والے انسان - اے میرے بدن میں محبت کی آگ پھونک دینے والے ظالم دیوتا۔ کیا خدا کی اس وسیع آبادی میں تیرے سوا اور کوئی نہ تھا، جس کی آرزو سے میں اپنے دل کو آباد کر سکتی، جس کی صورت میرے دماغ میں منقوش ہو جاتی۔

میں، جس کے سامنے اگر صبح کا دیوتا بھی اپنی تمام نرم و خنک روشنیوں کے ساتھ صرف ایک نگاہ لطف و کرم کا امیدوار ہوتا تو کبھی کامیاب نہ ہوسکتا، میں شام کے دیوتا کو بھی صرف اس کی رنگین ملاحتوں کی وجہ سے قابل توجہ نہ سمجھتی، میں کہ جس کے روبرو قوس قزح کی رنگینیاں، چاند کی سیم افشانیاں، پھولوں کی نکہت بہار کی طلعت اور تمام وہ چیزیں جنھیں زمین و آسمان میں حسین کہا جاسکتا ہے، کوئی کشش و جاذبیت نہ رکھتی تھیں تیری صرف ایک نگاہ کی حریف نہ بن سکی، اور اپنے سارے وقار کو اس طرح تیرے اوپر قربان کر دیا، جس طرح

وہ کوئی سب سے بُری چیز ہو۔

دنیا میں کیسے کیسے جوان، کیسے کیسے حسین موجود ہیں اور اس مندر کے اندر مجھے معلوم ہے کہ جب میں پھول چڑھانے آیا کرتی تھی، تو سرزمین دیبل کے کیسے کیسے نوجوان سورما صرف اس انتظار میں گھنٹوں کھڑے رہا کرتے تھے کہ شاید بھول کر ہی ان میں سے کسی کی طرف دیکھ لوں، لیکن اس مقدس جگہ کا ایک ایک ذرہ گواہ ہے کہ میری نگاہ کبھی بھی گھونگھٹ کے اندر بھی پلکوں سے باہر نہیں نکلی، کیونکہ میں سمجھتی تھی کہ ان کو دیکھ لینا ان میں ایک آرزو پیدا کر دیتا ہے جس کا پورا کرنا میرے اختیار میں نہ تھا۔

لیکن تو دفعتاً نمودار ہوا اور تو نے مجھے صرف ایک نظر سے اس طرح بے دست وپا کر دیا جیسے کمند سے ہرن، میں نے اسی وقت چاہا کہ تو کوئی گستاخی کرے، میری جانب دست حرص دراز کرے میں تیرے اخلاق کی طرف سے متنفر ہو کر تجھ سے بے زار ہو جاؤں اور اس طرح تیرے خیال کو دل سے نکال سکوں لیکن مجھ پر کیسا شدید ظلم کیا، تیرے شریفانہ اخلاق نے کہ مندر میں مجھے لرزہ بر اندام دیکھتے ہی تو نے اک نگاہ "محبت افروز" تو ضرور ڈالی، لیکن اس کے بعد اگر تو نے مجھ سے بات بھی کی تو اس طرح گویا تو مجھے شرافت وعزت کی دیوی سمجھتا ہے، اور تجھ میں نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی بھی جراءت نہیں ہے، تو فاتح تھا تو اس وقت کا مالک تھا اور اگر تو دیبل کی ہر حسین لڑکی تیری خدمت کرنے کے لئے حاضر ہو سکتی تھی، چہ جائیکہ مجھ ایسی غریب و بیکس لڑکی، کہ اگر تو اس وقت مجھے ذبح بھی کر دیتا تو کوئی تجھ سے میرے قصور کا پوچھنے والا نہ تھا، لیکن تو نے باوجود اس کے عنفوان شباب کے تمام جذبات تکمیل کے ساتھ تیرے ہر ہر عضو سے ٹپک رہے تھے، مجھ سے، جو شاید بجا طور سے اپنے حسن و

شباب پر ناز کر سکتی تھی، کوئی حیا سوز التفات نہیں کیا، پھر اس وقت سے کہ تو نے حفاظت کے ساتھ میرے گھر تک پہونچا دیا، اس وقت تک کہ میں تیری حسین تصویر، تیری مقدس صورت کے سامنے سر بسجود ہوں تو نے میری تلاش نہیں کی حالانکہ تجھے تیری بھی بے قراری کا حال معلوم تھا، تو نے مجھے کبھی بے حجاب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا حالانکہ میں جانتی ہوں تو اس کے لیئے کیا کیا تڑپا ہی صرف اس لیئے کہ تو نے میری عزت کے مقابلہ میں اپنی تمناؤں کا خون کر دینا آسان سمجھا اور تو نے یہ کبھی گوارا نہیں کیا کہ لوگ رادھا کو بُری طرح یاد کریں۔

میں ایک عمر تک پتھر کی ان مورتیوں کے سامنے پیشانی گھستی رہی لیکن حدود انسانیت سے ایک قدم بھی آگے نہیں رکھ سکی، تو نے صرف ایک بار اپنا چہرہ دکھایا، اور میں وہاں پہونچ گئی، جہاں کسی دیوی کی بھی رسائی نہیں،۔

پھر اب جب کہ تو یہاں نہیں ہے اور شاید کبھی نہ آئے گا، میں سوائے اسکے اور کیا کر سکتی ہوں کہ جبتک زندہ ہوں صرف تیری ہی پرستش کروں اور اک نئے مذہب کی بنیاد ڈالدوں جو دنیا والوں کو پرستش اخلاق کی تعلیم دے، تیرے لیئے میری زندگی کے آنسو صرف ہو چکے، میرے بدن کا ایک ایک بال تیرے لیئے رو چکا، لیکن اب میں تجھے صرف روح ہو کر پوجنا چاہتی ہوں، کیونکہ تیرے احسان سے عہدہ برآ ہونے اور تجھ سے مل رہنے کی تمنا اب شاید اسی طرح پوری ہو سکتی ہے۔

(۶)

صبح ہوتے ہی سارے دیپل کو معلوم ہو جاتا ہے کہ رادھا جس نے مہینوں سے مندر کا آنا جانا ترک کر دیا تھا، رات پوجا کے لیئے آئی اور مر گئی، لوگ متحیر تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیونکر ہوا، مگر روشنی کے سامنے محمد قاسم کی وہ تصویر جو اس سے قبل مضمحل نظر آیا کرتی تھی، مسرور تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے اندر روح دوڑ گئی ہے۔

---

# ایک مُصلح بُت تراش

شہاب، فطرتاً نقاش تھا اور ایسا نقاش کہ ہر منظر اس کے قلم سے چھو جانے کے بعد ذی حیات نظر آنے لگتا تھا، اور اس کے ہاتھ کا ہر نقش یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا فطرت کچھ سوچ رہی ہے۔

یوں تو، صبح و شام کی کیفیات، باغ و صحرا کی دل فریبیاں، کوہ دریا کے مناظر وہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ نقش کرتا لیکن اس کے خاص احباب ہی کو معلوم تھا کہ جب اس کا موضوعِ نقاشی "نسائیت" ہوتا تھا، تو وہ ایک نقاش کے حدود سے متجاوز ہو کر اک پجاری کی حیثیت بھی اختیار کر لیتا تھا، اور اس لیئے ہر عورت کی تصویر اس کے قلم سے معبودۂ حیات ہو کر نکلتی تھی۔

اس کے پاس صنف نازک کی تصویروں کا ایک عجیب و غریب مرقع تھا، جسے خود اسی نے اپنی تنہائیوں میں تیار کیا تھا، لیکن وہ انھیں کسی کو نہ دکھاتا تھا، کیونکہ اس کے نزدیک، وہ سب ناقص و نامکمل تھیں اور وہ کہا کرتا تھا کہ جب تک عورت کے خیال سے میرے کلیجہ کا منھ تک آجانا کم نہ ہوگا۔ میں فن کے لحاظ سے کبھی اس کی صورت گری میں کامیاب نہیں ہو سکتا، وہ سب سے پوچھتا کہ یہ کب ممکن ہوگا، لیکن اس کا جواب کون دے سکتا؟۔

ان تصویروں میں سب سے بہتر تصویر، اس کے نزدیک وہ تھی، جس میں ایک نوجوان لڑکی آئینہ کے سامنے اپنے بال سنوار رہی تھی اور وہ کسی کی آہٹ

پاکر دفعتہً دروازہ کی طرف گردن موڑ کر متحیرانہ انداز سے دیکھتی ہوئی ظاہر کی گئی تھی، وہ کہا کرتا تھا کہ مجھ سے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ تصویر میں کسی عورت کے پورے چہرہ کو بے حجاب دیکھ سکوں، کیونکہ صفحۂ کاغذ پر جس قدر زیادہ اس کے خدوخال نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ اسی قدر صحیح معنی میں نقاشی کی اہلیت مجھ سے سلب ہوتی جاتی ہے، یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ ایک رخ کی تصویر بنانے کا عادی تھا۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس کا ذوق بڑھتا گیا، اور رات دن وہ اسی فکر میں مستغرق رہنے لگا کہ عورت کی جذباتی زندگی کو وہ کیونکر نقوش میں ظاہر کر سکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اول اول تو اس کے عنفوان شباب کی حیاؤں نے اس میں کامیاب نہیں ہونے دیا، کیونکہ وہ عورت کے متعلق اپنے جذبات کا خیال کر کے کانپ اٹھتا تھا اور بے انتہا کوشش کے بعد بھی اس کی کاوش اس سے زیادہ مشکور نہ ہوئی کہ وہ اور اس کا قلم ایک مستقل لرزش ہو کر رہ جائے اور بعد کو جب اس میں کچھ بیباکی پیدا ہوئی تو وہ حد سے زیادہ حریص ہو گیا اور عریاں ترین نقوش بھی اس کے حسیات کو تسلی دینے کے لیے بالکل ناکافی ثابت ہوئے، الغرض اس کی نقاشی اس فن کے دونوں کناروں ہی سے متعلق رہی اور درمیانی منزل پر، جس سے کامیابی کا یقینی تعلق تھا وہ قائم نہ ہو سکا۔

(۲)

ایک زمانہ گذر گیا۔ اور شہاب بدستور اپنے شغل میں مصروف رہا۔ میری اس کی جدائی ہو چکی تھی، مجھے ایک عرصہ تک اس کے حالات سے بے خبری رہی۔

ایک شام میں ساحل قلابہ پر بیٹھا ہوا، ان فطری مناظر کے تماشہ میں جنھیں صرف بمبئی کے ساحل ہی پیش کر سکتے ہیں، مصروف تھا کہ دو جوان لڑکیاں میرے پاس ہی بنچ پر آکر بیٹھ گئیں، مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا گفتگو کر رہی تھیں اور غالباً آخر وقت

تک اس سے بے خبر رہتا اگر ان کا یہ فقرہ کہ "شہاب اس وقت یقیناً ہندوستان کا بہترین بُت ساز ہے اور نمائش میں سب سے زیادہ قیمتی انعام اسی کو ملنا چاہیئے"۔ مجھے نہ چونکا دیتا۔

شہاب! بُت ساز! نمائش! انعام!!! میں متحیر تھا اور سخت بے قرار کہ کیونکر ان سے گفتگو کرکے سارا حال معلوم کروں، پھر خیال آیا کہ ممکن ہے یہ کوئی اور شہاب ہو، لیکن جب ان میں سے ایک نے انعام حاصل کرنے والے بُت ساز کی خصوصیات کو ظاہر کرنا شروع کیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ سوائے اس شہاب کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

میں بے اختیار ہو کر اس بنچ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ تہذیب مانع آئی اور اس خیال کے ساتھ کہ آج اخبار میں ضرور اس کا ذکر ہوگا۔ وہاں سے چل دیا۔

(۳)

شہاب:۔ ہاں اب میں بُت تراش ہوں بُت ساز ہوں، مجسمے تیار کرتا ہوں، پتھر کی مورتیں بناتا ہوں، نقاشی سے زیادہ بیکار کوئی چیز نہیں۔ میری نگاہیں اس کو دیکھتے دیکھتے تھک گئیں، میرا ہاتھ صورت تو بنا سکتا تھا، لیکن اسے چھو نہ سکتا تھا، مگر اب میں اپنی خواہش کے مطابق عورت اور اس کے شباب کو چھو بھی سکتا ہوں۔ میں ایک ایسا خالق ہوں جو اپنی مخلوق کو اپنی آغوش میں بھی لے سکتا ہے، میرا خیال جو پہلے صرف سطح پر کانپا کرتا تھا، اب اُبھر کر مجسم ہوگیا ہے، اس نے صورت اختیار کرلی ہے، اور ہر چند اب میں پہلے زیادہ بیتاب و مضطرب ہوں، لیکن اس اضطراب میں واقعیت ہے، اس بیتابی میں حقیقت ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ جب صورت نے میرے دل کو معمور کر رکھا ہے، وہ میری حیات جسمانی میں بھی میرے پیش نظر ہے، میرے کمرہ کا ایک ایک گوشہ اس سے آباد ہے۔

میں اس کو چھو سکتا ہوں اس کے آگے دوزانوں ہو سکتا ہوں، اور جب چاہوں اس کے آگے سربسجود ہو کر اپنی پرستارانہ اشکباری سے اسکے خوبصورت جسم اسکے حسین شباب کو چوم سکتا ہوں۔

میں سُن رہا تھا اور حیرت کر رہا تھا کہ وہ شہاب، جو اب سے پانچ سال قبل بے انتہا خاموش زندگی بسر کرنے کا عادی تھا، کیونکر ایسا عملی آدمی بن گیا۔ وہ اگر پہلے نقاشی کی طرف مائل تھا تو صرف اپنے ادبی ذوق کی بنا پر لیکن اب وہ اپنی بت سازی کے لیئے دلائل بھی پیش کر سکتا تھا، یعنی اگر وہ پہلے صرف ایک شاعر نقاش تھا تو اب اس کی حیثیت ایک فلسفی بُت تراش کی تھی، میرا جی چاہتا تھا کہ وہ شروع سے اپنے حالات زندگی مجھ سے بیان کرے لیکن میں نے دیکھا کہ وہ "حال" میں اس قدر مستغرق ہے کہ اس سے "ماضی" کی نسبت کوئی سوال کرنا یا بھولا ہوا خواب یاد دلانا ہے۔

میں نے پوچھا کہ اس کی بُت گری کی ابتدا کیونکر ہوئی؛ یہ سُن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور بولا یہ سوال فضول ہے لیکن ایک عجیب وغریب واقعہ تمھیں سناتا ہوں۔"

میری بُت تراشی کی ابتدا تھی اور ابھی تک میرا کوئی خیال میری خواہش کے مطابق پتھر میں منتقل نہ ہو سکا تھا۔

ایک دن ہفتوں کے غور وتامل کے بعد میں نے ایک مجسمہ کی تشکیل شروع کی، میں سمجھتا تھا کہ اگر اس میں کامیاب ہو گیا، اگر میں اپنی تمناؤں کو اس طرح مجسم دیکھ سکا تو اسوقت تک کی محنت ٹھکانے لگ جائے گی، تمھیں شاید یہ نہ معلوم ہو گا کہ ایک بُت کی تعمیر ہمیشہ سر کی جانب سے شروع ہوتی ہے، لیکن میں نے عام دستور کے خلاف پاؤں کی طرف سے ابتدا کی اور کامل ایک ماہ کی محنت اور سیکڑوں نمونے بنانے بگاڑنے کے بعد دو ننھے ننھے نازک پاؤں جس میں ایک پورا اور دوسرے

کا صرف پنجہ جو زمین پر قائم تھا بنا سکا، اس کے بعد میں سخت اُلجھن میں پڑ گیا۔ کیونکہ پنڈلیوں کو عریاں بنانا صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ سارے مجسمے کو عریاں بناتا اور اس کی ہمت میں اپنے ضعیف قلب میں نہ پاتا تھا۔ آخر کار میں نے ایک فیصلہ کر لیا اور ۶ ماہ تک روز و شب اسی شغل میں مصروف رہنے کے بعد ایک عورت، وہ عورت جو اس سے قبل صرف میرے خیال پر حکمراں تھی، پیدا کر لی۔ وہ اس درجہ حسین تھی کہ مشکل سے کسی کا تصور اس کے حسن تک پہنچ سکتا تھا، وہ ایسی جوان تھی کہ شاید ہی ایسی جوانی کسی انسان میں پائی جا سکتی، اگر میں یہ کہوں کہ اس کا شباب نہایت سنگین تھا تو کوئی عجیب بات نہ ہوگی کیونکہ وہ واقعی پتھر کی تھی، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ جب میں اس کے جسم کو کبھی مضطرب و بیتاب ہو کر چھو لیتا تھا تو نرمی بھی محسوس کرتا تھا اور جب اس کے چہرہ پر نگاہ پڑ جاتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ گفتگو کر کے ابھی خاموش ہوئی ہے۔

میں گھنٹوں بیٹھا ہوا اسے دیکھا کرتا تھا، رات رات بھر اسکے چہرہ کو اسکے جسم کو جسم کے ایک ایک عضو کو، اعضاء کے تناسب کو بجلی کی روشنی میں دیکھا کرتا تھا اور صبح کے وقت جب نیند زیادہ ستاتی تھی تو اس کے قدموں پر سر رکھ کر سو جاتا تھا رفتہ رفتہ سارے مشاغل چھوٹ گئے۔ حتیٰ کہ خواب خور ترک ہو گیا۔ اور آخر کار میں نے محسوس کر لیا کہ مجھے اس کے ساتھ محبت ہے۔

میں گھنٹوں اس کے سامنے روتا، سر بسجود ہو کر اپنی تمنائیں پیش کرتا، اس کے سکوت و جمود کو برہمی سے تعبیر کرتا اور الحاح و زاری میں مصروف۔ کبھی ایسا محسوس کرتا کہ شاید وہ مسکرا رہی ہے۔ لیکن جب میں بے تاب ہو کر اس کے قریب پہونچتا تو پھر وہ اسی طرح سنجیدہ و غیر متحرک نظر آتی اور میں فرش پر گر کر بیہوش ہو جاتا۔

ایک رات جبکہ میری دیوانگی بہت بڑھ گئی تھی اور میرے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تھا کہ اس کے قدموں پر گر کر اپنے کو ہلاک کر دوں، اس مجسمہ میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے اعضاء میں جنبش محسوس ہونے لگی اور دفعتہً میری آغوش میں آ کر مجھے بیہوش کر گئی۔

یقیناً ایک مجسمہ کا زندہ ہو جانا بجائے خود ایک ایسی بات تھی کہ مجھے فرط حیرت سے دیوانہ ہو جانا چاہئیے تھا، لیکن میرے دل و دماغ میں اسکی محبت۔ اسکے ساتھ زندگی بسر کرنے کی مسرت نے کسی اور خیال کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رکھی تھی اس لئے زندگی میں، اب بالکل پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ عورت کا مفہوم کیا ہے۔ جو دن گذرتا تھا میں اس کی ملکوتی نرمی کو زیادہ قوت کے ساتھ محسوس کر جاتا تھا، یہاں تک چند دنوں کے بعد میری ہستی اسکے لطف و راحت سے اس قدر معمور ہو گئی کہ میری روح نے بغاوت شروع کر دی اور میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ شاید میں اس سے بیزار ہو گیا ہوں، وہ میری خدمت کرتی تھی اور میں اس میں کوئی عجیب بات نہ دیکھتا تھا، وہ مجھ پر مٹی جاتی تھی، لیکن میں یہ سمجھ کر اس طرح وہ اپنا فرض ادا کر رہی ہے، بجائے اسکی طرف کھنچنے کے اپنے اندر ایک پندار محسوس کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ شاید فطرت نے عورت کو اسی لئے وضع کیا ہے کہ وہ مرد کی خدمت کرے، اور کوئی احسان نہ رکھے اور مرد کی تخلیق کا منشا یہی ہے کہ وہ عورت سے کام لے اور منت پذیری کے جذبات اس میں نہ پیدا ہوں۔

اب میری برہمی اس کی طرف سے بڑھتی جاتی تھی، میں ذرا سی بات میں مشتعل ہو جاتا تھا۔ اگر کوئی ادنیٰ سی بات بھی میرے خلاف مزاج ہو جاتی تھی تو غصہ سے بھر جاتا تھا وہ میری جھڑکیاں سنتی تھی اور ہنستی تھی، وہ میری سختیاں دیکھتی تھی اور پھر اسی طرح مسرت و انہماک کے ساتھ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں مصروف ہو جاتی تھی

میرے اندر بجائے اس کے کہ اس طرز عمل سے نرمی در افت پیدا ہوتی زیادہ سختی بڑھتی جاتی تھی اور اب اس سے بالکل متنفر ہوگیا تھا۔

برسات کی ایک رات جبکہ میں باہر سے بھیگا ہوا پریشان داخل ہوا تو میں نے اسے اپنے کمرہ میں نہ پایا۔ جہاں بیٹھ کر وہ انتظار کیا کرتی تھی، یہ دیکھتے ہی مجھے سخت طیش آگیا اور گھر میں اس کی جستجو کرنے لگا، میں نے دیکھا کہ وہ ایک کونے میں کرسی پر سر ڈالے ہوئے کانپ رہی ہے (وہ حقیقتاً میرے اس وقت تک گھر نہ آنے کی وجہ سے رو رہی تھی، اس منظر نے مجھے غیر معمولی طور سے غضبناک بنا دیا، اور نہایت ہی کرخت لہجہ سے میں نے اس کو آواز دے کر چونکا دیا، میری آواز سنتے ہی آنسو پوچھتی ہوئی اٹھ بیٹھی، مگر میری برہمی کو دیکھ کر سہم گئی اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہٹتے اسی کونہ میں جا کر کھڑی ہوگئی۔ جہاں میں نے اسکا بُت تیار کیا تھا، اس کے طرز عمل نے مجھے حد درجہ غضب آلود کر دیا اور بے خطیا ہو کر میں نے ایک لکڑی جو میرے ہاتھ میں تھی اس کے نرم و نازک جسم پر ماری، لیکن اس ضرب سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے دو سخت چیزیں آپس میں ٹکرائیں۔

اس سے اور زیادہ برہم ہوا اور دوسری لکڑی اس سے زیادہ قوت کے ساتھ ماری، میری لکڑی کے دو ٹکڑے ہو گئے اور میں نے چاہا کہ ہاتھ سے پکڑ کر اسے گھسیٹ لوں۔ لیکن جب اس کے قریب پہونچا تو معلوم ہوا کہ وہ مجسمہ تھی ساکن و بے حس، وہ ایک عورت تھی بارود و سنگین، وہ ایک پیکر انسانی تھی لیکن گہرے خواب میں مصروف۔

یہ افسانہ نوم طویل کا ہو یا خواب کا۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ اسکے بعد حقیقی معنی میں میری آنکھ کھلی اور میں نے محسوس کیا کہ اسوقت تک میں نے جس چیز کو عورت سمجھا تھا وہ عورت نہ تھی، کیونکہ عورت نام اس کے حُسن جسمانی اور تناسب اعضاء کا نہیں بلکہ اس کے حُسن صفات کا ہے۔

یقیناً میں اس واقعہ کے بعد بھی اپنے مشاغل میں بدستور مصروف رہا۔ لیکن اس سے قبل میں جو مجسمے تیار کیا کرتا تھا ان میں میرے جذبات حیوانی بھی شامل ہوتے تھے اور اس لیئے وہ صنعت کے نقطۂ خیال سے (جو حد درجہ معصوم چیز ہے) قابل التفات ہوتے تھے اور اب ان سے وہ جذبات ظاہر ہوتے ہیں جو صحیح معنی میں فطرت نسوانی سے متعلق ہیں، اور اسی دور کا ایک مجسمہ تھا، جس نے میری دنیاوی شہرت کو بھی تکمیل تک پہونچا دیا۔

کیا اب بھی تم مجھے ملامت کروگے، بمبئی کی شاید ہی کوئی حسین لڑکی ایسی ہوگی جس نے مجھ سے یہ خواہش نہ کی ہو کہ میں اسے پتھر میں تبدیل کر دوں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان کے مجسمے اس دور سے متعلق ہوں گے جسے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں میں ان کی یہ خواہشیں رد کر دیتا ہوں، کیونکہ یہاں کے مغربی تمدن نے عورتوں کی نسائیت کو سلب کر لیا ہے اور وہ اب صرف خواہش نفسانی کی دیویاں ہیں جن کو دیکھ کر میری روح لرز جاتی ہے۔

(۴)

میں نے اس مجسمہ کو جا کر دیکھا، جس نے شہاب کو غیر فانی بنا دیا ہے۔

ایک عورت جو ہزار دشواریوں سے کچھ سامان غذا فراہم کر سکی ہے بوسیدہ لباس میں اپنے اندھے شوہر کے سامنے کھڑی ہوئی اپنی دن بھر کی محنت کا ثمرہ پیش کر رہی ہے اور اپنے دونوں چھوٹے بچوں کو جو بھوک سے بے تاب ہو کر اس سے لپٹے جاتے ہیں ہاتھ سے علیحدہ کر رہی ہے تاکہ وہ سب سے پہلے اپنے شوہر کی بھوک کو دور کر سکے جس کے لئے ہندوستان کی عورت جان دینا بھی ادنیٰ خدمت خیال کرتی ہے۔

# روح کی فریب کاریاں عالمِ مُحبّت میں

ہر شام نوجوان ماہی گیر سمندر پہ جاتا اور اپنا جال پانی میں ڈال دیا کرتا جب ہوا ساحل سے سمندر کی طرف چلتی تو اسے کچھ نہ ملتا اور جب ہوا سمندر سے ساحل کی جانب آتی تو سمندر کی گہرائی سے مچھلیاں اس کے جال کے پھندوں میں تیر آتیں وہ جال کھینچ لیتا اور مچھلیاں بازار میں جا کر بیچ ڈالتا۔

ایک شام اس نے دیکھا کہ جال وزنی ہے، اس قدر وزنی کہ وہ مشکل سے کھینچ کر کشتی میں ڈال سکتا ہے، وہ ہنسا اور اپنے جی میں اس نے کہا کہ شاید آج سمندر کی ساری تیرنے والی مچھلیاں جال میں آگئی ہیں یا کوئی پانی کی ایسی عجیب و غریب چیز ہے جس کو دیکھ کر لوگ متحیر ہو جائیں گے، اور ملکہ مسرور ہوگی"۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ جال کھینچنا شروع کیا اور جب آہستہ آہستہ وہ کھینچ کر اوپر لایا تو ماہی گیر کو کیسی حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ اس میں کوئی مچھلی نہیں ہے بلکہ دخترِ آب (سمندر کی پری) بیہوش پڑی سو رہی ہے۔

اس کے بال ایسے تھے جیسے بھیگا ہوا سنہرا ریشم، اور جو بال ذرا الگ ہو گیا تھا وہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شیشے کے پیالے میں باریک سونے کا تار، اس کا جسم سپید تھا جیسے ہتھیلی اور اس کا نیچے کا حصہ چاندی اور موتی، ہاں، اس کا یہ حصہ جسم ایسا ہی تھا اور سمندر کی سبز گھاس اس کے چاروں طرف لپٹی ہوئی تھی، اس کے کان گویا صدف تھے اور اس کے ہونٹ جیسے بالکل مونگا، سمندر کی ٹھنڈی موجیں اس کے سرد سینہ سے گذر رہی تھیں اور اس کی بند آنکھوں کے پپوٹوں

پر سمندر کا نمک جما ہوا چمک رہا تھا وہ ایسی حسین تھی کہ ماہی گیر دیکھ کر حیرت زدہ ہوگیا، اس نے جال قریب کھینچا اور جھک کر اس کو اپنی آغوش میں لے لیا، لیکن جسم میں ہاتھ لگتے ہی وہ جاگ اٹھی اور ماہی گیر کو دیکھ کر چیخ اٹھی اور اس کی گود سے نکل بھاگنے کی کوشش کی لیکن ماہی گیر نے اس کو مضبوط پکڑ رکھا تھا۔ جانے نہ دیا۔

جب اس نے دیکھا کہ میں کسی طرح نہیں چھوٹ سکتی تو وہ رونے لگی اور بولی کہ "میں التجا کرتی ہوں مجھے جانے دے۔ میں بادشاہ کی اکلوتی بیٹی ہوں اور میرا باپ ضعیف ہے، اور تنہا" ماہی گیر نے جواب دیا "تجھے جانے دوں گا۔ مگر اس شرط سے کہ تو وعدہ کرے کہ جب میں بلاؤں گا، تو آجائے گی، اور اپنا گانا سنائے گی، کیونکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ مچھلیاں آبی مخلوق کے گانے کی عاشق ہیں اور اس طرح میرا جال بھر جایا کرے گا" وہ بولی "اگر میں یہ وعدہ کر لوں تو کیا تو واقعی مجھے چلا جانے دے گا؟" اس نے قسم کھائی ماہی گیر نے اسے چھوڑ دیا اور وہ پانی میں غوطہ لگا کر غائب ہوگئی۔

ماہی گیر ہر شام سمندر پر جاتا، اس کو پکارتا، وہ پانی سے اُبھر آتی، اور اپنا گانا سناتی، مچھلیاں سننے کو جمع ہو جاتیں اور ماہی گیر اپنا جال بھر بھر کے کشتی میں ڈالتا اور چلا جاتا دختر آب بھی مسکراتی ہوئی غائب ہو جاتی۔ روز ایسا ہوتا لیکن وہ اس قدر نزدیک نہ آتی کہ ماہی گیر اسے چھو سکتا، وہ اکثر اسے بلاتا، اس سے التجا کرتا لیکن وہ نہ سنتی اور کبھی یہ اسے پکڑنا چاہتا تو پانی میں غوطہ لگا جاتی، اور اس دن نہ آتی، جو جو دن گذرتے جاتے اس کا گانا ماہی گیر کے دل میں گھر کرتا جاتا تھا، رفتہ رفتہ اس کا یہ حال ہوگیا کہ جال ڈالنا، مچھلیاں پکڑنا سب بھول گیا وہ کشتی میں خاموش و مضمحل بیٹھا رہتا اور گانا سنا کرتا، یہاں تک کہ شام کی تاریکی چاروں طرف سے اسے گھیر لیتی اور چاند تمام سمندر پر اپنی نورانی چادر پھیلانے لگتا

ایک شام ماہی گیر نے کہا کہ" اے دختر آب، اے پانی کی شہزادی میں تجھے چاہتا ہوں مجھے اپنے سے مل جانے دے کیونکہ مجھے تیرے ساتھ بڑی محبت ہے" لیکن اس نے گردن ہلائی اور کہا کہ" تیرے پاس انسانی روح ہے اگر تو اپنے پاس سے اس کو جدا کر دے تو بیشک میں تجھ سے محبت کر سکتی ہوں"۔ ماہی گیر نے اپنے جی میں کہا کہ "واقعی یہ روح میرے کس کام کی ہے؟ نہ میں اسے دیکھ سکتا ہوں، نہ چھو سکتا ہوں، میں تو اسے جانتا بھی نہیں، میں یقیناً اپنے پاس سے جدا کر دوں گا پھر مسرت ہی مسرت ہے۔"

اس خیال سے خوشی کی چیخ اس کے منھ سے نکل پڑی اور اس نے اپنی کشتی پر کھڑے ہو کر دختر آب کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا کہ" اچھا اگر میں اپنی روح جدا کر دوں تو میرے ساتھ تو شادی کر لے گی، کاش اگر ایسا ہوا تو ہم تم دونوں ایک ساتھ سمندر کی گہرائیوں میں رہا کریں گے تو مجھے پانی کی وہ تمام چیزیں دکھائے گی جن کا ذکر تو اپنے گیتوں میں کیا کرتی ہے اور میں بھی اپنے تئیں تیری مرضی پر چھوڑ دوں گا اور پھر کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے"۔ دختر آب بھی خوشی سے ہنسنے لگی اور اپنا چہرہ شرم کے مارے ہاتھوں سے چھپا لیا، ماہی گیر نے کہا۔" لیکن میں اپنی روح کیونکر جدا کر سکتا ہوں، تو ایک بار مجھے بتا دے، پھر تو میں کر ہی لوں گا"۔ دختر آب نے کہا کہ" افسوس ہے مجھے یہ نہیں معلوم کیونکہ مخلوق آب روح نہیں رکھتی" یہ کہا اور سمندر میں غوطہ لگا کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

اگلی صبح قبل اس کے کہ آفتاب پہاڑی کی چوٹی سے بلند ہو، ماہی گیر راہب کے پاس آ گیا اور اس کے دروازے کو کھٹکھٹایا، اس نے کہا اندر چلا آ، یہ چلا گیا اور کہا۔

"اے محترم! میں ایک آبی ہستی سے محبت کرتا ہوں اور میری روح مجھے اس

سے ملنے نہیں دیتی، مجھے بتاؤ کہ میں اس روح کو اپنے پاس سے کیونکر جدا کردوں، یہ تو میرے کسی کام کی نہیں، نہ میں اسے دیکھ سکتا ہوں، نہ پوچھ سکتا ہوں میں تو اسے جانتا بھی نہیں"۔ راہب نے اپنا سینہ کوٹ لیا اور بولا" تو دیوانہ تو نہیں تو نے کوئی زہریلی چیز تو نہیں کھائی، روح تو انسانی ہستی کے تمام اجزا میں شریف ترین جزو ہے اور خدا نے ہمیں اس لئے عطا کی ہے کہ اس کا بہتر استعمال کریں، اس سے زیادہ قیمتی دنیا میں کوئی چیز نہیں، ساری سلطنتوں کے جواہر ایک طرف اور وہ ایک طرف، خبردار اب اس کا خیال نہ کرنا، یہ ایک ایسا گناہ ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا، آبی مخلوق تو گمراہ مخلوق ہے، جو کوئی ان کے ساتھ معاملہ کرے، وہ بھی گمراہ ہے"۔ ماہی گیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بولا۔" جو ان جنگلوں میں رہتے ہیں اور خوش ہیں، حشرات پہاڑیوں میں چلتے پھرتے ہیں اور مسرور ہیں مجھے بھی ویسا ہی ہو جانے دے جیسے وہ ہیں میں تجھ سے التجا کرتا ہوں، کیونکہ ان کی زندگی ایسی ہے جیسے پھولوں کی ہیں اپنی روح کو کیا کروں جب وہ مجھ کو نہیں ملنے دیتی، اس سے جس سے میں ملنا چاہتا ہوں میں نے اپنے جال میں ایک دختر آب پکڑ لیا تھا وہ شعاع سحری سے زیادہ حسین اور چاند سے زیادہ سپید تھی، میں اس کے جسم کے لئے اپنی روح اور اس کی محبت کے لئے ساری فردوس دینے کے لئے راضی ہوں"۔ راہب نے کہا۔" دور ہو، چلا جا"۔ وہ دور ہو گیا چلا گیا۔

ماہی گیر گردن جھکائے ہوئے جیسے کوئی رنجیدہ ہو، مغموم بازار میں آہستہ آہستہ گذر رہا تھا کہ تاجروں کا ایک قافلہ ادھر سے نکلا، ان میں سے ایک تاجر بڑھا اور پوچھا " تو کچھ بیچتا ہے؟" اس نے جواب دیا۔" میں اپنی روح بیچتا ہوں تم اسے لے لو گے؟ میں بیزار ہوں وہ تو میرے کسی کام کی نہیں، نہ میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔"

تاجر نے کہا۔" واہ! روح لے کے کیا کریں گے۔ اپنا جسم بیچ دے تو بلاشک ہم تجھے غلام بنائیں، تجھے عمدہ ملبوس سے آراستہ کریں تیری انگلیوں میں چھلے پہنائیں، ملکہ کے سامنے پیش کریں روح تو ہمارے لیئے بیکار ہے وہ ہمارے کسی کام کی نہیں" ماہی گیر نے اپنے جی میں کہا" کیسی عجیب بات ہے، راہب کہتا ہے روح سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں تاجر کہتا ہے روح تو بیکار ہے"۔ وہ یہ سوچتا ہوا بازار سے گذر گیا اور سمندر کے ساحل پر کھڑا ہوا غور کرنے لگا کہ اب کیا کرے

دوپہر کو اسے یاد آیا کہ اس کے دوست نے ایک جوان ساحرہ کا ذکر کیا تھا جو پہاڑ کے غار میں رہتی ہے، یہ یاد آتے ہی بیتابانہ اس طرف دوڑا، ساحرہ نے دور ہی سے اس کا آنا معلوم کر لیا، وہ ہنسی اور اس نے اپنے سرخ بال پیچھے لٹکا دیئے اور پھر چاروں طرف بکھرا دیئے وہ غار کے دہانے پر کھڑی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں کانٹوں کا ایک گچھا تھا اور وہ اس سے کھیل رہی تھی، بولی" کیا چاہیئے؟ اپنے جال کے لیئے مچھلیاں؟ میرے پاس ایک چھوٹی سی بانسری ہے۔ جب میں اسے بجاتی ہوں تو خلیج کی ساری مچھلیاں دوڑتی پھرتی ہیں، لیکن اے حسین نوجوان اس کی قیمت ہے! تو کیا چاہتا ہے، جہازوں کو تباہ کرنے کے لیئے ایک طوفان؟ تاکہ تو خزانوں کے صندوق کنارے لے آئے، میرے پاس ہوا سے زیادہ طوفان موجود ہے، کیونکہ میں اس کی پرستار ہوں جو ہوا سے زیادہ قوی ہے، اور میں ایک چھلنی اور تھوڑے سے پانی کی مدد سے بڑے جہازوں کو سمندر کی تہہ تک پہنچا سکتی ہوں، لیکن اے خوبصورت نوجوان میں قیمت لوں گی، تجھے کیا چیز درکار ہے؟ میں جانتی ہوں اور سوائے میرے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس وادی میں ایک پھول پیدا ہوتا ہے اس کی پتیاں ارغوانی ہیں اور اس کا دل داغدار اس کا عرق سپید ہے جیسے دودھ، اگر تو اس پھول سے ملکہ کے ہونٹ چھولے تو ساری دنیا میں دہ

تیرے پیچھے پیچھے بھرے، لیکن اے حسین نوجوان اس کی قیمت ہے، تجھے کیا چاہیئے،
میں اپنے پہیے کی ایک گردش سے چاند کو آسمان سے کھینچ سکتی ہوں، اور ایک
بلور کے ٹکڑے میں تجھے موت دکھا سکتی ہوں مجھ سے اپنی خواہش بیان کر میں
پوری کردوں گی لیکن تجھے قیمت ادا کرنی پڑے گی"۔ ماہی گیر نے کہا "میری خواہش
نہایت مختصر ہے۔ اور میں راضی ہوں قیمت ادا کرنے پر اگر تو اسے پوری کر سکے
میں اپنی روح جدا کرنا چاہتا ہوں وہ میرے لئے بیکار ہے، نہ میں اسے دیکھ
سکتا ہوں نہ چھو سکتا ہوں میں تو اسے جانتا بھی نہیں"۔ ساحرہ نے اپنی خوبصورت
آنکھوں سے اسے دیکھ کر کہا "اگر میں اسے جدا کردوں تو مجھے کیا دے گا"۔ ماہی گیر بولا۔
"پانچ اشرفیاں" اپنا جال اپنا پتوار اور وہ رنگین کشتی، جس میں بھرا کرتا ہوں،
تو مجھے بتادے، میں تجھے وہ سب کچھ دیدوں گا جو میرے پاس ہے"۔ وہ ہنسی
اور جواب دیا۔ "میں اگر چاہوں تو، خزاں رسیدہ پتیوں کو سونا اور چاند کی
شعاعوں کو چاندی بنا سکتی ہوں، جس کی پرستش کرتی ہوں وہ دنیا کے تمام بادشاہوں
سے زیادہ دولتمند ہے"۔ ماہی گیر بولا "پھر میں تجھے کیا دوں، جب نہ اسکی قیمت
سونا ہے نہ چاندی"۔ ساحرہ نے اس کے بالوں کو اپنے گورے گورے ہاتھوں
سے چھوا اور بولی ۔ "اے حسین نوجوان تجھے میرے ساتھ رقص کرنا پڑے گا"
ماہی گیر نے تعجب سے پوچھا "بس اور کچھ نہیں سوائے اس کے؟" اس نے مسکرا
کر جواب دیا "ہاں بس یہی"۔ ماہی گیر نے کہا "اچھا غروب آفتاب کے وقت
کسی پوشیدہ مقام میں ہم تم دونوں رقص کریں گے اور اس کے بعد تجھے وہ
بات بتانی پڑے گی جسے میں جاننا چاہتا ہوں"۔ ساحرہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا
اس کو اپنے قریب کھینچا، اپنے ہونٹ اس کے کانوں کے پاس لے گئی اور کہا
"آج رات کو پہاڑ کی چوٹی پر آ۔" ماہی گیر بولا "تو بڑی اچھی ساحرہ ہے، میں

یقیناً آج رات کو پہاڑ کی چوٹی پر تیرے ساتھ رقص کروں گا۔ تو نے مجھ سے کوئی قیمت طلب نہیں کی"۔ یہ کہہ کر وہ خوش خوش واپس آگیا۔ ساحرہ اسے دیکھتی رہی جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو اپنے غار میں داخل ہوئی اور صندوق سے ایک آئینہ نکال کر دستے میں لگایا اور اس کے سامنے کوئی چیز آگ میں جلائی، دھوئیں کے بیچ وخم کو گھورتی جاتی تھی، اس نے اپنی مٹھی بند کی اور غصہ کی حالت میں بولی۔

"اسے تو میرا ہونا چاہیئے تھا، میں بھی ایسی ہی حسین ہوں جیسی دختر آب"۔

شام کو جب چاند بلند ہوگیا، ماہی گیر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھا اور ایک درخت کی شاخوں کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ دفعتہً جوان ساحرہ اپنے سرخ بالوں کو ہوا میں لہراتی ہوئی آپہونچی، اس کا لباس سنہرا تھا ——— سر پر ایک چھوٹی سی سبز مخمل کی ٹوپی تھی، اس نے ماہی گیر کا ہاتھ پکڑ لیا اور چاندنی میں لے جاکر رقص کرنا شروع کیا۔ ساحرہ نے اپنے ہاتھ اس کے گلے میں ڈال دئے اور بولی" اور تیزی سے" ماہی گیر کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ زمین اس کے پاؤں کے نیچے گھوم رہی ہے، اس کا سر دکھ رہا ہے، اب ساحرہ نے چاہا کہ بھاگ جائے، لیکن ماہی گیر نے اس کی کلائیاں مضبوط پکڑ لیں اور جانے نہیں دیا۔ میں تجھے نہیں جانے دوں گا" ماہی گیر بولا" جبتک تو مجھے راز نہ بتادے۔" ساحرہ نے کہا" کون سا راز"۔ ماہی گیر نے کہا تو جانتی ہے"۔ جب ساحرہ نے دیکھا کہ وہ اپنے تئیں چھڑا نہیں سکتی تو بولی" میں بھی ویسی ہی حسین ہوں جیسی دختر آب" اور یہ کہہ کر اپنے گال اسکے گال پر رکھدئے، ماہی گیر نے برہم ہوکر اس کو ڈھکیل دیا اور بولا کہ" اگر تو اپنا وعدہ پورا نہیں کریگی، تو میں تجھے مار ڈالوں گا۔" جب ساحرہ مجبور ہوگئی تو اس نے اپنی کمر سے ایک چھوٹا سا خنجر نکالا اور اس کو دیا، ماہی گیر نے پوچھا" اسے کیا کروں" ساحرہ نے جواب دیا" جس کو لوگ جسم کا سایہ کہتے ہیں وہ روح کا سایہ ہے، ساحل پر چاند کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو اور

اپنے پاؤں کے چاروں طرف سایہ کو اس چاقو سے کاٹ دے اور روح سے یہ کہہ کہ چلی جا"۔ وہ چلی جائے گی"۔ ماہی گیر نے یہ چاقو کمر میں لگایا، اور اترنا شروع کیا، اکی روح گھبرا کر بولی"۔ میں اتنے زمانہ سے تیرے ساتھ ہوں، تیری خدمت کرتی ہوں تو مجھے اپنے سے جدا نہ کر، میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے"۔ ماہی گیر ہنسا" تونے برائی تو کوئی نہیں کی لیکن مجھے اب تیری ضرورت نہیں دنیا دسیع ہے، بہشت و دوزخ وسیع ہیں۔ جا جہاں تیرا جی چاہے، اب مجھے نہ ستا، میری محبوبہ مجھے بلا رہی ہے"۔ اسکی روح بولی۔ " اگر تو واقعی مجھے اپنے سے دور کئے دیتا ہے تو یوں تنہا نہ چھوڑ، دل کو بھی ساتھ کر دے، دنیا ظالم ہے، ایک ساتھی تو مجھے دیدے" ماہی گیر مسکرا کر بولا:" میں محبت کس سے کروں گا اگر میں نے تجھے دل دیا، میرا دل میری محبوبہ ہے، دیر نہ کر، جا۔"

ماہی گیر نے فوراً چاقو نکال کر پاؤں کے چاروں طرف سایہ کو کاٹ دیا سایہ بلند ہو کر اس کے سامنے ہو گیا، اور کہا میں اس جگہ ہر سال آؤں گا اور تجھے آواز دوں گا، ہو سکتا ہے کہ تجھے پھر میری ضرورت ہو" ماہی گیر نے کہا۔" مجھے تیری کیا ضرورت ہے۔ لیکن تیری مرضی"۔ یہ کہتے ہی ماہی گیر نے غوطہ لگایا حسین دختر آب اس کے ملنے کو بڑھی، "اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور منھ چوم لیا۔

روح تنہا ساحل پر کھڑی ہوئی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی، جب وہ دونوں غوطہ لگا کر سمندر میں غائب ہو گئے تو روح بھی روتی ہوئی ایک طرف چل دی۔

ایک سال گزر گیا روح ساحل پر آئی اور ماہی گیر کو آواز دی، ماہی گیر نے پانی سے گردن نکالی اور پوچھا تو مجھے کیوں آواز دیتی ہے"۔ روح نے کہا" میرے قریب آ، تاکہ میں تجھ سے کچھ کہہ سکوں۔ میں نے عجیب عجیب باتیں دیکھی ہیں"۔ ماہی گیر قریب، آگیا اور چھچلے پانی میں لیٹ گیا اور سننے لگا۔ روح نے کہا جب میں تجھ سے جدا ہوئی ہیں نے اپنا رخ مشرق کی طرف کیا اور چل دی، مشرق ہی سے ہر وہ چیز پیدا ہوتی

ہے، جو عقل کی ہے، چھ دن برابر میں نے سفر کیا اور ساتویں دن کی صبح میں ایک پہاڑ پر پہونچی جو ملک تاتار میں واقع ہے، میں نے اسوقت تک کہ آفتاب کی گرمی نے مجھے وہاں سے اٹھ جانے پر مجبور نہیں کیا، بیٹھی دیکھتی رہی، میں نے وہاں جو کچھ دیکھا وہ ہر چند بہت عجیب و غریب ہے، لیکن میں تجھ سے نہیں کہوں گی۔ کیونکہ تو انھیں سنکر خوش نہیں ہو سکتا۔ میں تاتار سے اس ملک میں پہونچی جو چاند اور چاندنی کی توہین کرتے ہیں، ان کی زندگی کو بھی میں نے ان میں چند دن ٹھہر کر دیکھا ان میں کا ایک راہب مجھے ملا اس نے مجھ سے میری خواہش پوچھی۔ میں نے کہا "میں تمھارا خدا دیکھنا چاہتی ہوں" راہب نے کہا "خدا شکار کھیل رہا ہے" میں نے پوچھا "کس جنگل میں" میں بھی وہیں جاؤں گی۔" اس نے اپنے کرتے کی جھالروں کو اپنے لمبے نوکدار ناخنوں سے سلجھاتے ہوئے آہستہ سے کہا "خدا سو رہا ہے" میں نے کہا "کس جگہ" میں بھی اُسکے پاس جاؤں گی"۔ اس نے کہا "خدا کھانا کھا رہا ہے" میں نے کہا: "اگر اسکی شراب شیریں ہے۔ تو میں بھی اُسکے ساتھ ہونگی، اگر اسکی شراب تلخ ہے تو میں بھی اس میں کچھ حصہ لوں گی"۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور مجھے معبد کے اندر لے گیا، وہاں کوئی بُت تھا نہ کوئی مجسمہ بلکہ صرف ایک گول آئینہ تھا، جو ایک پتھر کی قربان گاہ پر قائم تھا۔ میں نے پوچھا، خدا کہاں ہے۔" اس نے جواب دیا، "یہی آئینہ جو تو دیکھتی ہے وہ خدا ہے، اسی کو آئینہ عقل کہتے ہیں۔ آسمان و زمین کی ساری چیزیں نظر آتی ہیں وہ لوگ جن کے پاس یہ آئینہ ہے ہر چیز معلوم کر لیتے ہیں ان سے کوئی چیز نہیں چھپ سکتی۔ اسی لئے وہ خدا ہے اور ہم اسکی پرستش کرتے ہیں"۔ روح نے ماہی گیر سے کہا۔ "یہاں سے صرف ایک دن کے راستے پر وادی میں اس آئینہ کو چھپا آئی ہوں۔ صرف مجھے اپنے اندر آجانے کی اجازت دے، پھر عقل تیری لونڈی ہو جائے گی اور دنیا میں کوئی شخص تیرے برابر دانشمند نہ ہوگا۔" ماہی گیر یہ سن کر ہنسا اور بولا۔

"محبت عقل سے بہتر ہے"۔ یہ کہا اور سمندر میں غوطہ لگا گیا اور روح پھر روتی ہوئی ایک طرف چل دی۔

جب دوسرا سال ختم ہوگیا تو روح پھر ساحل پر پہونچی اور ماہی گیر کو آواز دی۔ وہ سمندر کے اندر سے اُبھرا اور پوچھا۔ "تو نے مجھے کیوں بلایا"۔

روح نے کہا "۔ تو میرے قریب آتا کہ میں تجھ سے بات کرسکوں میں نے عجیب و غریب چیزیں دیکھی ہیں"۔ جب وہ پاس آگیا تو روح نے کہا "جب میں تجھ سے جدا ہوئی تو اپنا رخ جنوب کی طرف کیا، جنوب ہی سے ہر وہ چیز آتی ہے جو حقیقی ہے چھ دن کے بعد ایک شہر میں پہونچی جس کے نو دروازے ہیں ہر دروازے پر ایک گھوڑے کا مجسمہ قائم ہے جو ہنہناتا ہے جب وہاں کے لوگ پہاڑوں سے واپس آتے ہیں"۔ دیواروں پر تانبا چڑھا ہوا ہے۔ برج پیتل کے ہیں اور ہر برج میں ایک تیر انداز ہاتھ میں کمان لئے کھڑا رہتا ہے، طلوع آفتاب کے وقت وہ گھنٹہ پر اپنے تیر کی ضرب سے آواز پیدا کرتا ہے اور شام کو قرنے سے۔ شہر کے اندر ایک بازار ہے، گلیوں میں کاغذ کے فانوس اُڑتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے بڑی بڑی تیتریاں۔ جب ہوا چلتی ہے تو وہ اس طرح بلند ہوتے ہیں جیسے رنگین بلبلے، وہاں شیرازی شراب جو شہد کی طرح شیریں ہوتی ہے ہر جگہ ملتی ہے، وہ چھوٹے چھوٹے پیالوں میں دی جاتی ہے، اور گلاب کی پتیاں اس پر بکھیر دی جاتی ہیں۔ شام کو شاہی محل کے قریب پہونچی اور اسکے اندر داخل ہوگئی۔ نوجوان بادشاہ لیٹا ہوا تھا اس کے پیچھے ایک حبشی جو کمر تک برہنہ تھا۔ کھڑا ہوا تھا اس کے پاس ہی ایک فولاد کی بڑی تلوار رکھی ہوئی تھی۔ جب بادشاہ نے مجھے دیکھا برہم ہوا اور بولا "تیرا کیا نام ہے، کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں اس شہر کا بادشاہ ہوں، میں نے کوئی جواب نہیں دیا، اس نے اپنی انگلی سے تلوار کی طرف اشارہ کیا۔ حبشی

نے اسے لے لیا اور ایک سخت ضرب مجھ کو پہونچائی، لیکن مجھے کوئی آزار نہیں پہنچا حبشی فرش پر گر پڑا اور ایک کونے میں کھڑا ہو کر کانپنے لگا بادشاہ کھڑا ہو گیا۔ اور نیزہ لیکر میرے اوپر حملہ کیا، میں نے اس کو پکڑ لیا اور دو ٹکڑے کر دئے، پھر اس نے اپنا تیر میرے اوپر چلایا۔ میں نے ہاتھ اٹھا دیا اور وہ ہوا میں قائم ہو کر رہ گیا۔ پھر بادشاہ نے اپنا خنجر نکالا۔ اور حبشی کے گلے پر پھیر دیا تاکہ وہ اس کی بے عزتی کا حال کسی سے نہ کہہ سکے، حبشی ایک مجروح سانپ کی طرح بل کھانے لگا اور زمرخ کف اس کے منہ سے نکلنے لگا اب بادشاہ نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ کر مجھ سے کہا "کیا تو کوئی پیغمبر ہے میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ آج رات کو میرے شہر سے چلا جا، کیونکہ جب تک تو یہاں ہے میں اپنے تئیں بادشاہ نہیں سمجھ سکتا" میں نے جواب دیا۔ "مجھے اپنا آدھا خزانہ دیدے میں چلی جاؤں گی" بادشاہ نے کہا"۔ اس میں آدھا تیرا ہے، میں اونٹوں پر بار کرا کر پہونچوا دوں گا۔ جہاں تیری خواہش ہو گی لیکن تو آج ہی رات کو میرا شہر چھوڑ دے کیونکہ میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ یہاں کوئی ایسی ہستی ہے جس کو میں ہلاک نہیں کر سکتا۔" میں نے جواب دیا" نہ مجھے سونا چاہیئے نہ چاندی اور نہ یہ جواہرات میں تو وہ انگوٹھی چاہتی ہوں جو تیرے ہاتھ میں چمک رہی ہے" بادشاہ یہ سن کر برہم ہوا اور بولا " وہ سلطنت کی انگوٹھی ہے۔ یہ میں تجھے نہیں دوں گا۔ لیکن اے ماہی گیر یہاں صرف ایک دن کے راستے پر میں وہ انگوٹھی جو ساری دنیا کی دولت کی کنجی ہے، چھپا آئی ہوں، اس لئے میرے ساتھ آ اور اس انگوٹھی کو لے لے"۔ ماہی گیر یہ سنکر ہنسا اور بولا " محبت دولت سے زیادہ قیمتی ہے"۔ وہ یہ کہہ کر پانی میں غوطہ لگا گیا، روح روتی ہوئی ایک طرف چل دی

جب تیسرا سال ختم ہو گیا تو وہ پھر ساحل پر آئی اور ماہی گیر کو آواز دی اور بولی

" ایک شہر میں جہاں سرائے ایک دریا کے کنارے قائم ہے میں ملاحوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جو دو مختلف رنگوں کی شرابیں پی رہے تھے، اسی حال میں کہ ہم بیٹھے ہوئے تھے اور مسرور تھے ایک بڈھا جس کے ہاتھ میں ایک بربط تھا اور شانے پر ہرن کی کھال۔ آیا، اس نے کھال بچھائی اور بیٹھ گیا۔ بربط کے تاروں کو مضراب سے جنبش دی اور ایک لڑکی جس کے چہرہ پر نقاب پڑا ہوا تھا نمودار ہوئی اور ہمارے سامنے رقص کرنے لگی، لیکن اس کے پاؤں عریاں اور فرش پر اس طرح حرکت کرتے تھے جیسے دو چھوٹے چھوٹے سفید کبوتر، میں نے ایسی حسین لڑکی نہیں دیکھی وہ شہر یہاں سے صرف ایک دن کے فاصلہ پر ہے، جب ماہی گیر نے یہ سنا تو اس نے سوچا کہ اس کی محبوبہ کے پاؤں نہیں ہیں اس لیئے وہ رقص نہیں کر سکتی۔ اسکے دل میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور اپنے جی میں سوچنے لگا " صرف ایک دن کا سفر ہے۔ میں اپنی محبوبہ کے پاس جلد لوٹ آؤں گا۔" وہ یہ سوچ کر ہنسا اور ساحل پر آکر روح کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے۔ روح ایک نعرۂ مسرت کے ساتھ اس سے ملنے دوڑی اور اس کے جسم کے اندر حلول کر گئی۔ ماہی گیر نے اپنے ریگ پر جسم کے اس سائے کو پھر بچھا ہوا دیکھا، جو روح کا جسم ہے، روح نے کہا " اب دیر نہ کر" وہ دونوں رات بھر چاندنی میں سفر کرتے رہے اور دوسرے دن شام کو ایک شہر میں پہونچے ماہی گیر نے روح سے پوچھا " کیا یہ وہی شہر ہے جس میں لڑکی رقص کرتی ہے"۔ روح نے کہا " نہیں یہ تو نہیں ہے، مگر خیر اندر چلو"۔ جب وہ اندر داخل ہوئے۔ اور ایک گلی میں سے گذرے تو ماہی گیر نے ایک چاندی کا پیالہ دروازے پر دیکھا۔ روح نے کہا " اسے لے لے اور چھپالے"۔ اس نے لے لیا اور اپنے کرتے کے نیچے چھپا لیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ماہی گیر کو غصہ آیا اور پیالے کو پھینک کر بولا " تو نے مجھ سے کیوں کہا تھا کہ پیالہ لے اور چھپالے"۔ روح نے کہا "۔ ذرا صبر کر صبر"۔ دوسرے دن

شام کو دوسرے شہر میں پہونچے ماہی گیر نے پوچھا "یہی وہ شہر ہے جس میں لڑکی رقص کرتی ہے" روح بولی "نہیں یہ نہیں ہے، مگر خیر اندر چل" وہ اندر داخل ہوئے، اور ایک گلی سے گزرے، ماہی گیر نے دیکھا کہ ایک بچہ بیٹھا ہوا ہے، روح نے کہا، "اس لڑکے کو مار" ماہی گیر نے مارا اور لڑکا رونے لگا تھوڑی دور جانے کے بعد ماہی گیر کو غصہ آیا اور روح سے بولا "تو نے مجھے بچہ کے مارنے پر مجبور کیا؟" روح نے کہا "ذرا صبر کر صبر" تیسرے دن شام کو وہ پھر ایک شہر میں پہونچے ماہی گیر نے پوچھا "کیا یہی وہ شہر ہے جہاں وہ لڑکی رقص کرتی ہے"۔ روح نے جواب دیا۔ "ممکن ہے وہ اسی شہر میں ہو، چلو اندر چلیں"۔ وہ شہر میں چاروں طرف پھرے لیکن وہ سرائے اور دریا کہیں نہ تھے، ماہی گیر نے کہا "اے روح چل، کیونکہ وہ رقص کرنے والی لڑکیاں یہاں بھی نہیں ہیں"۔ لیکن روح نے جواب دیا "نہیں، نہیں ٹھہر جا — ممکن ہے رات کو راستے میں لیٹرے مل جائیں" ماہی گیر بازار میں راستہ پر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر بعد اُدھر سے ایک تاجر گذرا، اس نے پوچھا۔ "بازار میں کیوں بیٹھے ہو" ماہی گیر نے جواب دیا۔ "نہ یہاں میرا کوئی عزیز ہے نہ کوئی سرائے" تاجر بولا۔ "میرے ساتھ چلو، اور مہمان خانے میں قیام کرو"۔ جب ماہی گیر اسکے گھر پہونچا، تو تاجر نے اسے عمدہ کھانے کھلائے اور نفیس شراب پلائی جب رات زیادہ ہوگئی تو روح نے ماہی گیر کو جگایا اور بولی اٹھ اور تاجر کی خواب گاہ میں جا کر اسے مار ڈال، اور اس کی دولت چھین لے، کیونکہ ہمیں اس کی ضرورت ہے، ماہی گیر اٹھا اور تاجر کی خوابگاہ میں پہونچا۔ دہاں تاجر سو رہا تھا، ایک تلوار اس کے پہلو میں رکھی ہوئی تھی اور بہت سی تھیلیاں اشرفیوں کی وہیں چنی ہوئی تھیں، ماہی گیر نے تلوار کو لینا چاہا تو تاجر جاگ اٹھا اور بولا "کیا نیکی کا عوض یہی ہے کہ احسان کرنے والے کو ذبح کر دینا اچھی بات ہے۔" روح نے ماہی گیر

سے کہا "اس کو ضرر پہونچا، ماہی گیر نے تاجر کو ضرر پہونچائی وہ بے ہوش ہوگیا اور یہ اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر باہر چل دیا، تھوڑی دور جانے کے بعد ماہی گیر کو خیال آیا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا اور بولا " تو نے کیوں مجھ سے سوداگر کے مارنے کو کہا، " روح نے کہا " ذرا صبر کر صبر" ۔ ماہی گیر بولا۔ نہیں، اب میں صبر نہ کرونگا مجھے بتا کہ تو نے مجھ سے کیوں ایسی باتیں کیں اور کیوں مجھے گناہ کرنے پر مجبور کیا۔" روح نے جواب دیا۔ " میں کیا کروں جب تو نے مجھے اپنے پاس سے جدا کر دیا تھا، تو دل نہیں دیا تھا، اس لیئے میں نے دل پاس نہ ہونے کی وجہ سے گناہ کرنا سیکھ لیا اور اس کو پسند کرتی ہوں۔" ماہی گیر نے کہا " مجھے اب تجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور نہ تیرے ساتھ سفر کروں گا۔" یہ کہا اور چاند کی طرف پشت کر کے اپنے سائے کو چاقو سے کاٹ ڈالنا چاہا۔ لیکن وہ سایہ جدا نہ ہوا۔ روح نے کہا " اے ماہی گیر اب ساحرہ کا سحر کام نہیں کر سکتا اس کا اثر جاتا رہا ہے، نہ اب تو مجھے جدا کر سکتا ہے اور نہ میں جا سکتی ہوں۔ زندگی میں صرف ایک بار روح کو جدا کر سکتے ہیں لیکن پھر واپس آجانے کے بعد اس کو رکھنا مجبوری ہے اور یہی اس شخص کا انعام اور اس کی سزا ہے"۔ جب ماہی گیر کو معلوم ہوا کہ اب یہ روح اس کے پاس سے جدا نہیں ہو سکتی، تو وہ زمین پر روتا ہوا گر پڑا۔ اور بے ہوش ہوگیا۔

جب صبح ہوئی تو ماہی گیر اٹھا اور روح سے بولا کہ میں اپنے ہاتھ باندھ لوں گا، تاکہ تیرا کہا نہ کر سکوں۔ اپنے لب بند کر لوں گا کہ تیرا ایک لفظ نہ کہہ سکوں، میں پھر وہیں واپس جاؤں گا جہاں میری محبوبہ رہتی ہے"۔ روح نے اسکو بہت سمجھایا کہ تیری محبوبہ سے زیادہ حسین لڑکیاں دنیا میں موجود ہیں۔ لیکن ماہی گیر نے کوئی جواب نہ دیا اور سمندر کی طرف واپس چلا، جب ساحل پر پہونچا، اس نے دختر آب اپنی محبوبہ کو پکارا لیکن وہ نہ آئی۔ اگرچہ وہ دن بھر اسے پکارتا رہا، روح نے کہا " تو سمجھتا ہے

کہ محبت سے زیادہ مسرت کہیں نہیں میرے ساتھ چل، میں تجھے بتاؤں کہ وادی مسرت کہاں ہے اور وہاں کیا ہوتا ہے"۔ لیکن نوجوان ماہی گیر نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہیں ایک چٹان پر جھونپڑا بنا کر پورا ایک سال بسر کر دیا، لیکن دختر آب نے اس کی آوازوں کی التجاؤں کو نہیں سُنا اور نمودار نہیں ہوئی، روح مسلسل اس کو ترغیب دیتی رہی کہ سمندر کے ساحل سے چلا جائے، لیکن اس نے نہیں سنا ایک سال کے بعد روح نے سوچا کہ میں نے اپنے مالک کو بُری باتوں کی طرف مائل کر کے دیکھ لیا۔ اس کی محبت یقیناً مجھ سے زیادہ قوی ہے۔ اب میں اسے اچھی باتوں کی طرف راغب کروں، شاید وہ میرا ساتھ دے، ماہی گیر سے بولی "میں نے تجھ سے دنیا کی مسرتوں کا ذکر کیا تو نے نہیں سنا۔ اب مجھے اجازت دے کہ دنیا کے درد والم کا ذکر کروں۔ شاید تو اسے سنے" لیکن ماہی گیر نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور بدستور اپنی محبوبہ کو پکارنے میں رات دن مصروف رہا۔ دوسرا سال ختم ہو گیا تو روح نے ایک رات جبکہ ماہی گیر اپنے جھونپڑے میں بیٹھا ہوا تھا کہا "میں نے تجھے بُری باتوں کی طرف مائل کیا۔ تو نے نہیں سنا اچھی باتوں کی ترغیب دی، تو نے پروا نہیں کی۔ تیری محبت مجھ سے زیادہ قوی ہے، اب میں کچھ نہ کہوں گی۔ مگر مجھے اپنے دل کے اندر سما جانے دے تاکہ جیسے میں پہلے تھی ویسی ہی پھر ہو جاؤں"۔ ماہی گیر نے جواب دیا" اچھا سما جا" روح بولی" آہ میں کیونکر اس میں سما جاؤں۔ وہ تو محبت سے معمور ہے اور میرے لئے کہیں جگہ نہیں"۔

اس وقت سمندر سے ماتم کی آواز آئی۔ اس طرح جیسے آبی ہستیاں کسی کے مر جانے پر نوحہ کرتی ہیں۔ ماہی گیر گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور ساحل پر گیا، سیاہ سیاہ لہریں ساحل کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھیں اور کوئی چیز جو چاندی سے زیادہ سپید تھی ان پہ تیر رہی تھی، لہروں نے اس چیز کو ماہی گیر کے قدموں پر ڈال دیا۔ یہ اکی محبوبہ دختر آب

کی بے جان لاش تھی۔ ماہی گیر صدمے سے گر پڑا، اور بے اختیار ہو کر اس کا منھ چومنے لگا اور اپنے سینہ سے لگایا۔ لب سرد تھے، لیکن وہ انھیں چومتا تھا اسکی شیرینی تلخ تھی لیکن وہ چکھتا تھا۔ سمندر کی سیاہ موجیں اٹھ رہی تھیں سپید کف بیتاب تھا، ساحل شور کر رہا تھا۔ گویا دختر آب کی موت پر سارا عالم آب ماتم کر رہا تھا۔ روح نے ماہی گیر سے کہا، "بھاگ چل۔ تجھے کوئی آواز نہ پہونچ جائے"۔ ماہی گیر نے نہیں سنا اور اپنی محبوبہ کی لاش سے مخاطب ہو کر بولا "محبت دانشمندی سے بہتر ہے، دولت سے زیادہ قیمتی ہے اور آسمانی لڑکیوں کے پاؤں سے زیادہ حسین ہے، آگ اسے تباہ نہیں کر سکتی، پانی اسے بہا نہیں لے جا سکتا، میں نے تجھے صبح کو آواز دی، تو نہیں آئی چاند نے تیرا نام منھ سے سنا تو نے کچھ پروا نہیں کی مجھے معلوم ہے تجھ سے میں نے جدا ہو کر میں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ لیکن میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تیری محبت مجھ سے کبھی جدا نہیں ہوئی وہ اب میرے ساتھ ہے، اب کہ تو مر گئی ہے یقیناً میں بھی تیرے ساتھ مر جاؤں گا۔"

سمندر کی موجیں قریب آنے لگیں اور جب ماہی گیر کو معلوم ہوا کہ اس کا وقت قریب ہے تو اس نے اپنے دیوانہ لبوں سے دختر آب کو چوما اور اسکا دل شق ہو گیا، روح کو دل میں جانے کی ایک راہ مل گئی اور اندر داخل ہوئی، لیکن اسوقت جبکہ نوجوان ماہی گیر کو لہروں نے چاروں طرف سے گھیر لیا، اور روح کو پھر گھبرا کر نکل جانا پڑا، صبح کو راہب مع اپنے حوارئین کے ساحل پر پہونچا تو دیکھا کہ نوجوان ماہی گیر اور دختر آب دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے موت کی گہری نیند میں بیہوش پڑے تھے، راہب یہ دیکھ کر برہم ہوا۔ محبت کے اس انجام پر اسکو غصہ آیا بد دعائیں دیں اور حکم دیا کہ یہ دونوں لاشیں کسی ویرانہ میں دفن کر دی جائیں۔

جب تیسرا سال ختم ہو گیا تو ایک دن راہب کلیسا میں پہونچا اور قربان گاہ

کے سامنے کھڑے ہو کر لوگوں کو مخاطب کرنا چاہا اس نے دیکھا کہ قربان گاہ پر بہت سے ایسے پھول منتشر ہیں جو اس پہلے اس کو نظر نہ آتے تھے، ہر شخص ان کو سونگھ کر بیتاب ہوا جاتا تھا، راہب کے دماغ تک بھی ان پھولوں کی نگہت پہونچی اور دل میں وہ اضطراب پیدا ہو گیا جو اس سے قبل انکو کبھی نصیب نہ ہوا تھا،

راہب نے بہت کوشش کی کہ وہ اس ویرانہ کے درخت کو ہمیشہ شاداب اور تر و تازہ رکھے جو کلیسا کی قربان گاہ کے لیئے ایسے عجیب و غریب پھول مہیا کرتا تھا لیکن وہ شجر محبت بے مہر ہاتھوں سے چھو کر مرجھا گیا اور کلیسا کی قربان گاہ پھر ہمیشہ کے لیئے ویسی ہی ویران و بے لطف ہو گئی جیسے پہلے کبھی تھی!

(آسکر وائلڈ)

# دلِ زیرِ سنگ

"ساری کائنات کا سمٹ کر صرف ایک ہستی میں سما جانا" "ایک تنہا ہستی کا پھیل کر، آفاقانہ وسعت اختیار کر لینا۔"

"یہ ہے محبت"

---

"محبت سلام ہے فرشتوں کا تاروں کو"۔

---

"کیسی مغموم ہے وہ روح جو غمزدۂ محبت ہو"۔

---

"کسی ایسی ہستی کا نہ پایا جانا، کہ صرف اسی سے خلائے عالم پُر کیا جا سکتا ہے، کیسا اُداس منظر ہے، کس قدر درست ہے یہ خیال کہ محبوب ہو جانا گویا خدا ہو جانا ہے، ایک شخص یہ خیال کر سکتا کہ خدا محبوب پر رشک کرتا ہے، اگر یہ یقین نہ ہوتا کہ ساری کائنات ضرور روح کے لئے پیدا کی گئی ہے، اور روح صرف محبت کے لیے"۔

---

کسی کے سیاہ بالوں کا پیٹھ پر ہوا سے منتشر ہو جانا، کافی ہے کہ روح کو ہمیشہ کے لیے سُلا دے، ممکن ہے کہ زیرِ نقاب اک ہلکی سی شعاع تبسم روح کو بیداری

دوام میں تبدیل کر دے۔ لیکن مجھے اس کا ہوش نہیں۔"

"خدا کو موجودات عالم چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ موجودات تاریک ہیں دھندلے ہیں، لیکن کسی سے محبت کر لینا ساری کائنات کو شفاف بنا دیتا ہے۔"

---

بعض خیال دعا ہوتے ہیں، زندگی میں کچھ لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اس وقت جسم انسانی خواہ کسی حال و انداز میں ہو، لیکن روح دو زانو ہوتی ہے۔

---

ایک دوسرے سے جدا ہو کر عاشق و معشوق، ہزاروں طریقے تکلیف جدائی کو فریب دینے کے لئے پیدا کر لیتے ہیں، یوں بظاہر وہ نہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ لیکن خط و کتابت کے لیے وہ بے شمار مخفی ذرائع رکھتے ہیں۔ وہ حکم دیتے ہیں طیور کے نغمے کو، پھولوں کی نکہت کو، کلیوں کے تبسم کو، چاند کی روشنی کو، تاروں کی شعاعوں کو یہاں تک، کہ عاشق یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ "اے بہار تو بھی ایک خط ہے جو میں اسے لکھتا ہوں"۔

---

صرف محبت ہی وہ چیز ہے، جس سے ابدیت معمور ہو سکتی ہے، غیر محدود کو پُر کرنے کے لئے غیر فانی چیز کی ضرورت ہے۔

---

محبت ایک جز ہے روح کا۔ روح کی طرح محبت بھی اک شعلۂ الوہیت ہے، روح کی طرح محبت بھی غیر فانی ہے۔ اور ناقابل تجزیہ، وہ ایک نقطۂ آتشیں ہے جو ہمارے اندر پایا جاتا ہے، وہ غیر محدود ہے اور غیر فانی۔ نہ اسے کوئی چیز محدود کر سکتی ہے اور نہ وہ کسی چیز سے بجھ سکتی ہے، ہم اسے اپنے مغز استخواں کے اندر

جلتے ہوئے محسوس کرتے ہیں، اور آسمان کے عمق میں اس کی شعاعوں کو منور۔"

---

اے میری محبت، اے میری پرستش، اے ان دو نقوش کی روشنی جو ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں۔ اے دونوں کی ضیا و جو ایک دوسرے میں سما جاتے ہیں، اے ان دو نگاہوں کی تنویر جو ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہی ہیں تو میرے پاس آئے گی، کیا تو نہ آئے گی۔ اے میری مسرت! وہ تنہائیوں میں ساتھ مل کر چلنا وہ مسرور و منور دنوں کا طلوع! بعض اوقات میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ کبھی کبھی چند ساعتیں فرشتوں کی زندگی سے جدا ہو کر یہاں زمین پر کچھ لوگوں کی قسمتوں میں بھی نفوذ کر جاتی ہیں۔"

---

خدا دو محبت کرنے والے دلوں کی مسرت میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کر سکتا، سوائے اس کے کہ وہ ان کو دوام بخش دے، محبت کی زندگی کے بعد محبت کا دوام یقیناً اک اضافہ ہے۔ لیکن محبت کی شدت میں اس ناقابل بیان لذت کا اضافہ جو محبت روح کو عطا کر چکی ہے۔ خدا سے بھی ناممکن ہے، خدا معموری ہے کائنات کی اور محبت معموری ہے انسان کی۔"

تم ستاروں کو دیکھتے ہو اس لئے کہ وہ منور ہیں اور ناقابل فہم مگر تمہارے پہلو میں ان سے زیادہ نرم روشنی اور ان سے زیادہ عظیم راز موجود ہے۔ عورت۔"

---

ہمارے لیے اس دنیا میں بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جنھیں ہم تنفس کہہ سکتے ہیں، اگر وہ نہ ہوں تو ہمارا دم گھٹ جائے اور ہم مر جائیں، فقدان محبت سے مر جانا بھی کیسا ہیبت مرجانا ہے روح کا تعطل مطلق!

" جب ایک عورت تمھارے سامنے سے گذرتی ہوئی تمھارے اوپر روشنی ڈالتی ہے، تم محبت کرنے لگتے ہو۔ پھر اسوقت تمھارے لیئے صرف ایک شغل رہ جاتا ہے، اس کو سوچنا، کہ وہ بھی تمھیں سوچنے لگے۔

---

" وہ چیز جسے محبت شروع کرتی ہے، صرف خدا ہی سے انجام تک پہنچائی جا سکتی ہے۔"

---

تم اگر پتھر ہو تو سنگ مقناطیس بننے کی کوشش کرو، تم اگر درخت ہو تو لجالو بنو تم انسان ہو تو محبت کرنا سیکھو۔"

---

محبت کے لیئے کوئی چیز کافی نہیں، ہم کو مسرت حاصل ہوتی ہے تو ہم فردوس کی خواہش کرتے ہیں، ہم کو فردوس حاصل ہوتی ہے، تو ہم کونین کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ اے وہ لوگو جو محبت کرتے ہو، سب کچھ محبت ہی میں ہے، اس کے پا لینے میں ذرا فراست سے کام لو۔

محبت میں اک نوع کی طفولیت ہے اور دوسرے جذبات میں چھوٹا پن، پھر شرم ہے اُن جذبات پر جو انسان کو چھوٹا بنا دیں، اور عزت ہے اس جذبہ کے لیئے جو اسے بچہ بنا دیں۔

---

" ایک عجیب و غریب بات! کیا تم اسے جانتے ہو؟ رات کا وقت ہے ایک مبتی ابھی ابھی میرے پاس سے گذری اور سارے اور سارے آسمانوں کو اپنے ساتھ لے گئی۔"

" آہ، ایک ہی مزار میں پہلو بہ پہلو دفن ہونا، ہاتھ کا ہاتھ سے ملا رہنا، اور کبھی کبھی تاریکی میں اک نازک انگلی کا بھینچ دینا میرے دوام کے لئے کافی ہے۔"

---

محبت اک ملکوتی سانس ہے ہوائے فردوس کی۔

---

تم اگر اذیت میں ہو، اس لئے کہ تم محبت کرتے ہو تو اور زیادہ محبت کرو۔ کیونکہ محبت میں مرجانا، محبت کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔"

---

میں نے گلی میں ایک نہایت غریب شخص کو دیکھا، جو کسی سے محبت کرتا تھا۔ اسکی ٹوپی پھٹی ہوئی تھی، اور سارا لباس تار تار، پانی اسکے جوتوں کے اندر سے گزر رہا تھا۔ اور ستارے اسکی روح کے اندر سے

---

" اگر دنیا میں ایک بھی محبت کرنے والا باقی نہ رہے تو آفتاب اپنی حرارت کھو بیٹھے
(وکٹر ہیوگو)

---

# طلوعِ آفتاب سے پہلے

اے اوپر والے آسمان، اے صاف و شفاف آسمان، اے روشنی کے عمیق غار! تجھے دیکھ کر میں آلہانہ جذبات سے کانپنے لگتا ہوں۔

تیری بلندی کی طرف میرا اپنے تئیں اچھال دینا۔ یہ ہے میرا عمق، تیری پاکیزگی میں میرا اپنے تئیں چھپا لینا، یہ ہے میری معصومیت۔ خدا اپنے حسن کو مستور رکھتا ہے اسی طرح تو اپنے ستارے کو چھپائے ہوئے ہے تو کچھ نہیں کہتا کسی طرح تو اپنی فراست گویائی کا اعلان میرے اوپر کرتا ہے۔

بہنے والے متلاطم دریا کے اوپر آج یہ تیرا سکون و سکوت! یہ تیری محبت، یہ تیری حیا، میری بیتاب روح کے لیے بہت انکشافات اپنے اندر نہاں رکھتی ہے۔

اس جال میں اپنے حسن کے اندر چھپا ہوا، تو مجھے بہت حسین نظر آتا ہے۔

اس حال میں تیرا مجھ سے ایک خاموش گفتگو کرنا، میرے لیے عجیب ہنگامہ ہے میں تیری روح کے اس انداز حیا کیونکر فراموش کر سکتا ہوں۔ یہ طلوعِ آفتاب سے قبل تیرا میرے پاس آنا اے دنیا کے تنہا گوشہ گیر!

---

ہم ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کرتے۔ کیونکہ ہمیں بہت کچھ معلوم ہے ہم دونوں خاموش رہتے ہیں۔ اور اپنا عارفانہ تبسم ایک دوسرے کو پہنچایا کرتے ہیں"۔

ہم دونوں نے ساتھ ہی سب کچھ سیکھا اور ساتھ ہی یہ بھی جانا کہ اپنے سے

باہر ہو کر صعود کرنا اپنی ہی طرف پہونچنا ہے۔

میں تنہا پھرا کرتا تھا۔ میری روح کس کی تلاش میں رات بھر پیچ پیچ راستے طے کیا کرتی تھی۔

میں پہاڑوں پر چڑھتا تھا۔ میں کس کی جستجو کیا کرتا تھا، اگر وہ تو نہ تھا؟ ان ابر کے ٹکڑوں میں سے متنفر ہوں، کیونکہ وہ چیز چھپا لیتے ہیں، جو میرے تیرے درمیان مشترکہ ہے ایک ہم آہنگی خاموش! یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آہستہ آہستہ چلنے والے دل میں پس و پیش رکھ کر مذبذب قدموں کے ساتھ سرکنے والے بادل میری اور تیری روحانی برکات کو آپس میں تحلیل ہونے سے روکتے ہیں۔

"جو کسی کے لیئے باعث برکت نہیں وہ کسی کے لیئے بلا ہو جانا سیکھ سکتا ہے" اس صداقت کو میں اپنے ساتھ ہر وقت اسی طرح رکھتا ہوں جس طرح تو اپنے تاروں کو میں ہمیشہ برکت دینے والا رہا ہوں اور اسی لیے میری کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ کسی دن میں اپنے ہاتھوں کو دعا کے لیئے آزاد پائیں۔

میری دعا یہی ہے کہ ہر چیز سے جدا اسی طرح قائم رہوں جیسا تو ہے۔ یہ میرا برکت دینا ہے، جب یہ تعلیم دیتا ہوں کہ "سب چیزوں سے بالاتر اک فلک معصومیت، ایک فلک بیم خوف، اک فلک امکان ہے۔"

"بیم و خوف" یہ قدیم ترین شرافت ہے جو میں نے دنیا کی ہر چیز کو یاد دلایا ہے میں نے یہ آزادی کسی مقصد کے ساتھ بخشی ہے۔"

اس آزادی اور ابدی مسرت کو میں نے سب چیزوں سے بلند رکھا۔ یہ تعلیم دی کہ ان چیزوں کے اندر اور ان چیزوں کے اوپر کوئی تقدیر الٰہی کام نہیں کرتی۔

میں نے اس آزادی کو تقدیر الٰہی کی جگہ دی، جب میں نے یہ تعلیم دی کہ ہر چیز

میں اک چیز ناممکن ہے "تعقل"۔

تھوڑا سا وقوف یقیناً عقل و فراست کا ایک جرثومہ ہے۔ جو ایک ستارہ سے دوسرے ستارہ تک اپنا کام کر رہا ہے، یہ خمیر تمام اشیاء میں شامل ہے، بیوقوفی کی خاطر "عقل" تمام چیزوں سے ملی ہوئی ہے۔

تھوڑی سی فراست بیشک ممکن ہے لیکن یہ مبارک تجربہ میں نے تمام اشیاء سے حاصل کیا ہے کہ وہ امکان کے پیروں پر رقص کرنا" زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اے اوپر والے آسمان، اے پاکیزہ و بلند آسمان! اب میرے لیئے معصومیت لیئے کہ یہاں کوئی تار و پود فراست نہیں ہے اور یہ کہ تو ہی آلہانہ امکانات کے لیئے میرا صحن رقص ہے اور تیری فضا آلہانہ قمار بازی کی کھلی ہوئی بساط لیکن تو شرمایا جاتا ہے؟ کیا میں نے تجھ سے کوئی ایسی بات کہہ دی۔ جو نہ کہنی چاہیئے کیا میں نے تجھے بدعا دی ہے اس حال میں کہ میرا مقصود دعا دینا تھا۔ یا یہ شرم دامنگیر ہے کہ ہم دو یکجا ہیں۔ کیا خاموش رہنے اور چلے جانے کا حکم دیتا ہے؟ کیونکہ اب دن آرہا ہے۔

اب دنیا عمیق ہے، دن کے سامنے ساری باتیں نہیں کی جاسکتیں، اب ہم کو جدا ہونا چاہیئے۔

اب اوپر والے آسمان اے میری مسرت آفتاب نکلنے سے پہلے اور اے میری عبرت و بصیرت آفتاب نکلنے کے بعد۔

(نیٹشے)

# ستی

ارجن سنگھ کا تعلق اک نہایت قدیم راجپوت خاندان سے تھا اور غدر سے پہلے ان کی ریاست بندیلکھنڈ میں ایک خاص امتیاز رکھتی تھی۔ جب ۱۸۵۷ء میں بدامنی پھیلی تو ارجن سنگھ کے باپ دلاور سنگھ نے بھی اس میں کافی حصہ لیا اور ان اکھڑ راجپوتوں کی جماعت سے جو دلاور سنگھ کے نام پر ہر وقت جان دینے کے لیئے آمادہ رہتی تھی، انھوں نے اپنی حدود ریاست کو بہت وسیع کرلیا۔

ایک سال بعد جب ہندوستان کے تمام عناصر اپنی اپنی اصلی حالت پر آگئے۔ اور حکومت نے اپنے دوست دشمن کی فہرست مرتب کرنی شروع کی تو دلاور سنگھ کا نام بھی مخالفین میں لکھا گیا اور ان کی قدیم ریاست کے حدود بھی تنگ کرکے صرف ۲۰۰ گاؤں ان کے لیئے چھوڑ دئے گئے۔ دلاور سنگھ کے لیئے یہ صدمہ نہایت غیر معمولی صدمہ تھا، جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے اور اس کے دوسرے ہی سال ارجن سنگھ اُن کا بیٹا ریاست رام نگر کا مالک ہوگیا۔

ہرچند ریاست رام نگر کے حدود بہت تنگ ہوگئے تھے اور اس لحاظ سے اسکے محاصل بھی کم تھے، لیکن پھر بھی صدیوں کی بنی ہوئی ریاست تھی اور اس کے بگڑنے کے لیئے بھی اک زمانہ درکار تھا جب جوان ارجن سنگھ ایک سال بعد گدی پر بیٹھا تو ساری ریاست میں گویا از سر نو جان پڑگئی اور رام نگر کی گڈھی نے جشن و مسرت کے لیئے تمام وہ طلائی و نقرئی سامان نکال کر باہر رکھدیا، جو پشتوں

سے اس حکمران خاندان کی یادگار چلا آتا تھا۔

گڑھی کے بلند دروازہ پر موسیقی، شہنائیوں کی نرم و شیریں آواز کے ذریعہ سے اپنی مبارکباد پیش کر رہی تھیں، دروازہ کے سامنے سڑک پر دو رویہ سواروں کی صفیں جن کے گھوڑے اپنے زریں ساز و یراق کو دیکھ کر مسرت سے لبریز اور بیقرار نظر آتے تھے، جمی ہوئی تھیں، سواروں کے بانکے صافے، چست پاجامے، چھبی ہوئی چپکنیں، پہلو میں لگی ہوئی آبدار کٹاریں۔ گلے میں حمائل کی ہوئی تلواریں بل کھاتی ہوئی مونچھیں، کانوں سے بندھی ہوئی داڑھیاں اور پھر ان کے وہ کڑے تیور جو اک راجپوت سے کبھی جدا نہیں ہوتے عجیب سماں پیش کر رہے تھے

سواروں سے ذرا پیچھے ہٹ کر ہاتھیوں کی صفیں تھیں جن کے مرصع جھول، زرکار ہودے، صبح کی روشنی میں جگمگا رہے تھے، چاندی چڑھے ہوئے دانت رنگی مستکیں، جن پر جہادت سرخ وردیاں پہنے ہوئے اپنے آنکس چمکا رہے تھے، ماہی مراتب کا جلوس، اس کا طلائی و نقرئی سامان بینڈ والوں کا دستہ، گڑھی کے اندر دروازوں کے سامنے سرداروں کا ہجوم چوبداروں کی صفیں، جوان جوان نہرلیوں کی آمد و رفت، بھاٹوں کی رجز خوانی، غرض یہ تھا وہ جشن جس نے ارجن سنگھ کی تقریب تخت نشینی پر ساری ریاست کو پر رونق بنا رکھا تھا۔

محل کے اندر سنگ مرمر کے ایک چبوترہ پر نہایت قیمتی کارچوب کی مسند بچھی ہوئی ہے، سبز مخمل کا تکیہ جو زریں کام سے بالکل ڈھکا ہوا ہے قرینہ سے کنارے رکھا ہوا ہے اور راجپوت خاندان کی دو نوجوان لڑکیاں ہاتھوں میں چنور لئے کھڑی ہیں، چبوترے کے دونوں طرف رنواس کی عورتیں، طلائی اور نقرئی پیالیوں میں صندل، سیندور، پسی ہوئی ہلدی، چاول لئے کھڑی ہیں تاکہ مہاراجہ کی پیشانی پر تلک لگا کر گدی نشینی کی رسم کو پورا کریں۔

ارجن سنگھ کی شادی ریاست رام نگر کے ایک معزز راجپوت سردار کی لڑکی سے ہو چکی تھی، اور حقیقت یہ ہے کہ ارجن سنگھ جن خوبیوں کا رئیس تھا، انھیں صفات کی رانی بھی اسے ملی تھی اور یہی سبب تھا کہ اگر گڑھی سے باہر جشن و مسرت کا ہنگامہ برپا تھا، تو گڑھی کے اندر بھی رانی سندر تپا کی داد دہش، عالی حوصلگی، فیاضی اور خوش اخلاق نے دھوم مچا رکھی تھی۔

ارجن سنگھ ابھی حمام ہی میں تھا کہ گڑھی کے دروازے پر ایک سوار دوڑا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ راجہ رتن بیر سنگھ کی سواری، جسے جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، قریب آگئی ہے، اس کی خبر پہونچتے ہی اندر سے باہر تک اک ہنگامہ برپا تھا، ایک ہلچل مچ گئی، بینڈ شروع ہو گیا، نفریاں چیخنے لگیں، شہنائیاں زور زور سے بجنے لگیں، نوبت، نقارے، دھونسے بجنے لگے، ہر یاں جلدی جلدی اندر سے باہر باہر سے اندر آنے لگیں، نقیب آوازیں لگا رہے تھے، چوبدار اپنا اپنا عصا چمکا رہے تھے، بھاٹ کبت پڑھ رہے تھے کہ راجہ رتن بیر سنگھ فوج کی سلامی لیتے ہوئے، سرداروں کے استقبال میں اپنے گھوڑے پر سوار پہونچ گئے اور محافے، پالکیاں، فینس، دروازہ پر لگ گئیں، جن سے سنبل گڈھ کی رانیاں اور لڑکیاں اتر اتر کر قلعہ میں داخل ہو گئیں۔

(۲)

دلاور سنگھ نے اپنے بعد تین اولادیں چھوڑی تھیں، ان میں سب سے بڑا بیٹا ارجن سنگھ (ولی عہد) تھا دوسرا رنجور سنگھ جس کی عمر بیس سال کی تھی اور ایک بیٹی شیام کنور جو رنجور سنگھ سے دو سال چھوٹی تھی۔

اگر ارجن سنگھ سے اس کی رعایا کو صرف محبت تھی تو وہ رنجور سنگھ کی پوجا کرتی تھی، کیونکہ ارجن سنگھ نے تمام انتظام اسی کے سپرد کر دیا تھا اور یہ اپنے بھائی کی حد درجہ عظمت

کرتے ہوئے اپنا تمام وقت رعایا کی دلدہی میں صرف کیا کرتا تھا۔ اسی طرح محل کے اندر کا انتظام رانی سندر پتی نے اپنی نند شیام کنور کے سپرد کر دیا تھا، جو بے انتہا ہوشیار منتظم اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔

ریاست سبل گڈھ اور ریاست رام نگر میں بہت ارتباط تھا اور بار ہا ایسا ہوا کہ دونوں ریاستوں نے متفقہ طور پر دشمن کا مقابلہ کیا اور بڑی سے بڑی فوج کا منھ پھیر دیا۔ راجہ رن بیر سنگھ یوں تو بہت سی کنبہ کی لڑکیاں رکھتا تھا لیکن اولاد کی طرف سے بدقسمت تھا اور سات لڑکوں، چار لڑکیوں میں سے صرف ایک لڑکی سوشیلا زندہ رہی جس کی عمر اسوقت اٹھارہ سال کی تھی اور جو اپنی فہم و تمیز، صورت شکل کے لحاظ سے بندیلکھنڈ کے تمام راجپوت خاندانوں میں وہی حکم رکھتی تھی، جیسے کسی چمن میں گلاب کا وہ پھول جو سب سے اونچی ٹہنی پر کھلا ہوا سب سے پہلے اپنی ہی طرف لوگوں کی نگاہ کھینچ لیتا ہے چونکہ ان دونوں خاندانوں میں اک زمانہ سے اتحاد قائم تھا اور عورتوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی اس لیے سوشیلا اور شیام کنور میں بے انتہا ارتباط بڑھ گیا تھا اور مہینہ میں آٹھ دس روز کے لیے ان دونوں کا یکجا ہونا ضروری تھا۔ سبل گڈھ اور رام نگر میں صرف پندرہ کوس کا فاصلہ تھا۔

(۳)

بسنت کا موسم ابھی ختم نہیں ہوا ہے، دلوں کی امنگیں بدستور باقی ہیں، بہار کی دیوی نے ہنوز اپنا سنہرا لباس نہیں اُتارا ہے، کھیتوں کی رونق، باغوں کی شگفتگی ابھی تک قائم ہے، جشن کی دوسری رات کو گلبازی کی رسم رام نگر کے قلعہ میں ادا ہونے والی ہے، پھولوں کا انبار لگا ہوا ہے، محل کے اندر کوٹھوں پر چاندنی میں لڑکیوں اور عورتوں کا ہجوم مصروف نشاط ہے، نیچے شیام کنور اور سوشیلا دونوں انتظام میں مصروف ہیں، فرش، چاندنیاں، قالین، تکیے،

مشعلیں، شمعیں، عطردان، گلاب پاش، بخوردان، تھالیاں، چنگیریاں، گلوریاں، عبیر وگلال باہر اندر بھیج رہی ہیں، جہریاں آجا رہی ہیں، بچے کھیل رہے ہیں، نوجوان لڑکیاں آپس میں ایک دوسرے کو چھیڑ رہی ہیں، ہاتھوں میں پچکاریاں لیئے ایک دوسرے پر رنگ ڈال رہی ہیں۔ اور دوڑ دھوپ سے نازک رخساروں اور پیشانیوں پر جو قطرے پسینہ کے پیدا ہو جاتے ہیں، انھیں ایک طرف گردن جھکا کر نازک انگلی کے خم سے زمین پر گراتی جا رہی ہیں اور کوئی ان موتیوں کو چننے والا موجود نہیں۔

الغرض اسی طرح اندر، باہر ہلچل مچی ہوئی تھی، اک شور و ہنگامہ برپا تھا کہ رنجور سنگھ باہر کے انتظام سے فارغ ہونے کے بعد پشت محل کا چور دروازہ کھول کر جلدی کے خیال سے اندر داخل ہوا تاکہ اپنی بہن شیام کنور سے صبح کے اہتمام کے متعلق مشورہ کرے، وہ سمجھتا تھا کہ نیچے پردہ ہوگا اور اوپر سبل گڈھ کی رنواس ہوگی، عجلت میں اطلاع کرانا بھول گیا، سوشیلا تھک کر اندر دالان میں تخت پر لیٹ گئی تھی، اور ایک طرف کروٹ لے کر آنکھیں بند کیئے ہوئے اپنے دکھے ہوئے اعضاء اور تھکے ہوئے دماغ کو سکون پہونچا رہی تھی کہ شیام کنور نے باہر کے دالان سے آواز دی، "واہ سوشیلا ابھی سے تھک گئیں، ذرا ادھر تو آؤ، دیکھو یہ پوجا کی تھالی ٹھیک ہوگئی یا نہیں"۔

سوشیلا جسے شیام کنور سے بڑی محبت تھی، اٹھی اور عین اسی وقت جبکہ وہ کھڑی ہو کر باہر جانے کے لیئے اک آخری انگڑائی لے رہی تھی، پہلو کے دروازہ سے رنجور سنگھ نکلا اور دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کے مقابل ہو گئیں۔

بجلی نگاہوں کے سامنے کوندتی ہے، لیکن اس طرح نہیں، برقی رو نہایت تیزی سے دوڑ جاتی ہے، لیکن اتنی سرعت کے ساتھ نہیں، دو نگاہوں کا ملنا

جسموں میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے، لیکن اس شدت کے ساتھ نہیں۔ رنجور سنگھ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اک بت کی طرح وہیں دروازے کی چوکھٹ پر جہاں سے وہ نکل رہا تھا کھڑا ہو گیا۔ سوشیلا بدحواس ہو کر باہر نکل گئی اور فرش پر اس طرح گھبرا کر گر پڑی جیسے کوئی ہرنی شکاری کے تعاقب سے نجات پا جانے کے بعد بھی دیر تک اپنی سانس کو درست نہیں کر سکتی۔

شیام کنور یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی اور فوراً ہی اندر کے دالان میں دوڑی ہوئی گئی کہ سوشیلا کے اس طرح گھبرا کر بھاگنے کا سبب معلوم کرے لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ سوشیلا سے پوچھا اس نے کہا "کچھ نہیں، صرف چکر آنے لگا تھا"، شیام کنور کو اس وقت نہ زیادہ غور کرنے کی فرصت تھی نہ اصرار کی۔ اپنے کام میں لگ گئی، اور سوشیلا سے یہ کہہ کر کہ "تم بہت تھک گئی ہو ذرا آرام کرو"۔ باہر کسی اور کام سے چلی گئی۔

رام نگر میں یہ جشن مسلسل سات دن تک قائم رہا اور ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی کہ کس طرح زندگی بسر ہو رہی ہے یا ہر شخص فردوس میں تھا اور اس لئے رنجور سنگھ کے دل میں سوشیلا کے سانولے رنگ نے جس طرح آہستہ آہستہ آگ مشتعل کرنا شروع کی اس کا پتہ کسی کو نہ چلا، یہاں تک کہ شیام کنور بھی کوئی تغیر اپنے بھائی میں محسوس نہ کر سکی۔

آٹھویں دن جب رن بیر سنگھ رخصت ہونے لگا اور رنجور سنگھ کو یقین ہو گیا کہ اب اس کے دل کی ملکہ اس کی روح کی دیوی، جس کی خاموش پرستش وہ اتنے دنوں سے کر رہا تھا زیادہ قیام نہیں کر سکتی تو اس کا دل تڑپ کر رہ گیا اور باوجود اس کے کہ وہ حد سے زیادہ ضابطہ و متین نوجوان تھا بے اختیار ہو کر اپنے بھائی کے پاس گیا اور پوچھا کہ "سبل گڈھ کی رنواس لے کر کون جائے گا"؟

راجہ ارجن سنگھ نے کہا "شمشیر سنگھ حولدار"

رنجور سنگھ:۔ "کیا آپ نے اس پر غور کر لیا ہے کہ اس صورت میں جبکہ سنگل گڈھ کے ٹھاکر نے سبل گڈھ کی دشمنی پر پوری طرح کمر باندھ لی ہے شمشیر سنگھ کی سپردگی میں سب کو روانہ کرنا مناسب ہے؟"

ارجن سنگھ:۔ "ہاں یہ صحیح ہے لیکن رن بیر سنگھ بھی تو موم کا بنا ہوا نہیں ہے۔ اور پھر وہ سبل گڈھ سے یہاں آیا کہ نہیں"۔

رنجور سنگھ:۔ "ممکن ہے کہ دشمن نے اسوقت مناسب نہ سمجھا ہو۔ اور پھر یہ تو میزبان کا فرض ہے کہ وہ مہمان کو حفاظت کے ساتھ اس کے گھر تک پہونچا دے۔ اگر خدانخواستہ راستہ میں مقابلہ ہو گیا تو رن بیر سنگھ کے پچاس سپاہی اور شمشیر سنگھ حولدار کیا کرے گا، میری رائے میں تو کوئی اور انتظام کرنا چاہیئے"۔

ارجن سنگھ:۔ "رنجور تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو، میں نے سارا انتظام تو تمہارے سپرد کیا ہے اور تم اس معاملہ میں مجھ سے اصرار کر رہے ہو، میں نے تمہارے کس انتظام میں دخل دیا ہے کہ اس معمولی سی بات میں مخالفت کروں گا، تم جو چاہو کرو جس کو چاہو روانہ کرو۔"

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ شیام کنور آئی، اور اُس ناز کے ساتھ جو ایک چھوٹی بہن کو اپنے بڑے بھائی پر ہوتا ہے، ارجن سنگھ سے بولی تم لوگوں کو مہمانداری کرنی خوب آتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ رنو اُس کے ساتھ شمشیر سنگھ جا رہا ہے۔ رنجور کیا تمہاری عقل بھی بالکل ماری گئی۔ یوں چاہے کوئی کچھ نہ کہے، لیکن یہ تو سمجھو کہ سوشیلا کے باپ اپنے جی میں کیا کہیں گے۔ بلا کر ہماری بڑی قدر کی۔ رنجور اٹھو اور تم خود سبل گڈھ تک سب کو پہونچا کے آؤ۔"

رنجور نے اپنے بڑے بھائی کے جھک کر پاؤں چھوئے اور باہر چلا گیا۔

(۴)

رن بیر سنگھ:۔ "کنور رنجور سنگھ کل صبح جانے کی اجازت چاہتے ہیں"۔

سوشیلا:۔ "مہاراج، ابھی نہ جانے دیجئے، کم از کم تین دن اور ٹھہرایئے نہیں تو شیام کنور مجھے طعنہ دے گی کہ بھائی کو دو دن بھی نہ ٹھہرایا گیا"۔

رن بیر سنگھ:۔ "میں نے تو اس سے کہا تھا، لیکن وہ نہیں مانتا کچھ گھبرایا ہوا سا ہے، تمھیں کہو شاید مان جائے"۔

رن بیر سنگھ بغیر اس کے کہ وہ سوشیلا کا جواب سنتا، محل کے باہر چلا گیا اور چوبدار کو حکم دیا کہ کنور رنجور سنگھ کو گھر میں بھیجدے سوشیلا رانی (سوشیلا عام طور سے اسی لقب کے ساتھ یاد کی جاتی تھی) یاد کر رہی ہیں۔

برسات کا پہلا چھینٹا، سوکھے ہوتے درخت کے لیئے، ایک چشمہ جاری دن بھر کے تھکے ہوئے پیاسے ہرن کے لیئے، نوید بہار بلبل کے لیئے، آم کا پھول کوئل کے لیئے اس قدر باعث تازگی و مسرت نہیں ہو سکتا، جس قدر ایک محبوب کا پیام کسی عاشق کے لیئے جو غریب کوئی تمنا بھی پیدا نہیں کر سکتا، لیکن رنجور سنگھ یہ پیام سن کر سکتہ میں آگیا، چوبدار کی صورت تکنے لگا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس کے بدن پر ایسا رعشہ طاری ہو گیا جیسے بید کی شاخ کو کوئی ہوا کا جھونکا کپکپا کے چلا جائے۔

وہ متحیر تھا کہ اس پیغام کی صداقت کو کیونکر تسلیم کرے، وہ کس طرح یقین کرے کہ سوشیلا نے اسے بلایا ہے اگر بلایا ہے تو کیوں؟۔

سنبل گڈھ کی گڈھی کے سب سے بالائی حصے میں دالان کے دروازہ پر زرلفت کے پردے پڑے ہوئے ہیں سامنے رنجور سنگھ ایک صندلی چوکی پر اس طرح بیٹھا ہوا ہے، جیسے کسی مجرم کو اسکی سزا کا حکم سنایا جانے والا ہو، اس کو آئے ہوئے

پانچ منٹ سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے کہ اس نے سیکڑوں دنیائیں بنا بنا کر بگاڑ ڈالیں اس نے خدا جانے کیسے کیسے عالیشان قصر تعمیر کر کر کے ڈھائے اور کسے خبر ہے کہ کتنی آرزوؤں کا حشر اسکے سینہ پر برپا ہو کر رہ گیا۔ وہ بائیں ہاتھ پر اپنا مضمحل اور سوگوار سر رکھے ہوئے تلوار کے قبضہ کو جو اسکے سامنے رکھی ہوئی تھی انہماک کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ پردہ کو جنبش ہوئی اور پردہ کو کیا جنبش ہوئی اسکی روح کو جنبش ہوئی، یہ کپکپانے لگا، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے، آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور وہی منظر سامنے آگیا، جب رام نگر میں اس نے اول اول سوشیلا کو دیکھا تھا۔

سوشیلا: "کنور صاحب، آپ کیا ہم لوگوں سے خفا ہیں؟"

اسوقت تک رنجور سنگھ سوچ رہا تھا کہ جب اس سے کوئی سوال کیا جائیگا تو وہ حد درجہ نرمی اور تہذیب کے ساتھ جواب دیگا۔ لیکن جب یہ وقت آیا اور اس کے صبر وضبط کے امتحان کی ساعت آئی تو وہ سخت ناکامیاب ثابت ہوا اور نہایت ہی اضطراب کے ساتھ چونک کر صرف یہ جواب دے سکا کہ "نہیں تو کون کہتا ہے"؟

رنجور سنگھ کی حالت اس قدر عجیب و غریب تھی کہ سوشیلا جو پردہ کی اوٹ سے اسکو دیکھ رہی تھی، ضبط نہ کر سکی اور بے اختیار ہنس پڑی۔ وہ اول ہی دن سمجھ گئی تھی کہ رنجور سنگھ کا دل پوری طرح مجروح ہو چکا ہے لیکن اسوقت وہ یقین کی اس حد تک پہونچ گئی جب تیر چلانے والے کو بھی اپنے شکار پر رحم آجاتا ہے اور اس کی تڑپ سے لذت کے بجائے اسے آزار پہونچنے لگتا ہے۔

رنجور سنگھ نے بھی ہنسی کی اس آواز کو، آبشار کے اس ہلکے سے ترنم کو بلبل کی اس لحن دلنواز کو اور "موج کوثر و تسنیم" کی اس نازک صدا کو سنا اور محسوس کرنے

لگا کہ اب اس کا سینہ جذبات کی فراوانی سے پھٹا جارہا ہے، گریہ بے اختیار اُمڈ اُمڈ کر اسکی آنکھوں میں آرہا ہے اور وہ سوشیلا کے قدموں پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رو دینا چاہتا ہے، لیکن اس نے ضبط کیا۔ وہ ضبط جو سینے سے دھواں بلند کر دیتا ہے جو آنکھوں سے خون ٹپکا دیتا ہے اور جو قلب کو شق کر کے کلیجہ کو منھ تک لے آتا ہے۔

رنجور سنگھ کا سر چکرایا۔ تلوار اسکی آغوش سے نیچے گر گئی، صندلی میں جنبش پیدا ہوئی اور رام نگر کا وہ نوجوان جس نے اسوقت تک تلواروں کی چھاؤں میں پرورش پائی تھی، اک لڑکی کے سامنے اس طرح غش کھا کے گر پڑا جیسے ارنڈ کے خشک درخت کو ہوا کا جھونکا زمین پر گرا جاتا ہے۔

چاہیئے تھا کہ سوشیلا اس منظر کو دیکھ کر گھبرا جاتی چیخ مار کر بھاگ جاتی، لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی یہ تدبیر نہیں ہے وہ سمجھتی تھی کہ جس نے آگ لگائی ہے اسی کو بجھانا بھی پڑے گی۔ اس لیئے محبت کی وہ چنگاری جو اسکے دل میں بھی اسوقت تک سلگ رہی تھی دفعتہً بھڑک اٹھی اور تمام وہ مدارج جو اک حسن کو اپنے نقاب پوش ہونے کی حالت سے لے کر بند حجاب وا کر دینے تک عشق کی پذیرائی میں طے کرنے پڑتے ہیں، سوشیلا نے آن واحد میں طے کر لیئے اور بے اختیار پردہ سے باہر آکر بیہوش رنجور کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اپنے آنچل سے اس کو ہوا دینے لگی۔

سوشیلا ہر چند اک ناتجربہ کار لڑکی تھی، لیکن اسکے پہلو میں ایک راجپوت دل تھا، دماغ میں عزم وارادہ کی قوت تھی اس لیئے جبتک اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، وہ پس و پیش کر رہی تھی کہ رنجور سنگھ کے دل کے ساتھ کیا معاملہ کرے، لیکن جب اس نے ایک بار طے کر لیا کہ وہ صرف رنجور ہی کی ہو کر رہ سکتی ہے، جب اس کی روح ایک بار اس خیال کے سامنے دوزانو ہو گئی، جب وہ اپنے اندر جذبات پرستش محسوس کرنے لگی جو صرف ایک ہندو عورت ہی کے اندر پائے جا سکتے ہیں تو اس نے اپنی

دنیا کو تنگ کرنا شروع کیا، دنیاوی مصالح کو نظر انداز کرنے لگی، ننگ وناموس کے مفہوم کو وہ صرف روحانی نقطۂ نظر سے دیکھنے لگی اور آخر کار اس نے فیصلہ کرلیا کہ میری دنیا صرف رنجور کی محبت ہے اور میری مصلحت وہی ہونی چاہیئے جو اسکی دلدہی اور پرستش سے وابستہ ہے۔

اسوقت تک کہ رنجور سے اس نے سوال نہ کیا تھا وہ شرمیلی تھی، رنجور کی بیقراری و بدحواسی سے لطف اٹھانے کا عزم رکھتی تھی، لیکن جب رنجور نے اپنی بیہوشی سے جو ایک عاشق کا نہایت ہی خاموش کارگر حربہ ہے' جو مقاومت حسن کے لئے محبت کا تنہا ذریعۂ کامیابی ہے، سوشیلا کے سامنے اپنی زندگی کا اک نیا ورق الٹ کر پیش کردیا۔ اور اس نے محبت کی اس دلگداز داستان کو اپنی آنکھوں سے سن لیا تو اس نے سمجھ لیا کہ ہم دونوں کی روحوں کو باہم فطرت نے ملادیا ہے اور اب مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے جسم کو اس سے چھپاؤں جس کے سامنے میری روح عریاں ہو اور اس کا جسم چھونے سے گریز کروں، جس کی روح میرے قلب کی تمام گہرائیوں میں، میرے جسم کے تمام عروق میں خون کے ساتھ ملی ہوئی دوڑ رہی ہے۔

سوشیلا اب اس کے اوپر جھکی ہوئی اسی محبت سے دیکھ رہی ہے' جس طرح وہ اپنے شوہر کو دیکھ سکتی تھی اور اس کی پیشانی کا پسینہ اس طرح احتیاط سے اپنے رومال میں جمع کررہی، جیسے کوئی بکھر جانے والے موتیوں کو ڈھونڈھ کر یکجا کرتا ہے۔

(۵)

رنجور کو سیل گڈھ سے گئے ہوئے کئی ہفتے گذر گئے ہیں اور آخری ملاقات کے بعد جسے محبت کی اولین کامیابی کہنا چاہیئے باہم تبادلۂ خیالات کا موقعہ نہیں ملا۔ پھر چونکہ جذبات مستور حقیقتاً وہ چنگاریاں ہیں جو غیر محسوس طور پر سینہ کے اندر جمع ہوتی

رہتی ہیں۔ اس لیئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ رنجور و سوشیلا دونوں اپنی اپنی جگہ آتش محبت کے شدید ترین التہاب کی پرورش کر رہے تھے اور اس سے بے خبر تھے اس کا انجام کیا ہونا ہے۔

سبل گڈھ میں ہولی کی تیاریاں ہو رہی ہیں، سرمائی لباس تہہ کر کے رکھ دیا گیا ہے، نازک جسموں پر ہلکی ہلکی ساریوں سے ہوا کو پھر چھیڑ چھاڑ کا موقعہ مل گیا ہے، خون رقیق ہو کر رگوں میں دوڑ رہا ہے اور فطرت حسین رخساروں پر عبیر و گلال مل کر اپنی ہولی کھیل چکی ہے۔

چونکہ گذشتہ بسنت کے دربار میں رن بیر سنگھ کو ارجن سنگھ نے دعوت دی تھی اس لیئے ہولی کے موقعہ پر رام نگر کے تمام میزبان سبل گڈھ کے مہمان بننے والے تھے اور ان کی پذیرائی کی تیاریاں ہو رہی تھیں، یوں تو تمام تقریبات میں سوشیلا ہی انتظام کرتی تھی اور اس کا سلیقہ ایسی محفلوں کو کامیاب بنایا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ اس کا انہماک ایک خاص رنگ لیئے ہوئے تھا یعنی کہنے کو تو وہ سارے رام نگر کا اہتمام کر رہی تھی لیکن اس کے پیش نظر صرف ایک ہستی تھی ایک وجود تھا جو ایک لمحہ کے لیئے بھی اپنی تصویر کو اسکی نگاہوں سے جدا نہ کرتا تھا۔

راجہ ارجن سنگھ کے کمرے میں وہ سارا اسباب آرائش فراہم کر رہی تھی اور سوچتی جاتی تھی کہ وہ رنجور کا بھائی ہے، شیام کنور کے قیام گاہ میں سارا سامان راحت پہونچا رہی تھی اور دل ہی دل میں کہتی جاتی تھی کہ یہ رنجور کی بہن ہے، رانی سندر پتی کے لیئے انتظام کرتی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ رنجور کی بھاوج ہے۔ غرض وہ رام نگر کے ایک ایک سردار کے مہمان کا اہتمام کر رہی تھی اور خوش تھی، کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس سرزمین سے وابستہ تھا جہاں رنجور سانس لیتا ہے۔

چونکہ مہمانوں کی آمد میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا اس لیئے سوشیلا

حد درجہ منہمک نظر آتی تھی اور اسکے ساتھ اسکی خالہ زاد بہن تارا بھی جو سبل گڈھ کے ایک غریب سردار کی لڑکی تھی کام میں مصروف تھی، تارا، اور سوشیلا دونوں ایک ہی دن پیدا ہوئیں اور صورتاً اس قدر مشابہ تھیں، کہ اگر سوشیلا اپنے ملبوس اور زیور کے سبب سے وجہ امتیاز نہ رکھتی تو تارا کو سوشیلا سمجھ لینا کچھ دشوار نہ تھا۔

تارا نہ صرف اپنی صورت کے لحاظ سے اپنے سورج بنسی خاندان کے لئے مایۂ ناز تھی بلکہ اپنی بصیرت کے اعتبار سے وہ صحیح معنی میں شاہانہ ادائیں رکھتی تھی اور محبت کرنا تو گویا اس کا خمیر تھا، لطف و رافت اسکی فطرت تھی، اور ہمدردی و دلجوئی اسکی طبیعت ثانیہ۔

باوجود اسکے کہ وہ غریب تھی لیکن گاؤں میں ہر آزاد رسیدہ لڑکی کو اسکے ہاں پناہ مل جاتی اور باوصف اسکے کہ وہ بہت کمسن تھی لیکن محلہ کا ہر جھگڑا اسی کے مشورہ سے طے ہوتا تھا، سوشیلا کو اسکے ساتھ حد درجہ محبت تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح اسکو دنیاوی افکار کی طرف سے مطمئن دیکھے، لیکن سوشیلا کا خالو راجہ رتن سنگھ کا ہم زلف پرانی وضع کا راجپوت تھا اور وہ کسی طرح کی امداد قبول نہ کرتا تھا۔

مختلف مقامات سے تارا کی شادی کے پیغام آئے لیکن اسکے باپ نے کسی کو منظور نہ کیا، اور کوئی نہ کوئی نقص پیدا کر کے سب کو رد کر دیا۔

سوشیلا چاہتی تھی کہ کسی طرح اسکی شادی ہو جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسکی نگاہ میں بھی کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے وہ تارا کے لئے موزوں سمجھتی۔

(۶)

ہولی کا مخصوص دن اپنے تمام ہنگاموں، مستیوں، رنگینیوں، اور مسرتوں کے

ساتھ آگیا ہے، اسبل گڈھ کی گڈھی میں اندر باہر ہر جگہ چہل پہل نظر آرہی ہے جا بجا گانا بجانا ہو رہا ہے سوشیلا انتظام میں مصروف ہے اور موقعہ کی منتظر کہ کسی طرح رنجور سے تنہائی میں مل سکے۔

شام ہوگئی، فانوس روشن کئے گئے، شامیانہ کے نیچے سپید چاندنی پر چاروں طرف تکیئے رکھے گئے اور سرداروں کی آمد شروع ہوگئی۔

رنجور تنہا اپنے کمرہ میں کھویا ہوا سوچ رہا تھا کہ کس طرح سوشیلا کو دیکھ سکے کہ ایک خادمہ آئی اور پرچہ دیکر چلی گئی، سوشیلا نے ٹھیک دس بجے رات کو اس سے ملنے کا وقت مقرر کیا تھا اور وعدہ گاہ تک پہونچنے کے تمام ذرائع ظاہر کر دئے تھے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دو گھنٹے رنجور نے کس اضطراب میں بسر کئے اور کس برہمی سے وہ وقت کی سست رفتاری پر ملامت کر رہا تھا۔ آخر کار وہ ایک جگہ نہ بیٹھ سکا اور اس نے ارادہ کیا کہ یہ وقت باغ میں صرف کرے اور وہیں سے بالا بالا سوشیلا سے ملنے چلا جائے اس طرح ٹھیک دس بجے سوشیلا اپنے کمرہ میں رنجور کی منتظر تھی کہ راجہ ون بیر سنگھ نے اسے کسی ضروری کام سے بلایا۔

اب سوشیلا کے لئے اسکے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ رنجور سنگھ کو آنے سے منع کر دے چنانچہ اس نے فوراً ایک دوسرا خط بھیجا اور تارا کو ہدایت کر دی کہ وہ اسکے کمرہ سے باہر نہ جائے کیونکہ سامان پھیلا ہوا تھا اور وہ اس قدر جلد ان کو محفوظ نہ کر سکتی تھی۔

خادمہ رنجور کے کمرہ میں گئی اور وہاں اسے نہ پاکر واپس آئی، ادھر تارا سوشیلا کے جانے کے بعد دروازہ بند کرنے کے خیال سے آگے بڑھی اور عین

اس وقت جبکہ اس نے چوکھٹ پر اپنا پہلا قدم رکھا رنجور آ گیا اور تارا کو سوشیلا سمجھ کر بے اختیارانہ طور پر اپنی آغوش کھول کر آگے بڑھا۔

تارا، جس نے اس سے قبل رنجور کو کبھی نہ دیکھا تھا متحیر ہو گئی اور فطری حیا سے مجبور ہو کر پیچھے ہٹی لیکن چونکہ اس ایک لمحہ میں فطرت نے فسانہ کا پلاٹ حد درجہ سرعت دتکمیل کے ساتھ بدل دیا اس لیئے تارا کا پیچھے ہٹنا بالکل ایسا تھا جیسے لوہے کو زبردستی مقناطیس سے دور کیا جانا۔

رنجور نے جب روشنی میں تارا کا چہرہ غور سے دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ کوئی غلطی ہو گئی ہے اور فوراً گھبرا کر باہر چلا گیا۔ اس طرف تارا نے خدا جانے کیا سمجھا اور پریشان ہو کر دوسرے دروازہ سے باہر نکل گئی۔

(۷)

رام نگر کے مہمان سیل گڈھ سے رخصت ہو چکے ہیں اور سوشیلا تارا کے سرہانے جو نہایت شدید تپ میں مبتلا ہو گئی ہے اور اب اس وقت کچھ حالت سکون میں ہے بیٹھی ہوئی ہے۔

سوشیلا: "ہاں تارا تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی تھیں؟"

تارا: "کچھ نہیں، یہی کہتی تھی کہ نہ جانے رام نگر سے کتنے آدمی آئے تھے!"

سوشیلا: "معقول، یہ تو ایسی بات نہ تھی کہ تم اسکے لیئے تنہائی چاہتیں، دیکھو مجھ سے صاف صاف کہو جو تم کہنا چاہتی ہو، میں کبھی نہ مانوں گی!"

سوشیلا کو معلوم نہ تھا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے کیونکہ اسے دوسرے دن رنجور سے سارا حال معلوم ہو گیا تھا۔ لیکن وہ تارا سے اس لئے دریافت کرنا چاہتی تھی کہ اسکے خیالات معلوم کرے اور اگر وہ کچھ مشتبہ ہو گئی ہے تو اپنے رنجور کے افسانہ محبت کو اسکے سامنے دہرا دے۔

اسے کیا خبر تھی کہ تارا اس سے زیادہ زخمی ہو چکی ہے اور رنجور کا حسن شباب اس کے دل میں ایک مستقل آزار ہو کر رہ گیا ہے۔

سوشیلا: "تارا میں اسی وقت تم سے پوچھوں گی اور بتانا پڑے گا، میں تم سے ضد کروں گی اور مجھے معلوم ہے کہ تم میری ضد پوری کرنے پر مجبور ہو۔"

تارا: "اچھا تم کسی سے کہو گی تو نہیں۔"

سوشیلا: "کسی سے نہیں۔"

تارا: "تو اچھا یہ بتاؤ کہ ارجن سنگھ کے بھائی نے مجھے کہاں دیکھ لیا اور وہ کیونکر اس قدر جسارت کر سکے کہ ہولی کے دن شام کو میرے سامنے چلے آئے۔"

"میں یقیناً خطاوار ہوں کہ تم سے اس وقت تک ذکر نہیں کیا سوشیلا میں تم سے کہتے ہوئے ڈرتی ہوں اور جانتی ہوں کہ تم مجھے بے غیرت، بے حیا اور خدا جانے کیا کیا کہو گی لیکن میں مجبور ہوں اور باوجود کوشش کے میں اس یقین کو اپنے دل سے جدا نہیں کر سکتی کہ میری موت بہت قریب ہے کیونکہ میرا آزار اس غریب و مفلس شخص کا سا مسموم ہو جاتا ہے جو کسی تریاق کو مہیا نہیں کر سکتا۔"

سوشیلا، جس کے ذہن میں یہ بات بھی نہ تھی کہ وہ تارا سے یہ بیان سنے گی تھوڑی دیر کے لئے ایسی ہو گئی، جیسے کوئی پاگل ہو، اس نے نہایت کوشش سے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولی "تارا کیا ایک ہی نگاہ میں رنجور کے ساتھ تمھیں اس قدر محبت ہو گئی اور ہاں یہ تم نے کیا کہا کہ تمھیں انھوں نے کہاں دیکھا مگر نہیں تمھارا خیال صحیح ہے اگر دیکھا نہ ہوتا اور دیکھنے کے بعد وہ تم پر فریفتہ نہ ہو جاتے تو کبھی ایسی جسارت نہ کرتے۔ لیکن تم نے غلطی کی اگر مجھے پہلے معلوم ہو جاتا تو میں کسی تدبیر سے اور زیادہ یقین کے ساتھ معلوم کرتی کہ انھیں تمھارے ساتھ کس قدر الفت ہے۔"

سوشیلا یہ کہتی جاتی تھی اور اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا لیکن صورت حال ایسی نہ تھی کہ وہ تارا سے صحیح صحیح واقعہ بیان کر دیتی اس لئے مجبور تھی، اسکی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا جواب دے اور رنجور کی محبت کیونکر تارا کے دل سے محو کرے۔

(۸)

تارا کی علالت کا پورا سال گذر چکا ہے اور اسکی بیماری جو حقیقتاً آزار محبت تھی، اور آزار بھی اس محبت کا جو آغاز و انجام سے بے خبر، اولین نگاہ میں تمام مدارج طے کر جاتی ہے، خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ تپ بظاہر مفارقت کر چکی ہے۔ درد سر میں بھی اتنی کمی نظر آتی ہے کہ کبھی کبھی اس کی حسین پیشانی سے صندل جدا ہو جاتا ہے غذا سے بھی اتنا تنفر نہیں رہا لیکن اس کی حالت کو دیکھ کر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ اچھی ہے۔ جب اس سے کوئی حال پوچھتا ہے، تو اک خفیف سی جنبش ابرو اور نہایت ہلکی سی چین پیشانی کے ساتھ کہہ دیتی ہے کہ "اچھی ہوں" لیکن اس کی آواز میں اک ایسا اضمحلال اس کے لب و لہجہ میں ایسا تاسف شامل ہوتا ہے کہ دوبارہ اس سے سوال کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوتی۔

جن لڑکیوں سے وہ زیادہ بے تکلف ہے، ان کے سامنے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی "کہ بیمار تو نہیں ہوں لیکن اچھی بھی نہیں ہوں"، لیکن سوشیلا کے سامنے سے کہدینا پڑتا ہے کہ "میرا اچھا محال ہے"۔

آغاز گرما کی شام ہے، آفتاب غروب ہو چکا ہے اور چاند افق سے بلند ہو کر نمودار ہو رہا ہے سوشیلا اور تارا دونوں کوٹھی کے صحن پر چاند کی طرف منھ کئے ہوئے خاموش بیٹھی ہیں۔

تارا:۔" دیکھو سوشیلا، چاند کیسا نظر آ رہا ہے، جیسے کسی عورت کا سہاگ لٹ جائے

سوشیلا:۔" تارا، تم اسے نہ دیکھو، اسکی روشنی میں بڑا سوگ ہوتا ہے۔ لوگ

چاندنی راتوں کی تمنا کرتے ہیں، اور میں اس خیال سے کانپ اٹھتی ہوں"۔

تارا:۔" سوشیلا سچ کہتی ہو، لیکن مجھے تو اس پورنماشی چاند سے بڑی محبت ہے، تمھیں یاد ہے نہ، یہی تاریخ تھی، جب ....."

سوشیلا ۔" پھر تم نے وہی ذکر کیا، تارا، رحم کرو، اپنے اوپر نہ سہی، میرے اوپر مجھ پر نہ سہی اس پر جس سے تم محبت کرتی اور جس کی تم پجاری ہو۔"

تارا" ہاں، سچ ہے، لوگوں کو معلوم ہو گیا، تو انھیں لوگ کیا کہیں گے؟ ہائے کسی سے محبت کر کے مر جانا بھی اس دنیا میں اب دشوار ہو گیا ہے"۔

تارا کا دل یہ کہہ کر بھر آیا، اس نے سر جھکا لیا اور ساری کے دامن سے فوراً آنسو پونچھ کر پھر خاموش ہو گئی گویا وہ سمجھتی تھی کہ ایک غریب کا امیر کی محبت میں زیادہ اشکبار ہونا بھی روا نہیں، کیونکہ رونا شاید ایک قسم کا حق ثابت کرنا ہے، اپنے تئیں محبت کیے جانے کا اہل ظاہر کرنا ہے اور تارا کبھی اس کی تمنا بھی نہ کر سکتی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ رنجور راجہ کا بھائی اور انتظام کے لحاظ سے پوری ریاست کا مالک ہے اور وہ، خود اپنی حالت سے بھی خوب واقف تھی کہ عین اس وقت جبکہ سبل گڈھ کے ادنیٰ سرداروں کی لڑکیاں اپنی ہمجولیوں کو کپڑے تقسیم کیا کرتی تھیں وہ گھر میں بیٹھی ہوئی اپنی ساری کو خود ہی دھویا کرتی تھی۔

اگر تارا کا باپ اس درجہ غیر تمند تھا کہ وہ راجہ سبل گڈھ کے پاس جانا اور دستِ سوال دراز کرنا اپنے لیئے عار سمجھتا تھا تو اسی کے ساتھ تارا کی غیرت کا بھی یہ عالم تھا کہ باوجود حد درجہ اصرار کے وہ سوشیلا کا ادنیٰ سا احسان بھی گوارا نہ کرتی تھی اور اسکی یہی ادا تھی جس نے سوشیلا کو اسکی طرف سے حد درجہ دردمند بنا رکھا تھا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد تارا بولی" سوشیلا اب جاؤ کہاں تک تم مجھ غمزدہ

کا ساتھ دو گی، میں تم سے کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ میرے پاس بہت کم آیا کرو۔ تمھیں دیکھ کر میرا جی اور بگڑتا ہے، تمھاری ہمدردی مجھے اور تباہ کئے دیتی ہے۔ سوشیلا، مجھ سے محبت چھوڑ دو، میرے لیئے اپنا دل نہ دکھاؤ۔ چند دن بعد جس سے تم ہمیشہ کے لیئے جدا ہو جانے والی ہو۔ اس لیئے چند دن قبل ہی اگر تم جدا ہو گئیں تو کیا میں تم پر کوئی الزام رکھوں گی"۔ اتنا کہہ کر اسکی آواز پھر بند ہو گئی اور سوشیلا جو ایک سال سے تارا کی اس حالت پر دل دکھا رہی تھی سخت بیقرار ہو گئی، اسے تارا سے محبت تھی اور ایسی محبت کہ اس کا اندازہ وہ خود نہیں کر سکتی تھی، لیکن وہ اس وقت کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی کہ اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے۔

سوشیلا، سمجھتی تھی کہ حقیقت حال نہ تارا سے کہی جا سکتی ہے اور نہ رنجور سے ممکن ہے کہ تارا یہ معلوم کرنے کے بعد کہ تجھے بھی رنجور سے اتنی ہی محبت ہے جتنی اس کو جانبر نہ ہو سکے اور رنجور یہ سن کر کہ تارا، اس پر فریفتہ ہے، کوئی نازیبا خیال اس کی طرف سے دل میں پیدا کرے۔ اس کے ساتھ جب وہ تارا کی حالت کو دیکھتی تھی تو بیتاب ہو جاتی تھی۔ وہ اس کا ہر وقت سوگ، وہ اس کا ہر دم اندر ہی اندر سلگنا، وہ اس کی محبت کی آگ میں ہر وقت شمع کی طرح جل کر گھلتے رہنا۔ ایک ایسا منظر تھا کہ سوشیلا کو اکثر اوقات اپنی محبت کی طرف سے دھوکا ہو جاتا تھا اور وہ سمجھنے لگتی تھی کہ محبت تو حقیقتاً تارا کو ہے اور وہی رنجور کے قابل ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں پہونچ کر پھر اس کا قطری نسوانی جذبہ خیال کو آگے بڑھنے سے روک لیتا تھا اور وہ دم بخود ہو جاتی تھی۔

اسے یقین تھا کہ اگر چند دن یہی حالت رہی تو تارا کا جان دیدینا یقینی ہے اور پھر میں کیوں کر زندگی بسر کر سکتی ہوں، اگر رنجور میرا ہو بھی گیا (جس کی ابھی کوئی قوی امید نہیں)، تو کیا میں خوش رہ سکوں گی، کیا تارا کی روح مجھے ملامت نہ

کرے گی، کیا میری نیندیں اس خیال سے مضطرب نہ ہوں گی۔ سوشیلا دیر تک یہ سوچتی رہی، اور پھر تارا اس سے رخصت ہو کر گھر چلی گئی۔

گذشتہ واقعات پر دو مہینے اور گذر گئے ہیں۔ سوشیلا اس زمانہ میں کامل غور کے بعد ایک فیصلہ کر چکی ہے، تارا فرطِ ضعف سے صاحبِ فراش ہو گئی ہے، اور اب علاوہ سوشیلا کے خاندان کے لوگوں کو بھی معلوم ہو گیا ہے کہ تارا کی بیماری کیا ہے لیکن اسکا علم سب کو نہیں کہ یہ آزار اس نے کہاں اور کب مول لیا۔

اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں، سوشیلا، رنجور سے تین مرتبہ مختلف مقامات پر مل چکی ہے اور ہر ہر مرتبہ اسے پیامِ نکاح دینے سے روک دیتی ہے۔ تارا کی علالت حال رنجور کو بھی معلوم ہو چکا ہے، اور سوشیلا کی معیت میں اس کے ساتھ حد درجہ اظہار ہمدردی کیا کرتا ہے۔

ایک رات جب سوشیلا تارا کے پاس سے حد درجہ ملول و مضمحل واپس آئی تو سیدھی اپنے باپ کے پاس گئی، اور وہاں سے جس وقت کامل دو گھنٹے کے بعد واپس آئی تو پایۂ گاہ کے داروغہ کو بلا کر حکم دیا کہ صبح میں رام نگر جاؤں گی، اور فلاں فلاں سردار ساتھ ہوں گے سواری کا انتظام کر لیا جائے۔

(۹)

رنجور۔ "سوشیلا! خیر تو ہے، یہ آج تم کیسی ہو رہی ہو۔ کیا بات ہے؟"

سوشیلا: "خیر نہیں ہے کیونکہ آج میں تمھاری محبت کا امتحان کرنے آئی ہوں اور اگر خدانخواستہ تم کامیاب نہ ہوئے تو پھر خیر کیسی؟"

رنجور جس نے اس سے قبل سوشیلا کے یہ تیور کبھی نہیں دیکھے تھے، گھبرا گیا، اور ایک

منٹ تک اس کی گفتگو کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

سوشیلا:۔ "کیوں خاموش کیسے ہوگئے۔ کیا میں سمجھ لوں کہ امتحان کے لئے آمادہ نہیں ہو۔"

رنجور:۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھارا امتحان سے کیا مقصد ہے، اور تمھیں اس کی کیا ضرورت پڑی۔ جبکہ تمھیں یقین ہونا چاہیئے کہ رنجور سوشیلا کے لیئے جان تک دینے سے احتراز نہیں کرسکتا۔ سوشیلا" رنجور، یہ تم نے کیا کہا۔ میری رائے میں جان دینے سے زیادہ آسان بات اور کوئی نہیں اس لیئے میں تو اس سے زیادہ کی توقع تم سے رکھتی ہوں۔"

رنجور:۔ "سوشیلا تم یقین کرو کہ میں تمھیں کسی توقع میں شرمندہ نہ ہونے دوں گا دنیا میں بڑے سے بڑا گناہ اور سخت سے سخت ریاضت ایسی نہیں جس کو میں تمھارے لیئے اختیار نہ کرسکتا ہوں کہو۔ اور اس اطمینان کے ساتھ میں نے اسے منظور کرلیا۔

سوشیلا:۔ "دیکھو رنجور، پھر اچھی طرح غور کرلو، لیکن ایسا نہ ہو کہ سننے کے بعد تم مکر جاؤ، یا منظور کرو بھی تو بددلی کے ساتھ۔

رنجور:۔ "میں غور کرچکا، زیادہ دیر کرکے میرے ارادہ کے استحکام کو مضمحل نہ کرو۔"

سوشیلا:۔ "اچھا تو سنو کہ میں تمھارے سامنے ایک ایسی التجا کرتی ہوں جس پر میری زندگی کا انحصار ہے اور وہ یہ ہے کہ تم تارا سے شادی کرکے اسکی اور میری دونوں کی جان بچالو۔" رنجور، جس کے خیال میں بھی کبھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ سوشیلا ایسی عجیب و غریب التجا اس کے سامنے پیش کرے گی، ایسا محسوس کرنے لگا کہ شاید وہ اس عالم میں نہیں ہے اور اس کی روح جسم سے جدا ہوجانا

چاہتی ہے اس کے چہرہ کا رنگ سفید ہو گیا، اس کے اعضاد بے جان سے ہو گئے، دماغ چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، اور قوت گویائی محو ہو گئی۔

سوشیلا سمجھتی تھی کہ اس فرمائش کا اثر یہی ہونا ہے، اسے خوب معلوم تھا کہ رنجور کے لیئے جان دیدینا اس سے آسان ہوگا کہ وہ محبت سے باز آجائے، لیکن وہ کامل غور کے بعد اک عزم کر چکی تھی، اس حق پرورش کو ادا کرنا چاہتی تھی جو تارا کی ماں! اور اس کی خالہ کی طرف سے اس پر عائد ہوتا تھا۔ اس نے یقین کر لیا تھا کہ تارا رنجور سے بہ نسبت اس کے زیادہ محبت کرتی ہے اور اس لیئے وہی مستحق بھی ہے، رہا رنجور کا مائل ہونا، سو اسے یقین تھا کہ تارا الیسی معمولی حسن وجمال الیسی معمولی تہذیب وسلیقہ کی لڑکی نہیں ہے، جو عرصہ تک رنجور کو مفتوح کرنے میں ناکامیاب رہے گی اور اپنے متعلق وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب شادی نہیں کریگی، اور اپنی ساری عمر دوشیزگی کے اس عالم بیوگی میں بسر کردے گی جو اکثر راجپوت خاندان کی لڑکیوں کو نہایت صبر وسکون کے ساتھ گزار دینا پڑتا ہے۔

(۱۰)

تارا کے مکان پر آج غیر معمولی ہجوم ہے، لوگ اندر باہر آجا رہے ہیں ہر شخص کے چہرہ پر تشویش کے آثار نمودار ہیں، شمشیر سنگھ، تارا کا باپ، افسردہ و مغموم ڈیوڑھی پر بیٹھا ہوا کبھی کبھی آنے جانے والوں سے پوچھ لیتا ہے کہ "کیا حال ہے" اور پھر کوئی تسلی بخش جواب نہ پاکر زیادہ گہرے غم میں ڈوب جاتا ہے۔ آج صبح سے تارا کی حالت نہایت نازک ہے غش پہ غش آرہے ہیں پسینہ خشک نہیں ہوتا۔ اختلاج کا یہ عالم ہے کہ پاس بیٹھنے والے اس کے دل کی دھڑکن کو اچھی طرح سن سکتے ہیں۔ نبضیں قریب قریب ساقط ہو چکی ہیں، آنکھیں بند ہیں، زبان خشک ہو کر تالو سے لگ گئی ہے اور اگر کبھی کوئی آواز اس کے منہ سے نکلتی ہے تو وہ سوشیلا کا

نام ہوتا ہے جس کا انتظار سب کو نہایت شدید ہے۔

سوشیلا کے باپ نے ایک سوار دوڑا دیا ہے اور راستہ میں ڈاک بٹھا دی ہے تاکہ ہر ممکن سرعت کے ساتھ وہ آخری مرتبہ اور تارا کو دیکھ لے۔

منٹ پر منٹ گھنٹوں کی رفتار سے گذرتے جا رہے تھے، راہ دیکھتے دیکھتے لوگ تھک چلے تھے اور تارا آخری غش میں تبدیل ہو جانا چاہتی تھی کہ دفعتہً سوشیلا کی آمد کی خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی اور خدا جانے کیوں ہر شخص مطمئن نظر آنے لگا۔

سوشیلا گھبراتی ہوئی فینس سے اتری، اور سب سے پہلے اس نے اپنی نگاہوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کہیں وہ بعد از وقت تو نہیں آئی، لیکن جب اسے اطمینان ہو گیا تو وہ ڈیوڑھی میں اپنے خالو کو سلام کرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی اور باوجود اس کے کہ جذبات شدید گریہ میں تبدیل ہو جانا چاہتے تھے لیکن اس نے بہت ضبط کیا اور سب سے پہلے تمام عورتوں کو ہاتھ کے اشارہ سے باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ جب اسکی تعمیل ہو گئی تو وہ آہستہ آہستہ تارا کے پلنگ کی طرف بڑھی جہاں وہ بیہوش پڑی ہوئی تھی اور پیشانی پر پسینہ کے قطرے چمک رہے تھے۔

یہ نیچے فرش پر بیٹھ گئی، اور اپنا ہاتھ تارا کے سر کے نیچے رکھ کر اس کو آواز دی لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت ایک مجسمہ کی طرح پڑی ہوئی تھی، اس نے نبض دیکھی تو وہ بھی غیر محسوس تھی۔ یہ اپنا منھ اسکے کان کے پاس لے گئی اور آہستگی سے بولی۔ "تارا تارا دیکھو میں آ گئی"۔ لیکن وہ ہنوز غافل تھی۔ اس نے پھر کوشش کی اور کہا۔ "تارا آنکھیں کھولو، میں تمھارے لئے رنجور کا پیام لائی ہوں۔" نسیم غنچۂ ناشگفتہ کے ساتھ، مینہ سوکھی ہوئی کھیتی کے ساتھ اور تریاق اک مسموم ہستی کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتا جو اسوقت رنجور کے لفظ نے تارا کے ساتھ کیا۔

اس نے اس پیارے نام کو سنتے ہی اور سوشیلا کو سامنے دیکھ کر، اپنی آغوش

کھول دی، سوشیلا، جو اس وقت تک ضبط کئے ہوئے تھی، اب بے اختیار ہو گئی اور اس سے لپٹ کر رونا چاہتی تھی کہ پھر اسے کچھ خیال ہوا اور ضبط سے کام لیکر اس نے اپنے چہرہ پر تبسم پیدا کیا، اور بولی "تارا کیا حال ہے۔"

تارا:۔ "تم کب آئیں، میں نے اس وقت ایک عجیب خواب دیکھا، گویا میں سو رہی ہوں اور کوئی مجھے جگا رہا ہے، کس کا نام لے کر جگا رہا ہے" تارا یہ بیان کر رہی تھی، اور مخفی تبسم اس کی جلد کے نیچے دوڑ رہا تھا لیکن سوشیلا اس سے زیادہ مسرور تھی۔ ایسا محسوس کر رہی تھی گویا آج وہ کائنات فتح کر کے بیٹھی ہے۔

سوشیلا:۔ "ہاں پھر کیا دیکھا۔"

تارا:۔ "کچھ نہیں، آنکھ کھل گئی تو دیکھا تم ہو۔"

سوشیلا:۔ "تارا تمھارا یہ خواب میں ہی لے کر آئی تھی، اور میں ہی تمھیں رنجور کی طرف سے جگا رہی تھی، کیونکہ مجھے ان کا ایک پیام تم سے کہنا ہے۔"

وہی تارا جو دو منٹ قبل کروٹ نہ لے سکتی تھی، فرط ضعف سے ہاتھ کو جنبش نہ دے سکتی تھی، بے اختیار اپنی قوت سے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی، خون رگوں میں دوڑنے لگا، چہرہ کے بلو میں ایک ہلکا سا رنگ آگیا، اور فرط حیرت سے سوشیلا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر رہ گئی۔

سوشیلا اس کی حالت کو دیکھ کر ڈر گئی کہ مبادا اگر ردعمل سخت ہوا تو پھر اس کا جانبر ہونا دشوار ہو جائے گا اور اس لیے اس کی مسرت میں ذرا تلخی پیدا کرنے کے لیے وہ مصنوعی برہمی اپنے چہرہ پر پیدا کر کے بولی "میں تو سمجھتی تھی کہ تم بڑی عقلمند ہو، لیکن میرا خیال غلط نکلا تم اس قدر گھبرائی کیوں جاتی ہو، کیا رنجور کوئی دیوتا ہے جس کا پیام انسان کو بے اختیار بنا دے وہ بھی اک انسان ہے اور شاید تم سے اچھا

انسان نہیں، پھر اس میں تعجب کی کیا بات، ذرا ہوش میں آؤ، اپنے کو سنبھالو، تو میں کہوں، ورنہ میں جاتی ہوں۔"

تارا، یہ سن کر ذرا سنبھلی، اور اپنی بے اختیاری پر معذرت کرتی ہوئی تکیہ کے سہارے سے خاموش بیٹھ گئی۔ اب سوشیلا اٹھی اور اسکے برابر بیٹھ کر اپنے رومال سے ہوا دینے لگی اور اپنے پندار میں اس نے نہایت رفتہ رفتہ یہ جان بخش وجاں نواز خبر اسے سنائی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب بھی سوشیلا کو اسکی محبت و حالت کا پورا اندازہ نہ تھا ورنہ وہ شاید اسکی جسارت نہ کرتی، کیونکہ جس وقت اس نے اپنا آخری جملہ ختم کیا کہ" اگلے ہفتہ یہاں بارات آجائے گی" تو تارا پھر بیہوش تھی۔ اور سر سے پاؤں تک اک لرزش اس کے بدن پر طاری تھی۔

شام سے صبح اور صبح سے شام ہوگئی، لیکن تارا باوجود تمام کوششوں کے ہوش میں نہ آسکی، سنبل گڈھ کے تمام وید موجود تھے اور اپنے تمام نسخے آزما چکے تھے لیکن کسی طرح کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی۔

آخر کار دن کو دس بجے آہستہ آہستہ تارا کو ہوش آیا، اور ہوش آتے ہی اس کی علالت نمایاں طور پہ جدا ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ ویدوں نے دیکھ کر اطمینان ظاہر کیا۔ اندر باہر ہر شخص کو اطلاع ہو گئی اور شمشیر سنگھ اس خبر کو سنکر بچوں کی طرح باتیں کرنے لگا سوشیلا، جو اس موقعہ کی منتظر تھی، ہاتھ جوڑ کر اپنے خالو کے سامنے کھڑی ہو گئی اور بولی" میں سامنے سے نہ ہٹوں گی جبتک کہ میری ایک آرزو پوری نہ کی جائے گی۔"

شمشیر سنگھ نے فرط مسرت سے اپنی بھانجی کو گلے لگایا اور بولا" سوشیلا" تو تو دیوی ہے اور دیوی کی کوئی بات رد نہیں کی جا سکتی، کہہ جو کہنا چاہتی ہے۔"

سوشیلا۔" تارا کی شادی کا اختیار مجھے دیدیجیے۔"

شمشیر سنگھ۔" میں تو اس کی موت و زندگی پہ تجھ کو اختیار دیتا ہوں۔"

سوشیلا:" تو پھر یہ بھی اجازت دیجئے، کہ میں اپنے اختیار سے تارا کو دلہن بناؤں اور کنور رنجور سنگھ کے ساتھ اسکی شادی کر کے اس فرض سے سبکدوش ہوں جو بہن ہونے کی حیثیت سے مجھ پر عائد ہوتا ہے"۔

(۱۱)

رنجور۔ اور تارا کی شادی کو دو سال کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس عرصہ میں سب ہی انقلاب ہو گئے ہیں۔ ارجن کی اچانک موت سے رنجور سنگھ سبل گڈھ کا راجہ تسلیم کیا گیا شمشیر سنگھ اپنی عمر طبعی کو پہونچ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ تارا کی آغوش کو ایک فرشتہ صورت بچے نے آباد کر دیا لیکن سوشیلا جو ایک بار تیرتھ کے لئے بنارس گئی تو پھر وہیں کی ہو کر رہ گئی۔

لوگ مصیبتیں لیکر اس دیوی کے پاس آتے ہیں عورتیں اپنی دکھ بھری داستانیں اس سے بیان کرتے ہیں، اور وہ ان سب کی خدمت میں اپنا وقت صرف کیا کرتی ہے۔ لیکن باوجود اس ترک دنیا کے بھی، جب کبھی محبت کا نام اسکے سامنے لیا جاتا ہے، حتیٰ کہ کوئل کی آواز، کسی پپیہے کی صدا بھی جب اسکے کان میں آجاتی ہے، تو وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کا دل اب بھی کھنک رہا ہے۔ اور وہ ابتک ایک "ستی ہونے والی بیوہ کی طرح آگ میں جل رہی ہے۔

# شاہزادہ خرم اور ابابیل

شہر کے سب سے بلند حصہ میں ایک بلند مینار پہ شاہزادہ خرم کا بت نصب تھا اس مجسمہ پہ سر سے پاؤں تک سونے کے پتر چڑھے ہوئے تھے، آنکھوں کی جگہ چمکدار نیلم جڑے تھے۔ اور ایک بڑا لعل اسکے تلوار کے قبضہ پر چمک رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ لوگ اس بت کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایوان بلدیہ کے ایک رکن نے جس کی بڑی خواہش یہ تھی کہ لوگ اسکے ذوق سلیم کی داد دیں ایک روز اس بت کو دیکھ کر کہا: "یہ بت ایسا خوبصورت ہے جیسے" مرغ باد نما" اور پھر اس اندیشہ سے کہیں لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ غیر عملی آدمی ہے (حالانکہ درحقیقت وہ ایسا نہ تھا) اس نے اپنی تنقید میں اس قدر اضافہ اور کر دیا کہ" فرق صرف اتنا ہے کہ وہ کار آمد چیز ہے اور یہ بیکار"۔

اسی طرح ایک روز ایک چھوٹے بچہ سے جبکہ وہ چاند کے لئے بے قرار تھا اسکی اماں نے کہا کہ" تم ایسے کیوں نہیں ہو جاتے جیسا شاہزادہ خرم ہے، دیکھو اسکے دل میں کسی چیز کے لیئے ضد کرنے اور رونے کا خیال تک نہیں آتا"

اسی طرح ایک روز کوئی دل شکستہ اور مایوس آدمی اس حیرت انگیز بت کی طرف دیکھ رہا تھا تو اس کی زبان سے نکلا " کتنی خوشی کی بات ہے کہ دنیا میں کوئی ایک تو ایسا ہے جو واقعی مسرور و شادکام ہے۔"

ایک روز خیرات خانہ کے بچے صاف ستھرے سفید کرتے اور سرخ کوٹ

پہنے گرجا سے نکلے تو انھوں نے بھی شاہزادہ کے بُت کو دیکھ کر کہا کہ "شاہزادہ تو بالکل فرشتہ معلوم ہوتا ہے"۔

ریاضی کے استاد نے دریافت کیا کہ :۔ جب تم لوگوں نے کوئی فرشتہ دیکھا ہی نہیں تو پھر تمھیں کیا معلوم کہ فرشتہ کیسا ہوتا ہے"۔ اس کا جواب بچوں نے یہ دیا کہ :۔ "دیکھا کیوں نہیں ہم نے بارہا خواب میں دیکھا ہے"۔

ماہر ریاضیات برہم ہو کر بچوں کو گھورنے لگا کیونکہ وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا کہ بچے خواب دیکھا کریں۔

ایک رات کو شہر کے اوپر ہی اوپر ایک ننھی سی ابابیل اُڑی جا رہی تھی، اس کے ساتھ کی ابابیلیں سب کی سب چھ ہفتہ بیشتر مصر جا چکی تھیں اور یہ پیچھے رہ گئی تھی کیونکہ اسے ایک خوبصورت نرکل کے درخت سے محبت ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے ابابیل نے اس حسین درخت کو اس وقت دیکھا تھا جب ایک دن زرد رنگ کی تیتری کے تعاقب میں وہ دریا پر اُڑی جا رہی تھی۔ خوبصورت کا لچیلاپن اس ابابیل کو ایسا بھلا معلوم ہوا کہ وہ اس سے باتیں کرنے کے لیئے ٹھہر گئی۔

ابابیل نے جو فوراً مطلب کی بات شروع کر دیا کرتی تھی اس سے پوچھا کہ "۔ کیا تم سے محبت کروں ؟" اور اس نے بھی ادا کے ساتھ خم ہو کر کہدیا کہ "کیوں نہیں"۔ پھر کیا تھا، ابابیل، عاشق زار ابابیل، اس کا طواف کرنے لگی۔ وہ اڑتی ہوئی سطح آب کو اپنے پروں سے مس کرتی اور چھوٹی چھوٹی نقرئی لہریں بناتی رہتی۔ یہ گویا اس کا اظہار محبت تھا، جو گرمیوں بھر اسی طرح جاری رہا۔

یہ دیکھ کر اور ابابیلیں آپس میں کہنے لگیں "عجیب مضحکہ انگیز عشق ہے اسکے پاس دولت بھی نہیں اور رشتہ دار بھی اس کے بہت ہیں" اور یہ درحقیقت ٹھیک بھی تھا اور دریا نرکلوں سے بھرا ہوا تھا۔ الغرض جب فصل خزاں آئی تو تمام ابابیلیں چل دیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد وہ عاشق ابابیل تنہائی سے بہت گھبرائی اور اپنے محبوب سے بھی اکتا گئی۔ وہ اپنے دل میں کہتی کہ "یہ بات تو کرتا ہی نہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ شاید یہ عشوہ باز اور غماز بھی ہے، کیونکہ ہمیشہ ہوا سے اس کی چھیڑ چھاڑ جاری رہتی ہے"۔ اور یہ واقعہ تھا کہ جب ہوا چلتی تو نرکل نہایت خوبصورت لچک کے ساتھ اس کے سامنے جھک جھک جاتا پھر ابابیل کہنے لگی، میں جانتی ہوں کہ وہ ایک جگہ رہنا پسند کرتا ہے اور میں ٹھہری سیر و سیاحت کی دلدادہ، اس لئے میرا اس کا کیا ساتھ"۔ بالآخر ایک دن ابابیل نے اپنے محبوب نرکل سے پوچھا۔ کیا تمھارا میرا ساتھ ہوسکتا ہے"؟

لیکن اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ فقط سر ہلا دیا۔ اسے اپنے گھر سے بہت محبت تھی یہ دیکھ کر ابابیل نے کہا۔ "اچھا تو معلوم ہوا تم ابتک مجھے چٹکیوں ہی میں اڑاتے رہے ہو بہتر ہے میں بھی اب اہرام مصر کی طرف چلی" ابابیل بیچاری دن بھر ماری ماری پھری اور شام کے وقت شہر میں پہونچی۔ رات ہو گئی تھی۔ سوچنے لگی "کہاں ٹھہروں" اس وقت اس کی نظر شہزادۂ خرم کے بُت پر پڑی جو بلند مینار پر نصب تھا بُت کو دیکھتے ہی وہ کہنے لگی "بس میں یہیں ٹھہروں گی جگہ بھی اچھی ہے اور تازہ ہوا بھی یہاں کافی ہے" اس لئے اُڑ کر شہزادۂ خرم کے دونوں پاؤں کے بیچ میں بیٹھ گئی۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور دیکھ کر دل میں کہنے لگی "۔ میں بھی کس قدر خوش نصیب ہوں کہ آرام کی جگہ بھی بالکل زرنگار ملی۔ اس کے بعد وہ سونے کی تیاری میں مصروف لیکن جو ہی وہ اپنا سر پروں میں چھپانے لگی، اس پر پانی کا ایک بڑا قطرہ ٹپکا۔ وہ گھبرا کر چونک اٹھی اور کہنے لگی"۔ یہ تو عجیب بات ہے۔ آسمان صاف ہے۔ بادل کا پتہ نہیں، ستارے جگمگا رہے ہیں لیکن بارش پھر بھی ہو رہی ہے واقعی شمالی یورپ کی آب و ہوا نہایت عجیب ہے"۔

اس کے بعد دوسرا قطرہ ٹپکا۔ ابابیل نے کہا۔

" یہاں سے چلنا چاہیئے اور کسی مکان کا اچھا سا روشندان ڈھونڈھنا چاہئے ایسے بت سے کیا فائدہ جو پانی بھی نہ روک سکے"۔

یہ کہہ کر ابابیل وہاں سے اڑنے کو تیار ہوئی اور جونہی اس نے اڑنے کے لیے پر تولے، تیسرا قطرہ ٹپکا۔ اب جو ابابیل نے گھبرا کر اوپر کی طرف سر اٹھایا تو دیکھا کہ شہزادۂ خرم کی آنکھیں اشک آلود ہیں اور اس کے سنہرے رخسار پر آنسوؤں کے قطرے بہہ رہے ہیں۔ شہزادہ کا چہرہ چاندنی میں اس قدر خوبصورت معلوم ہوتا تھا کہ ابابیل کا دل بھی ہمدردی سے بھر آیا۔ اس نے بت سے دریافت کیا۔

.... آپ کون ہیں ؟

بُت " میں شہزادۂ خرم ہوں"۔

ابابیل " پھر آپ رو کیوں رہے ہیں۔ آپ نے تو مجھے تربتر کر دیا"۔

بُت " جب میں زندہ تھا اور میرے پہلو میں انسانی دل تھا۔ تو میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آنسو کس چیز کا نام ہے۔ کیونکہ میں اپنے قصر میں رہا کرتا تھا جہاں رنج و غم کا پتہ نہ تھا۔ دن بھر میں باغ کے اندر اپنے احباب کے ساتھ کھیلتا تھا، اور رات کو بڑے ایوان میں رقص و سرود میں شریک ہوتا تھا، باغ کے گرد بڑی اونچی دیوار تھی، لیکن مجھے کبھی تمنا نہ ہوئی کہ کسی سے دریافت کروں، باہر کیا ہے، میرے گرد و پیش ہر چیز دلکش اور خوبصورت تھی میرے مصاحب اور درباری مجھے شہزادۂ خرم کہا کرتے تھے اور درحقیقت میں تھا بھی ایسا ہی بشرطیکہ عیش و طرب کے معنی خرمی کے ہوں۔ الغرض میری تمام زندگی یوں ہی گزری اور اسی حال میں مر گیا، اب مرنے کے بعد لوگوں نے میرا بت یہاں اس قدر بلند نصب کر دیا کہ میں اپنے شہر کی تمام برائیوں اور تمام مصائب خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور ہر چند میرا دل سیسہ کا بنا ہوا ہے لیکن پھر بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا"۔

ابابیل :۔ (دل میں) ہائیں! کیا یہ بُت ٹھوس سونے کا نہیں ہے؟"

یہ بات ابابیل نے دل میں اس لئے کہی وہ نہایت مہذب اور بااخلاق چڑیا تھی وہ ہرگز پسند نہیں کرتی تھی کہ کسی کے ذاتیات پر حملہ کرے۔

بُت نے نرم لہجہ میں کہا:۔

"یہاں سے دور تنگ کوچہ میں ایک گھر ہے، اس کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور میں ایک عورت کو میز کے سامنے بیٹھا دیکھ رہا ہوں اس کا چہرہ لاغر و زرد ہے اس کے ہاتھ سوئیوں کی نوکیں چبھنے سے سرخ اور کھردرے ہو گئے ہیں کیونکہ وہ سلائی کا کام کرتی ہے، اسوقت وہ ملکہ کی ایک خوبصورت سہیلی کے لئے ساٹھن کے لباس پر خوبصورت پھول کاڑھ رہی ہے، جسے وہ آئندہ بزم رقص میں پہنے گی۔ کمرہ کے ایک گوشہ میں پلنگ پر اس کا چھوٹا سا بچہ بخار میں مبتلا ہے اور سنتروں کے لئے ضد کر رہا ہے۔ ماں بیچاری کے پاس کیا دھرا ہے جو اپنے بچے کو دے، اسی لئے بچہ رو رہا ہے ابابیل! اے میری ننھی ابابیل!! کہ تم ایسا نہیں کرسکتیں کہ میری تلوار کے قبضہ میں جو لعل جڑا ہوا ہے، وہ نکال کر اس غریب عورت کو دے آؤ۔ میرے پاؤں تو اس کرسی میں جڑے ہوئے اور میں حرکت نہیں کرسکتا۔"

ابابیل :۔ "میرا تو مصر میں انتظار ہو رہا ہوگا۔ میرے دوست دریائے نیل پر خوش خوش اڑ رہے ہوں گے اور گلہائے نیلوفر سے باتیں ہو رہی ہوں گی۔ وہ رات کو فرعون کی مقبرہ میں جا سوئیں گے۔ جو اپنے رنگین اور منقش تابوت میں پڑا سو رہا ہے بادشاہ کی لاش زردکتاں میں ملفوف ہے اور مسالوں میں لپٹی ہوئی پڑی ہے۔ اس کے گلے میں ہلکے سبز رنگ کے بیش قیمت جواہرات کا ہار ہے۔ اور اس کے ہاتھ ایسے خشک ہیں جیسے برگہائے خزاں دیدہ۔"

بت :۔ "کیا واقعی تم میرے پاس رات بھر بھی نہ ٹھہرو گی اور میرا یہ کام نہ کردو گی؟

دیکھو پیاس کے مارے بچہ کی زبان منھ سے باہر نکلی پڑتی ہے اور اسکی ماں بہت ملول ہے"۔

ابابیل" معاف کیجئے میں لڑکوں کو پسند نہیں کرتی، پارسال گرمی میں جب میں دریا پر ٹھہری ہوئی تھی تو چکی والے کے بیہودہ لڑکے ہمیشہ میری طرف ڈھیلے پھینکا کرتے تھے۔ کوئی پتھر میرے لگا تو نہیں کیونکہ ہم ابابیل کے بہت تیز پر ہوتے ہیں علاوہ ازیں میں اس خاندان کی ہوں جو اپنی تیز پروازی میں ہمیشہ مشہور رہا ہے لیکن بہرحال اس طرح ڈھیلے پھینکنا توہین تو ہے۔"

یہ سنکر شہزادہ خرم بہت رنجیدہ ہوا۔ اس قدر رنجیدہ کہ ابابیل بھی بہت متاثر ہوئی اور آخر کار اسے کہنا پڑا کہ "اچھا میں ایک رات آپ کے پاس قیام کرلونگی"۔

بُت: "شکریہ۔"

اسکے بعد ابابیل نے شاہزادہ کی تلوار کے قبضہ سے وہ لعل نکالا اور چونچ میں لیکر مکانوں کی چھتوں پر اڑتی ہوئی روانہ ہوگئی وہ گرجا کے مینار کے پاس ہوکر گزری جہاں فرشتوں کے سفید سنگ مرمر کے مجسمے رکھے ہوئے تھے اور قصر شاہی کے پاس سے ہوکر گذری اور رقص و سرود کی آوازیں سنیں۔ ایک جمیل لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ نکل کر بالاخانہ پر آئی اور ستاروں بھری رات کو دیکھ کر کہنے لگی۔

"ستارے کس قدر دلکش ہیں اور عشق و محبت کی طاقت بھی کس قدر زبردست ہوتی ہے۔ امید ہے کہ بزم رقص و سرود منعقد ہونے تک میری پوشاک بھی تیار ہوجائے گی۔ میں نے حکم دیا ہے کہ اس پر خوبصورت پھول کاڑھے جائیں لیکن یہ سینے والیاں بھی کس قدر کاہل اور سست ہوتی ہیں۔

---

ابابیل اڑتی ہوئی دریا پر سے گذری۔ اور جہازوں کے مستولوں پر لٹکی ہوئی

لالٹینیں دیکھیں۔ وہ یہودیوں کے محلہ سے ہو کر گذری۔ اور بڈھے بڈھے یہودیوں کو ایک دوسرے سے سودا کرتے اور تانبہ کی ترازوؤں میں روپیہ تولتے دیکھا۔ بالآخر وہ اڑتی اڑتی اس گھر تک پہونچی۔ اور اندر جھانکا۔ لڑکا بخار میں مبتلا، چارپائی پر تڑپ رہا تھا اور ماں کی آنکھ لگ گئی تھی۔ بیچاری کام کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ ابابیل کمرہ کے اندر داخل ہوئی اور اپنے بازوؤں سے لڑکے کی پیشانی کو ہوا دی اور وہ لعل میز پر انگشتانہ کے قریب رکھدیا۔ اسکے بعد اس نے پلنگ کے گرد آہستہ آہستہ اڑکر بچہ کو ہوا دی۔ وہ بولا "اسوقت کیسی خوشگوار خنکی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ میری طبیعت اب اچھی ہوتی جاتی ہے"۔ یہ کہا اور لڑکا پھر سوگیا۔

ابابیل پھر اڑتی ہوئی شہزادہ خرم کے پاس پہونچی اور سارا حال بیان کرکے بولی " یہ عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ سردی پڑ رہی ہے لیکن مجھے گرمی محسوس ہو رہی ہے"۔

بت:۔ اس لیئے کہ تم ایک نیک کام کرکے آئی ہو"

اس کے بعد ابابیل مختلف قسم کے خیالات میں الجھ گئی اور سوچتے سوچتے سو گئی کیونکہ سوچنے اور فکر کرنے سے ہمیشہ نیند آجاتی ہے۔ صبح کو جب دن نکلا تو وہ دریا کی طرف اڑ گئی اور نہانے لگی اسوقت اتفاق سے "خصوصیات طیور" کے ایک پروفیسر پل پر سے گذر رہے تھے۔ ان کی نظر جو ابابیل پر پڑی تو وہ حیران ہو کر کہنے لگے "ہائیں! جاڑوں میں ابابیل"! اس کے بعد پروفیسر نے ایک بڑا طویل مراسلہ مقامی اخباروں میں شائع کیا اور ہر اخبار نے اسکی اشاعت کی۔

ابابیل نے کہا کہ آج رات کو میں مصر چلی جاؤں گی۔ وہ مصر کے پر لطف مناظر کا خیال کر کے اسوقت واقعی بہت خوش تھی۔ اسکے بعد وہ اڑی اور شہر کے تمام مشہور مقامات کو دوبارہ جاکر دیکھا۔ وہ بہت دیر تک گرجا کی چوٹی پر بیٹھی رہی۔

جہاں جہاں ابابیل جاتی، اسے دیکھ کر چڑیاں چہچہاتیں اور آپس میں کہتیں "یہ اجنبی کس قدر شاندار اور دلکش چیز ہے"۔ الغرض ابابیل نے خوب سیر کی۔

جب چاند نکلا تو وہ پھر اڑکر شاہزادہ خرم کے پاس گئی اور بولی "کیا صاحب عالم کا کوئی کام مصر میں بھی ہے کیونکہ اب میں جارہی ہوں۔"

بت:۔ "کیا تم میرے پاس ایک رات اور نہیں ٹھہر سکتیں۔"

ابابیل:۔ "نہیں مصر میں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ کل میرے تمام احباب دوسری آبشار کی طرف چلے جائیں گے۔ وہاں لمبی لمبی گھاس پانی میں لہریں لیا کرتی ہے اور سنگ خارا کے ایک تخت پر خداوند ممنون متمکن ہے رات بھر اسکی آنکھیں آسمان کے ستاروں کو تکتی رہتی ہیں اور جب صبح کا ستارہ نمودار ہوتا ہے تو وہ ایک نعرۂ مسرت لگاتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے دوپہر کو بھورے رنگ کے شیر ببر پانی پینے لب جو آتے ہیں جن کی آنکھیں ہلکے رنگ کے فیروزوں کی طرح چمکتی ہیں اور جن کی گرج آبشاروں کے شور سے زیادہ بلند ہوتی ہے۔

بت:۔ "میں ایک نوجوان کو کوٹھے پر بیٹھے دیکھتا ہوں۔ وہ ایک میز پر جھکا ہوا ہے جس پر بہت سے کاغذ رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے برابر ایک گلاس رکھا ہوا ہے جس میں بنفشہ کے افسردہ پھول ہیں۔ اسکے بال بھورے اور سخت ہیں اس کے لب انار کی طرح سرخ ہیں اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خمار آلود ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ تھیٹر کے ڈائرکٹر کے لئے ایک ڈرامہ جلد ختم کر دے لیکن اسکے ہاتھ جاڑے کی شدت سے اکڑے ہوئے ہیں اور وہ لکھ نہیں سکتا۔ آتشدان میں آگ نہیں ہے اور بھوک کے مارے بیہوش ہوا جاتا ہے۔

یہ سنکر ابابیل نے جو بہت نیک دل چڑیا تھی کہا: "اچھا میں آپ کے پاس ایک شب اور قیام کر لوں گی۔ کیا میں اس نوجوان کے پاس کوئی دوسرا لعل لے جاؤں؟"

بت :" افسوس ہے کہ اب میرے پاس اور کوئی لعل نہیں ہے۔ صرف میری آنکھیں باقی رہ گئی ہیں۔ یہ نہایت نفیس نیلم کی بنی ہوئی ہیں جو تقریباً ایک ہزار سال گزرے ہندوستان سے لائے گئے تھے۔ پس تم میری آنکھ نکال لو اور اس نوجوان کے پاس لے جاؤ۔ وہ یہ نیلم کسی جوہری کے ہاتھ فروخت کر دے گا۔ اور اس کی قیمت سے وہ کھانا اور لکڑی خریدے گا اور ڈرامہ ختم کر دے گا۔"

یہ سنکر ابابیل کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ رو کر کہنے لگی:" جناب یہ تو مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

بُت :" کوئی حرج نہیں، تم وہی کرو جو میں کہتا ہوں۔"

مجبور ہو کر ابابیل نے شہزادہ کی ایک آنکھ سے نیلم نکالا اور اسے لیکر نوجوان کے مکان کی طرف اڑ گئی۔ چونکہ چھت میں ایک سوراخ تھا اس لئے اندر داخل ہونا بہت آسان تھا۔ نوجوان اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا اس لیے وہ ابابیل کے پروں کی آواز نہ سن سکا۔ اور جب اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اس نے کھلائے ہوئے گلدستہ میں ایک خوبصورت اور آبدار نیلم دیکھا اور دیکھتے ہی خوش ہوگیا اور دل میں کہنے لگا۔ شاید کسی عظیم الشان ہستی نے میری کوششوں کو بنظر استحسان دیکھا ہے اور یہ تحفہ بھی اسی نے بھیجا ہے پس میں اپنا ڈرامہ ختم کر لوں گا۔"

دوسرے روز ابابیل اڑکر بندرگاہ کی طرف گئی۔ اور ایک جہاز کے مستول پر بیٹھی اور ملاحوں کو دیکھنے لگی جو نیچے کے گودام سے رسوں میں باندھ کر بڑے بڑے وزنی صندوق نکال رہے تھے۔ جب کوئی صندوق اوپر آجاتا تھا تو وہ نعرے لگاتے تھے:" شاباش میرے بھائی۔" یہ سنکر ابابیل کو بھی کچھ امنگ سی آئی اور چلا کر کہنے لگی:" میں بھی اب مصر کو چلی"۔ الغرض شام کو جب چاند نکلا تو وہ اڑکر پھر شاہزادہ خرم کے پاس پہونچی اور بولی۔

..... " اب میں جناب سے رخصت ہونے آئی ہوں۔"

بت :" کیا تم میرے پاس ایک رات اور نہ ٹھہرو گی ؟ "

ابابیل :" اب جاڑوں کا زمانہ ہے اور یہاں بہت جلد برف پڑنے لگی۔ لیکن مصر میں ابھی بہار ہے ۔ ہرے نخلستانوں پر آفتاب چمک رہا ہے۔ دریا سے گھڑیال نکل کر ساحل کی ریت پر لوٹتے ہیں اور مضمحل نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں میرے ساتھی بعل کے مندر میں آشیانہ بنا رہے ہیں سفید قمریاں اور گلابی فاختہ کوکو کر رہی ہیں، اب آپ مجھے رخصت کیجئے۔ میں آپ کی یاد ہمیشہ دل میں رکھوں گی اور آئندہ فصل بہار میں ان جواہرات کے بجائے جو آپ کی دریا دلی نے لوگوں کو عطا فرما دئے ہیں، میں آپ کے لئے دو بہت خوبصورت اور نفیس جواہر لاؤں گی، میرا لعل رنگ اور آب و تاب میں سرخ گلاب سے بھی زیادہ بہتر اور میرا نیلم سمندر کے نیلگوں پانی سے بھی زیادہ خوش آب ہوگا۔"

بت :" نیچے دیکھو بازار میں ایک چھوٹی سی دیا سلائی بیچنے والی لڑکی کھڑی ہے۔ اس نے بدرو میں ڈال کر اپنی تمام دیا سلائیاں خراب کر دی ہیں۔ اب وہ کھڑی رو رہی ہے کیونکہ اگر وہ دیا سلائی بیچ کر گھر پیسے نہ لے گئی تو اس کا باپ اسے بہت مارے گا۔ اس لڑکی کے پاؤں میں نہ جوتیاں ہیں نہ موزے۔ اس کا ننھا سا سر بھی ننگا ہے اب میری دوسری آنکھ بھی نکال لو اور لے جا کر اس لڑکی کو دے آؤ۔ تاکہ یہ مصیبت سے بچ جائے۔"

ابابیل :" میں آپ کے پاس ایک رات اور ٹھہر سکتی ہوں لیکن آنکھ نہیں نکال سکتی، کیونکہ آپ جب دونوں آنکھوں سے محروم ہو جائیں گے تو کیا کریں گے۔"

بت :" نہیں جو حکم دیتا ہوں وہی کرو۔"

ابابیل نے شہزادہ کی دوسری آنکھ بھی نکال لی اور لیکر نیچے کی طرف اڑی اور وہ اس لڑکی کے پاس سے منڈلاتی ہوئی گذری اور اس کی ہتھیلی پر وہ نیلم آہستہ سے رکھدیا۔ نیلم کو دیکھ کر لڑکی خوش ہوگئی اور کہنے لگی ؟کیا پیارا شیشے کا ٹکڑا ہے"۔ وہ ہنستی ہوئی نیلم لیکر گھر کی طرف دوڑ گئی۔ اسکے بعد ابابیل پھر شہزادہ کے پاس آئی اور بولی:" چونکہ آپ کی بینائی بالکل جاتی رہی ہے اس لئے میں ہمیشہ آپ ہی کی خدمت میں رہا کروں گی"۔

بُت":۔ نہیں پیاری ابابیل! اب تم مصر کی طرف جاؤ۔"

ابابیل":۔ نہیں اب تو میں یہیں رہوں گی۔"

اس کے بعد ابابیل پروں میں سر چھپا کر شہزادہ کے پیروں کے درمیان سوگئی وہ دوسرے روز بھی تمام دن شہزادہ کے قدموں میں بیٹھی رہی اور ممالک غیر میں جو جو باتیں اس نے دیکھی تھیں ان کا حال بیان کرتی رہی، اس نے مصر کی سرخ رنگ مقدس چڑیوں کا حال بیان کیا جو دریائے نیل کے کنارے کنارے لمبی لمبی قطاریں باندھے بیٹھی رہتی ہیں اور اپنی چونچ سے سنہری مچھلیاں پکڑتی ہیں اس نے ابوالہول کا ذکر کیا جو ریگستان میں رہتا ہے اور ہر چیز کا حال جانتا ہے۔ اس نے تاجروں کا حال بیان کیا جو آہستہ آہستہ اونٹوں کے ساتھ چلتے ہیں ہاتھوں میں کہربا کی تسبیحیں ہوتی ہیں، اس نے جبال القمر کے بادشاہ کا قصہ سنایا جو آبنوس کی طرح سیاہ ہے اور ایک بڑے بت کی پوجا کرتا ہے اس نے ایک بڑے سبز رنگ کے سانپ کا حال سنایا جو ایک کھجور کے درخت میں رہتا ہے، اور بیس پجاری اسے دودھ پلاتے ہیں۔ اس نے ان بالشتیوں کا قصہ کہا جو ایک جھیل میں بڑے بڑے پتوں کی کشتیاں چلاتے ہیں اور تیتریوں کے ساتھ ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں۔

بُت :" اے ابابیل! تم نے مجھے عجیب عجیب باتیں سنائیں، لیکن ان سب سے زیادہ حیرت انگیز انسان کے آلام و مصائب ہیں۔ دنیا کا کوئی راز اس قدر زبردست نہیں جتنا رنج و ملال اب تم میرے شہر کی فضا میں پرواز کرو اور جو کچھ تم دیکھو اسے بیان کرو۔"

پس وہ ابابیل اس عظیم الشان شہر کی فضا میں اڑی اور امیروں کو دیکھا کہ اپنے خوبصورت محلوں میں رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ اور غریب لوگ دروازوں پر بیٹھے ہیں، وہ تنگ کوچوں میں گئی اور زرد رو بچوں کو دیکھا جو فاقہ کر رہے ہیں اس نے ایک پل کے در میں محراب کے نیچے دو چھوٹے لڑکوں کو دیکھا جو ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے پڑے تھے تاکہ اس طرح وہ کسی قدر گرم ہو جائیں۔ اور سردی سے محفوظ رہیں لیکن ایک چوکیدار آتا ہے اور ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے کہ "خبردار یہاں نہ لیٹنا" اور وہ دونوں بیچارے پل کے نیچے سے بارش میں نکل جاتے ہیں یہ تمام باتیں دیکھ کر وہ ابابیل اڑتی ہوئی پھر شہزادہ کے پاس واپس آئی اور جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا۔

بُت :" دیکھو مجھ پر سونے کے پتر چڑھے ہیں۔ تم انھیں نوچ کرلے جاؤ اور غرباء و مساکین کو دیدو۔"

الغرض ابابیل نے سونے کے تمام پتر نوچ لیے حتیٰ کہ شہزادہ خرم بالکل بھدا اور سیسہ کے رنگ کا دکھائی دینے لگا، یکے بعد دیگرے وہ سونے کے تمام پتر غرباء و مساکین کو مل گئے اب بچوں کے چہرے سرخ و سفید نظر آنے لگے۔ وہ آپس میں ہنستے اور گلیوں میں کھیلتے پھرتے تھے اور باآواز بلند کہتے تھے کہ "ہاں اب ہم کو روٹی ملتی ہے۔"

اس کے بعد برف پڑنے لگی اور برف کے بعد پالا پڑنا شروع ہوا سڑکیں

ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا چاندی کی بنی ہوئی ہیں برف کی لمبی لمبی قلمیں مکانات کی اد لبتوں پر ایسی لٹکتی تھیں گویا بلوری خنجر لٹک رہے ہیں، جو شخص باہر نکلتا تھا سمور پہن کر نکلتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے سرخ بانات کی ٹوپیاں پہنے برف پر پھسل پھسل کر کھیل رہے تھے۔

غریب ابابیل روز بروز ٹھٹھری جاتی تھی۔ لیکن فرط محبت سے شہزادہ کو نہیں چھوڑتی تھی وہ نانبائی کی دوکان کے سامنے سے اسکی غیر حاضری میں روٹی کے ریزے چن چن کر کھاتی اور اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لیئے پر پھٹ پھٹاتی رہتی آخر کار اسے محسوس ہونے لگا کہ موت کے دن قریب آگئے ہیں اب اس میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ اڑ کر پھر شہزادہ کے شانے پر آکر بیٹھ جاتی۔ اس نے کہا کہ "صاحب عالم! خدا حافظ! کیا مجھے اپنا ہاتھ چومنے کی اجازت دیں گے۔"

بُت:" میں خوش ہوں کہ اب آخر کار تم مصر جا رہی ہو۔ تم یہاں بہت عرصہ تک ٹھہری رہیں۔ لیکن چونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اس لیئے ہاتھوں کے بجائے تم میرے لب کو بوسہ دو۔"

ابابیل۔" میں مصر نہیں جا رہی ہوں بلکہ دنیا سے جا رہی ہوں"۔

یہ کہہ کر ابابیل نے شہزادہ کے لبوں کو بوسہ دیا۔ اور اس کے قدموں پر گر کر مر گئی۔

عین اسی وقت کسی چیز کے شق ہونے کی عجیب آواز بت کے اندر سے آئی۔ گویا کوئی چیز ٹوٹی ہے۔ شہزادہ کا دل جو سیسہ کا بنا ہوا تھا پھٹ کر بالکل دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔

دوسرے روز صبح کو امیر بلدیہ معارکان کے نیچے چوک میں پھر رہا تھا جس وقت یہ لوگ مینار کے پاس سے گذرے تو انھوں نے بت کی طرف دیکھا دیکھتے ہی دیکھتے

میر بلدیہ بولا۔" یہ شہزادہ کا بت کس قدر بھدا نظر آتا ہے۔"

" بیشک بھدا ہو گیا ہے"۔ ارکان بلدیہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ "ہاں میں ہاں" ملانے کے اصول پر عمل کرتے تھے اور امیر بلدیہ کے خلاف کچھ نہیں کہتے تھے۔

امیر بلدیہ" تلوار کے قبضہ سے لعل گر چکا ہے ۔آنکھوں سے نیلم نکل کر گر پڑے ہیں اور سونے کے پتر بھی نہیں رہے اب تو شہزادہ فقیر سا نظر آتا ہے"۔

ارکان بلدیہ" درست فرمایا۔ بالکل فقیر سا معلوم ہوتا ہے۔"

امیر بلدیہ" اور یہ تو دیکھئے شہزادہ کے قدموں میں ایک چڑیا پڑی ہے۔ اب واقعی ایک فرمان جاری کرنا پڑے گا کہ آئندہ کسی پرندکو یہاں آکر مرنے کی اجازت نہ ہوگی"۔

منشی نے فوراً امیر بلدیہ کی بات نوٹ کرلی۔ پس لوگوں نے شہزادہ کے مجسمہ کو توڑ ڈالا۔ اور یونیورسٹی کے ماہرین فنون لطیفہ نے تو یہاں تک کہدیا کہ۔

" چونکہ یہ بت خوبصورت نہیں رہا لہذا مفید نہیں رہا"

شہزادہ کا بت ایک بھٹی میں پگھلایا گیا۔ اور امیر بلدیہ نے ارکان بلدیہ کا ایک ضروری جلسہ طلب کیا تاکہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ بُت کی دھات کس کام میں لائی جائے۔ خود امیر بلدیہ نے فرمایا کہ" ہمیں یقیناً ایک دوسرا بت بنوانا پڑے گا اور وہ بُت میرا ہوگا۔" اس پر ہر رکن نے "میرا۔ میرا۔ میرا" راگ الاپنا شروع کر دیا۔ اور آپس میں خوب جنگ ہوئی۔"

کارخانہ فلزات کے مہتمم نے کاریگروں سے کہا" یہ عجیب بات ہے کہ اس بت کا دل بھٹی میں پگھلتا ہی نہیں پھر کیا کیا جائے۔ اچھا اسے پھینک دو"۔

الغرض انھوں نے شہزادہ کے دل کو مزبلہ پہ پھینک دیا جہاں ابابیل کی لاش

پہلے سے پڑی ہوئی تھی۔

خدا نے اپنے فرشتوں میں سے ایک کو حکم دیا کہ جاؤ اس شہر میں جو سب سے بیش قیمت دو چیزیں ہوں وہ میرے پاس لاؤ۔ فرشتہ آیا اور "سیسہ کا دل اور ابابیل کی لاش" اٹھا لے گیا۔ خدا نے فرمایا۔

" بیشک تم نے نہایت صحیح انتخاب کیا۔ میری فردوس میں یہ پرندہ ہمیشہ چہچہاتا رہے گا اور میرے شہر زرنگار میں شاہزادہ خرم میری حمد و ثنا میں مصروف رہے گا۔"

(آسکر وائلڈ)

# نوجوان شاہزادہ

جو دن تاجپوشی کے لیئے مقرر تھا، اس سے ایک رات قبل نوجوان شاہزادہ اپنے خولصورت ایوان میں بیٹھا ہوا تھا۔ تمام درباری حسب قاعدہ زمین بوس ہو کر قصر شاہی کے بڑے کمرے میں" افسر تشریفات "سے دربار کے آداب حاضری کے چند آخری سبق لینے چلے گئے تھے، کیونکہ ان میں چند آدمی ایسے بھی تھے جو ان اداب سے بالکل ناواقف تھے نوعمر شہزادہ نے جس کی عمر سولہ سال کی تھی۔ ان درباریوں کے چلے جانے کے بعد اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور چھپر کھٹ کے زرکار نرم گدول پر لیٹ گیا۔ اس کے لب کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں حیران، گویا وہ کوئی ہرن تھا جسے جنگل کے شکاریوں نے ابھی گرفتار کیا ہو۔

اور یہ واقعہ بھی تھا کہ وہ برہنہ پا، ہاتھ میں بانسری لیئے گڈریہ کے گلہ کے پیچھے پیچھے جارہا تھا کہ اسے لوگ پکڑ لائے۔ یہ بڈھے بادشاہ کی اکلوتی بیٹی کا لڑکا تھا، جس نے ایک ادنیٰ درجہ کے آدمی سے خفیہ طور پر نکاح کر لیا تھا بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ شخص کوئی اجنبی تھا جس نے اپنی عجیب و غریب جادو بھری بانسری بجا کر شاہزادی کو فریفتہ کر لیا تھا اور بعض کا یہ قول تھا کہ وہ ریمینی کا رہنے والا ایک نقاش تھا جس کی شہزادی نے ضرورت سے زیادہ عزت افزائی کی تھی۔ اور جو بعد کو گرجائیں اپنا کام نامکمل چھوڑ کر شہر سے اچانک غائب ہو گیا تھا۔

یہ لڑکا ابھی صرف ایک ہفتہ کا ہوگا کہ سوتا ہوا اپنے ماں کے پہلو سے چرالیا

گیا اور پرورش کے لیئے ایک معمولی کسان کو دیدیا گیا جو ایک دن سے زیادہ کی مسافت پر جنگل کے ایک دور افتادہ حصہ میں رہا کرتا تھا اور حسین شہزادی کا یہ حشر ہوا کہ ٹھیک اسوقت جبکہ معتمد شاہی بچہ کو اپنے آگے گھوڑے کی زین پر لٹا کرلے گیا، اور اس نے اپنے تھکے ہوئے مرکب سے اتر کر اس غریب گڈریہ کی جھونپڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس شہزادی کی لاش ایک ویران قبرستان میں قبر کے اندر اتاری جارہی تھی جہاں ایک اور لاش بھی پہلے سے موجود تھی جو کسی نہایت ہی جمیل مگر اجنبی نوجوان کی تھی اس کے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے ایک رسّی سے بندھے ہوئے تھے، اور اس کے سینہ پر خنجر کے بہت سے سرخ سرخ زخم تھے، اطبار دربار تو یہ کہتے تھے کہ شہزادی کی موت فرطِ غم یا طاعون سے واقع ہوئی لیکن بعض لوگ یہ بیان کرتے ہیں جب شہزادی بیدار ہوئی تو کوئی نہایت سریع الاثر اطالوی زہر شراب کے ایک جام میں ملاکر اس کو پلادیا گیا۔ جس کے اثر سے وہ ایک گھنٹہ کے اندر مرگئی۔

جب بڈھا بادشاہ مرض الموت میں گرفتار ہوکر صاحب فراش ہوا تو اس نے یا تو اپنے گناہ سے پشیمان ہوکر یا اس خیال سے کہ سلطنت اس کے خاندان سے باہر نہ نکلے، اس لڑکے کو بلا بھیجا، اور ارباب حکومت کے سامنے اپنا ولیعہد تسلیم کرلیا اس اولین لمحہ میں جب وہ ولیعہد تسلیم کیا گیا، اس کا ذوق حسن پسندی ظاہر ہوگیا تھا جو لوگ اسکی معیت میں رہتے تھے ان کا بیان ہے کہ جب خوبصورت زرکار ملبوس اور جواہر کو دیکھتا جو اس کے لیئے فراہم کیئے گئے تھے تو اس کے منھ سے بے ساختہ نعرۂ مسرت نکل جاتا۔ اور فرط مسرت سے اپنا چرمی کرتا اور بھدی پوستین اتار کر پھینک دیتا اگرچہ بعض اوقات اپنی صحرائی زندگی کی دل پسند آزادی کا خیال بھی اسے آجاتا تھا اور وہ اکثر ان تکلیف دہ درباری مراسم کا مذاق بھی اُڑاتا تھا جن میں دن کا بڑا حصہ اسے ہر روز گزارنا ہوتا تھا۔ لیکن اس کے

ساتھ ہی اس کا شاندار محل بھی اسے ایک نئی دنیا نظر آتا تھا۔ جو اس کے عیش و
وراحت اور مسرت وشادمانی کے لیئے از سر نو آراستہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ جونہی
اسے بزم مشاورت یا ایوان دربار سے فرصت ملتی، وہ دوڑ کر محل کے اس عظیم الشان
زینہ پر چڑھ جاتا جس کی سیڑھیاں چمکدار سنگ سماق کی تھیں اور جس کے دونوں
طرف طمع کئے ہوئے برنجی شیر نصب تھے، محل میں پہونچ کر ایک کمرے سے دوسرے
کمرے میں اور ایک غلام گردش سے دوسری غلام گردش میں اس طرح پھرتا گویا
وہ ان مناظر جمیل میں اپنے زخم کا مرہم اور درد کا علاج ڈھونڈھ رہا تھا

چہل قدمی اسکے لیئے ایک ایسی سیاحت تھی جس کے ذریعہ سے گویا وہ کسی طلسم بند
سرزمین میں پہونچ جاتا تھا، اور وہاں کے حیرتناک مناظر میں یکسر غرق ہو جاتا تھا،
اس سیاحت میں اکثر وبیشتر وہ تنہا ہوتا، لیکن کبھی کبھی وہ چند نازک بدن عنبرین
مو نوجوان خدام بھی ساتھ ہوتے، جن کی ڈھیلی عباؤں کے دامن اور خوش رنگ
فیتے ہوا میں اڑکر رنگین تموج پیدا کرتے تھے، لیکن اس کا یہ احساس ہمیشہ تنہائی
میں بیدار ہوتا کیونکہ فنون لطیفہ کے اسرار خلوت ہی میں خوب منکشف ہوتے ہیں
اور حسن وجمال کی دیوی اسی پرستار کو عزیز رکھتی ہے جو اسکی پرستش تنہائی میں
کرے۔

اسی زمانہ میں اس کے متعلق بہت سی عجیب وغریب باتیں بیان کی جاتی
تھیں، ایک قصہ یہ تھا کہ کسی تنومند اور لحیم شحیم امیر نے جو شہر کے لوگوں کے سامنے
ایک تقریر میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے آیا تھا، نوعمر شاہزادہ کو ایک
بڑی تصویر کے آگے جو ابھی وینس سے آئی تھی، اس طرح دوزانو بیٹھے ہوئے عالم
محویت میں دیکھا گویا وہ سچ مچ اس کی پوجا کر رہا ہے اور اس طرح شاید اب
ملک میں بعض جدید دیوتاؤں کی پوجا کا رواج ہونے والا ہے۔ ایک اور موقعہ

پر نوعمر شہزادہ کئی گھنٹے تک مسلسل لوگوں کی نظروں سے غائب رہا اور کافی تجسس کے کے بعد جب اسے قصر شاہی کے شمالی برج میں دیکھا گیا تو یہ حالت تھی کہ وہ عالم محویت میں ایک پتھر کی طرف دیکھ رہا تھا، جس پر ایڈونیس کی تصویر کندہ تھی، ایک قصہ یہ بھی ہے کہ ایک روز اسے اس حالت میں دیکھا گیا کہ حسین بُت کی مرمریں پیشانی کو بوسہ دے رہا تھا، یہ بت ایک بُت ایک سنگین پل کی تعمیر کے وقت دریا کی تہہ سے برآمد ہوا تھا، اور اس پر شہنشاہ ہیڈرین کی ایک خوبصورت کنیز کا نام کندہ تھا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ رات بھر بیٹھا دیکھتا رہا کہ اینڈیمیون کے نقرئی بُت پر چاندنی کا کیا اثر ہوتا ہے۔

الغرض تمام نادر اور بیش قیمت چیزیں اس کے لئے ایک زبردست کشش رکھتی تھیں اور بیش قیمت چیزوں کے شوق میں اس نے بہت سے تاجر دوسرے ملکوں کی طرف روانہ کئے۔ بعض کو شمالی سمندروں کی طرف بھیجا کہ وہاں کے ماہی گیروں سے عنبر خرید کر لائیں۔ بعض کو مصر روانہ کیا کہ وہاں سے عجیب و غریب نادر و بیش قیمت سبزی مائل فیروزے مول لائیں جن میں خاص طلسمی خاصیتیں بیان کی جاتی ہیں، اور جو صرف فراعنۂ مصر کی قبروں میں دستیاب ہوتے ہیں، کچھ تاجر ایران بھیجے گئے کہ وہاں سے ریشمی قالین اور منقش ظروف حاصل کریں۔ کچھ ہندوستان کی طرف روانہ کئے گئے تاکہ یہاں سے باریک تنزیب، منقش ہاتھی دانت کا سامان، نیلم کے کنگن، صندل اور نفیس پشمینہ کے دوشالے فراہم کر کے لائیں۔

لیکن سب سے زیادہ توجہ نوعمر شاہزادہ کی اپنی اس پوشاک پر تھی جسے وہ تاجپوشی کے روز پہننے والا تھا، یہ پوشاک نہایت قیمتی زربفت کی بنائی گئی تھی، تاج جواہر نگار تھا، جس میں بڑے بڑے قیمتی لعل نصب تھے اور عصائے شاہی پر دُرہائے شاہوار جڑے گئے تھے وہ اپنے پر تکلف بستر پر لیٹا ہوا شاہ بلوط کی اس

لکڑی کو دیکھ رہا تھا جو کھلے آتشدان میں جل کر غائب ہوتی جاتی تھی، اور انھیں باتوں پر غور کر رہا تھا۔ مہینوں پہلے بڑے بڑے ماہرین فن نے بہترین نمونے اس کے پاس بھیج دئے تھے، اور اس نے تمام مشہور کاریگروں کو طلب کر کے حکم دیدیا تھا کہ شب و روز محنت کر کے ان کو تیار کریں، وہ عالم خیال میں اپنے آپ کو شاہی لباس پہنے بڑے گرجا میں کھڑا دیکھتا تھا اور اسی سر کی جھلک اسکی سیاہ وحشی آنکھوں میں بھی نظر آتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دود کش کے منقش چھجے کے سہارے سے کھڑا ہو کر کمرہ میں جہاں اسوقت بھی دھیمی روشنی تھی چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دیواروں پر بیش قیمت مشجر کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کمرہ کے ایک کونے میں کپڑوں کی ایک خوبصورت الماری سجی ہوئی تھی جس پر عقیق اور لاجورد سے مینت کاری کی گئی تھی۔ اور دریچے کے سامنے ایک عجیب وضع کی بند الماری تھی جس پر طلائی تاروں کے علاوہ مرگانات کا بھی کام تھا۔ اس پر شہر وینس کے بنے ہوئے چند نہایت نازک اور خوبصورت بلورین جام رکھے ہوئے تھے اور سیاہ رنگوں والے سنگ سلیمانی کا پیالہ بھی رکھا ہوا تھا۔ ریشمی پلنگ پر زرد ریشم سے لالہ کے پھول کاڑھے گئے تھے، جو ایسے معلوم ہوتے تھے گویا کسی سونے والے کے ہاتھ سے عالم بیخبری میں ابھی ابھی بستر پر گرے ہیں۔ پلنگ کا مخملی شامیانہ ہاتھی دانت کے ڈنڈوں پر تنا ہوا تھا، جس کے کنارے نقرئی جھالر لٹکی ہوئی تھی۔ چھت میں شتر مرغ کے پروں کے بڑے بڑے گچھے آویزاں تھے، جو بالکل کف دریا معلوم ہوتے تھے۔ شامیانہ کے اوپر یونانیوں کے خود پرست دیوتا نارسی سسس کا ایک سبز برنجی بت نصب تھا جس کے ہاتھ میں ایک صیقل کیا ہوا آئینہ تھا، اور میز پر نیلم سے تراشا ہوا ایک کھلے منہ کا چوڑا پیالہ رکھا ہوا تھا۔

محل سے باہر اسے بڑے گرجا کا عظیم الشان گنبد ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تاریک سمندر میں کوئی بڑا حباب تیر رہا ہے۔ دریا کے کنارے پشتہ پر سپاہی مستی کے ساتھ اِدھر اُدھر سے ٹہلتے ہوئے بھی دکھائی دیتے تھے اور فاصلہ پر کسی باغ میں ایک بلبل چہک رہا تھا۔ کھڑکیوں سے بھینی بھینی خوشبو کمرہ کے اندر آرہی تھی اس نے اپنے سنہر بالوں کو جو پیشانی پر منتشر تھے، انگلیوں سے شانہ کر کے پیچھے ہٹا دیا اور اپنی بانسری لیکر ایک دل آویز راگنی چھیڑی۔ اسکی لمبی لمبی پلکیں آنکھوں پر جھک آئیں اور عجیب قسم کی سستی بدن پر طاری ہونے لگی۔

جس وقت گھنٹہ گھر میں بارہ بجے اس نے ایک گھنٹی بجائی خدام فوراً حاضر ہوئے اور نہایت سلیقہ کے ساتھ اس کا لباس اتارا۔ گلاب سے اسکے ہاتھ دھلائے اور سیج پر پھولوں کے تکیے لگا دئیے۔ چند منٹ بعد یہ کمرہ سے نکل کر باہر چلے گئے جب شہزادہ سو گیا تو اس نے خواب دیکھا کہ:۔

"وہ ایک لمبی مگر نیچی چھت کے بالا خانہ پر کھڑا ہوا ہے اور اس کے چاروں طرف کپڑا بننے کے کرگھے چل رہے ہیں جن سے ایک شور برپا ہے۔ کھڑکیوں میں سے آفتاب کی دھندلی روشنی اندر آرہی ہے اور اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ جلاہوں کے لاغر نحیف جسم آگے کو جھکے ہوئے ہیں۔ سامنے کے بڑے تختوں پر زرد رو، بیمار صورت بچے پیٹ کے بل پڑے لوٹ رہے ہیں۔ جب تانے کے اندر نلیاں دوڑتی ہیں تو وہ بھاری راچھ کو اُبھار دیتے ہیں اور جب نلیاں رک جاتی ہیں تو وہ راچھ کو گرا کر تاگا ٹھوکتے ہیں۔ ان کے چہروں سے افلاس برستا ہے اور نقاہت سے ان کے پتلے دبلے ہاتھ کانپ رہے ہیں چند لاغر ناتواں عورتیں ایک میز کے سامنے بیٹھی ہوئی

سینے پرو تے ہیں مصروف ہیں چاروں طرف سخت بدبو پھیل رہی ہے، ہوا کی عفونت سے دم گھٹا جاتا ہے۔"

نوعمر شہزادہ ایک جلاہہ کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا اور اس کے کام کو دیکھنے لگا۔ جلاہہ نے آنکھ اٹھا کر سخت نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

" تو کون ہے اور یہاں کھڑا ہوا مجھے کیوں دیکھ رہا ہے؟ کیا تو ہمارے مالک کا بھیجا ہوا کوئی جاسوس ہے؟۔"

شہزادہ:۔" تمھارا مالک کون ہے؟۔"

جلاہہ"۔ (تیوری پر بل ڈال کر) ہمارا مالک! وہ بھی مجھ جیسا ایک آدمی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ میں چیتھڑے پہنے پھرتا اور وہ اعلیٰ درجہ کی پوشاک پہن کر نکلتا ہے اگر میں فاقے کرتے کرتے ضعیف و ناتواں ہو گیا ہوں، تو اسے سوء ہضم کی حد تک کھا لینے میں بھی تکلف نہیں ہوتا۔"

شہزادہ:۔ ملک آزاد ہے۔ تم کسی کے غلام نہیں ہو۔"

جلاہہ:۔" جب جنگ ہوتی ہے تو طاقتور کمزوروں کو غلام بنا لیتے ہیں۔ اور جب امن ہوتا ہے تو مالدار مفلس کو غلام بناتے ہیں ہم لوگوں کو زندہ رہنے کے لئے کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ ہم کو اس قدر ذلیل اجرت دیتے ہیں کہ مشکل سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ ہم دن بھر محنت کرتے ہیں اور وہ اپنے خزانوں میں دولت جمع کرتے جاتے ہیں ہمارے بچے گھل گھل کر قبل از وقت مر جاتے ہیں۔ ہم لوگ انگوروں کو نچوڑ نچوڑ کر اپنے ہاتھ دکھاتے ہیں اور دوسرے شراب پیتے ہیں۔ ہم کھیت میں بیج بوتے ہیں اور ہماری گھر غلہ سے خالی رہتا ہے۔ ہم طوق و سلاسل میں گرفتار رہتے ہیں۔ لیکن کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ ہم غلام ہیں اور لوگ ہمیں آزاد کہتے ہیں۔"

شہزادہ:۔ "کیا تم سب کا یہی حال ہے۔"

جلاہہ:۔ "جی ہاں سب کا یہی حال ہے۔ جوان سے لیکر بوڑھے تک۔ مرد سے لے کر عورت تک۔ اور بچہ سے لیکر ضعیف تک کا یہی حال ہے۔ سوداگر ہمیں پیسے ڈالتے ہیں۔ اور ہمیں ان کے حکم کی تعمیل کرنا پڑتی ہے۔ پادری صاحب رہوار پر سوار تسبیح پڑھتے ہوئے پاس سے نکل جاتے ہیں، لیکن ہم سے نہیں پوچھتے کہ تمھارا کیا حال ہے؟ الغرض ہماری تاریک گلیوں میں سوائے افلاس کے کچھ نہیں ہے ہمارے دن ایک مستقل مصیبت ہیں۔

اور ہماری راتیں عذاب، لیکن تمھیں ان باتوں سے کیا غرض؟ تم تو ہم میں سے نہیں ہو، تمھارا چہرہ تو بہت شاداب ہے۔"

یہ کہہ کر جلاہہ نے شہزادہ کی طرف سے منھ پھیر لیا اور تانے کے اندر پھر نلی کو دوڑانے لگا نوعمر شہزادہ نے دیکھا کہ نلی میں کلابتون کا تار ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے جلاہہ سے پوچھا:۔

"یہ کپڑا تم کس لیے بن رہے ہو؟"

جلاہہ:۔ "یہ تھان اس پوشاک کے لیئے تیار کیا جا رہا ہے جسے نوعمر شاہزادہ تاجپوشی کے دن پہنے گا۔ لیکن تمھیں ان باتوں سے کیا غرض ہے؟"

یہ سنتے ہی شہزادہ کے منھ سے ایک زور کی چیخ نکلی اور آنکھیں کھل گئیں۔ غرفہ سے اس نے دیکھا کہ سفید چاند تاریک فضا میں معلق ہے اس کے بعد وہ پھر سو گیا اس نے خواب میں دیکھا کہ۔

"ایک بہت بڑی کشتی ہے جسے سنو غلام چلا رہے ہیں اسکے پہلو میں کشتی کا مالک ایک قالین پر بیٹھا ہوا ہے۔ یہ شخص ایک سیاہ فام حبشی ہے جس کے سر پر قرمزی رنگ کا ریشمی عمامہ ہے چاندی کے بڑے بڑے بالے کان کی موٹی لوؤں میں لٹک

رہے ہیں اور اس کے ہاتھ میں ہاتھی دانت کی ترازو ہے۔

پھٹے ہوئے تہمد کے سوا غلاموں کے بدن پر کچھ نہ تھا۔ اور ہر غلام اپنے برابر والے ساتھی سے زنجیر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ تیز دھوپ ان لوگوں کے سر پر پڑ رہی تھی۔ یہ غلام اپنے لاغر بازو پھیلا کر بھاری بھاری چپو چلا رہے تھے جن سے کھاری پانی کی چھینٹیں اڑ رہی تھیں۔ یہ کشتی ایک چھوٹی سی خلیج میں پہونچی۔ ساحل کی طرف سے ایک ہوا چلی اور عرشہ و بادبان گرد و غبار سے اٹ گئے۔ اتنے میں تین عرب جو گدھوں پر سوار تھے وہاں پہونچے اور انھوں نے کشتی کے آدمیوں پر نیزے پھینک کر مارے۔ کشتی کے مالک نے ایک رنگین کمان ہاتھ میں اٹھائی، تیر جوڑا اور ایک عرب کو مجروح کر دیا۔ جو سمندر کی موجوں میں گرا اور اس کے دونوں ساتھی بھاگ گئے ان کے پیچھے پیچھے ایک عورت آہستہ آہستہ اونٹ پر سوار جا رہی تھی جو مڑ مڑ کر مقتول عرب کی لاش کو دیکھتی جاتی تھی۔

کشتی لنگر انداز ہوئی۔ بادبان اتارے گئے۔ حبشی اندر سے رسی کی بنی ہوئی ایک سیڑھی لائے جو سیسہ باندھ کر وزنی کر دی گئی تھی۔ کشتی کے مالک نے وہ سیڑھی کشتی کے پہلو میں پھینکی اور اوپر کا سرا دو آہنی حلقوں میں مضبوط باندھ دیا۔ اس کے بعد حبشیوں نے ایک سب سے کم عمر غلام کو پکڑا۔ اس کے پاؤں کی زنجیریں کھول دیں، اس کے نتھنوں اور کانوں میں موم کی ڈاٹ لگائی اور اس کی کمر سے ایک بھاری پتھر باندھ دیا۔ وہ غلام آہستہ آہستہ سیڑھی کے ذریعہ نیچے اترا اور غوطہ مار کر سمندر میں غائب ہو گیا جہاں اس نے غوطہ لگایا تھا وہاں بلبلے اٹھنے لگے اور کشتی کے سرے پر ایک شخص ڈھول بیٹ بیٹ کر کوئی افسوں پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ غوطہ خور غلام پانی سے باہر نکلا اور ہانپتا ہوا سیڑھی سے چمٹ گیا۔ اسکے داہنے ہاتھ میں ایک موتی تھا۔ حبشیوں نے وہ موتی اس سے چھین

لیا اور غوطہ کھانے کے لیئے پھر لوٹا دیا۔ غلام ہاتھوں میں چپو لئے اسیطرح پانی پر تیر سو گئے وہ غوطہ خور غلام بار بار پانی پر اُبھرتا اور ہر مرتبہ اپنے ساتھ ایک خوبصورت موتی لاتا۔ کشتی کا مالک کانٹے میں رکھ کر ان موتیوں کو تولتا اور ایک سبز رنگ کی چرمی تھیلی میں ڈالتا جاتا۔

نوعمر شہزادہ نے بات کرنا چاہی لیکن اسکی زبان نے کام نہ دیا۔ اور لب نہ کھلے تھوڑی دیر بعد حبشی ایک خوبصورت ہار پر آپس میں لڑ پڑے۔ دوسارس آئے اور کشتی کے گرد چکر لگانے لگے۔

غوطہ خور آخری مرتبہ باہر آیا اور اس مرتبہ جو موتی اسکے ہاتھ میں تھا وہ جزیرہ ہرمز اور بحرین کے تمام موتیوں سے زیادہ خوش آب تھا۔ اسکی شکل بدر کامل سے مشابہ تھی اور وہ ستارۂ صبح سے زیادہ درخشاں تھا۔ لیکن اسوقت غوطہ خور کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا تھا۔ اور جونہی وہ کشتی میں آیا گر پڑا اور اسکے کانوں اور نتھنوں سے خون جاری ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کانپتا رہا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ حبشیوں نے اٹھ کر اسکی لاش سمندر میں پھینک دی۔ کشتی کا مالک خوب ہنسا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ موتی لے لیا۔ جونہی اس نے پیشانی سے لگا کر سر جھکایا اور کہنے لگا۔ یہ موتی نوعمر شاہزادہ کے عصا میں جڑا جائے گا۔" اس کے بعد اس نے حبشیوں کو لنگر اٹھانے کا حکم دیا۔"

جب نوعمر شاہزادہ نے یہ بات سنی تو اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ جاگ پڑا۔ کھڑکی سے باہر نظر ڈالی تو دیکھا کہ صبح کی نورانی انگلیاں کملائے ہوئے ستاروں کے پھول چن رہی ہیں۔

اس کے بعد شہزادہ پھر سو گیا اور اس نے خواب میں دیکھا:۔

" وہ ایک تاریک گھنے جنگل میں پھر رہا ہے۔ جس کے درختوں میں عجیب

قسم کے پھل اور خوبصورت زہریلے پھول لگے ہوئے ہیں۔ جس وقت وہ جنگل میں قدم اٹھاتا تھا تو کالے ناگ پھنکار مارتے تھے اور خوبصورت پروں والے طوطے شاخ بہ شاخ اڑتے پھرتے تھے۔ گرم کیچڑ پر بڑے بڑے کھوے پڑے سو رہے تھے اور تمام درختوں پر طاؤس اور بندر بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ آگے بڑھتا چلا گیا دیکھا کہ آدمیوں کا ایک گروہ خشک دریا کی زمین پر جمع ہے، دریا کے کنارے ٹیکرے پر آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں۔ اور وہ لوگ دریا کی تہہ میں گہرے گڑھے کھود کر ان میں اتر رہے ہیں۔ بعض کے ہاتھوں میں کدالیں تھیں جن سے وہ چٹانیں کھود رہے تھے اور بعض ریت میں کچھ ٹٹول رہے تھے، لوگوں نے ناگ پھنی کے درخت جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک دیے اور اس کے خوبصورت سرخ پھولوں کو پاؤں سے روند ڈالا۔ وہ ایک دوسرے کو بلاتے اور اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے اور کوئی شخص بھی بیکار نہ تھا۔

ایک تاریک غار سے موت اور طمع ان لوگوں کو دیکھ رہی تھیں اتنے میں موت نے کہا"۔ میں بہت تھک گئی ہوں، تم مجھے ان میں سے صرف تیسرا حصہ دیدو اور جانے دو۔"

طمع (سر ہلا کر)" نہیں۔ یہ لوگ میرے خادم ہیں۔ میرے غلام ہیں۔"

موت:" یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے؟۔"

طمع:" میرے پاس غلہ کے تین دانے ہیں، تجھے کیا؟"

موت۔ لاؤ ان میں سے ایک مجھے دیدو۔ میں اپنے باغ میں لگا لونگی بس صرف ایک دیدو میں چلی جاؤں گی۔"

طمع:" میں تجھے کچھ نہ دوں گی"۔ اور یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ دامن میں چھپا لیا۔

موت ہنسی اور ایک پیالہ نکالا اور اسے پانی کے ایک گڈھے میں ڈبویا۔ پیالہ میں سے تپ دلرزہ پیدا ہوا جو اس ہجوم سے گذرا اور تہائی حصہ کو ہلاک کرتا چلا گیا۔

جب طمع نے یہ دیکھا کہ ایک ثلث آدمی ہلاک ہو گئے ہیں تو وہ سینہ کوبی اور گریہ وزاری کرنے لگی اور چیخ کر بولی "ہائے ہائے تو نے میرے ایک تہائی خادم مار ڈالے نکل جا یہاں سے جا اور دیکھ وہ کوہستان تاتار میں جنگ ہو رہی ہے۔ فریقین کے بادشاہ تجھے بلا رہے ہیں۔ وہ دیکھ افغانی میدان جنگ کی طرف کوچ کر رہے ہیں ان کے ہاتھوں میں نیزے اور ڈھالیں ہیں۔ ان کے سروں پر آہنی خود ہیں، جا کمبخت یہاں سے نکل میری وادی میں کیا رکھا ہے جو تو یہاں ٹھہری ہے۔ چل نکل! دور ہو یہاں کبھی نہ آنا۔"

موت۔ "نہیں جب تک تو مجھے غلہ کا ایک دانہ نہ دے گی اس وقت تک میں ہرگز نہ جاؤں گی۔"

طمع۔ "مٹھی بند کر کے اور دانت بھینچ کر، "میں ہرگز تجھے کوئی چیز نہ دوں گی۔"

موت ہنسی۔ اس نے ایک سیاہ پتھر نکالا۔ اور جنگل میں پھینک دیا جو تھوہر کی جھاڑیوں میں جا گرا۔ جھاڑیوں میں شعلہ رنگ بخار پیدا ہوا۔ جو اس ازدہام میں سے گذرا۔ اور جس جس کو اس نے چھوا وہ ہلاک ہو گیا۔ جس گھاس سے وہ بخار گذرتا تھا جل کر رہ جاتی تھی یہ بات دیکھ کر طمع کانپ گئی۔ اس نے اپنے سر پر خاک ڈالی اور چلا کر کہنے لگی "موت تو بڑی ظالم ہے! تو بڑی ستم شعار ہے!! دور ہو یہاں سے جا وہ دیکھ ہندوستان کے شہروں میں قحط پڑ رہا ہے۔ جا سمرقند کے تمام تالاب اور دریا خشک ہو گئے۔ مصر کو دیکھ وہاں کے شہروں میں قحط پڑ رہا ہے۔ وہاں ریگستان سے ٹڈی دل آگیا ہے اسمال دریائے نیل میں

طغیانی نہیں ہوئی اور اس کا پانی کناروں سے نہیں بہا، جا کمبخت وہاں جا جہاں تیری ضرورت ہے اور میرے آدمیوں کو چھوڑ۔"

موت۔ "نہیں جبتک تو مجھے غلہ کا ایک دانہ نہ دے گی میں ہرگز نہ جاؤں گی۔"

طمع۔ "میں تجھے ہرگز کوئی چیز نہ دوں گی۔"

موت پھر ہنسی۔ اس نے منہ میں انگلیاں ڈالیں اور سیٹی بجائی۔ فوراً ایک عورت ہوا میں اُڑتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اس کی پیشانی پر "وبا" لکھا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف دُبلے گِدھوں کی ایک ٹکڑی چکر لگا رہی تھی۔ اس عورت نے آتے ہی تمام وادی پر اپنے پر پھیلا دئے اور ایک متنفس بھی زندہ نہیں رہا۔ یہ دیکھ کر طمع چیختی چلاّتی جنگل میں بھاگی۔ موت بھی اُچک کر اپنے سرنگ گھوڑے پر سوار ہوئی اور سرپٹ دوڑ گئی۔ وادی کی تہہ میں جو کیچڑ تھی۔ اس میں اژدھے اور دوسرے خوفناک حشرات پیدا ہوئے۔ گیدڑ ریت پر دوڑتے ہوئے آئے اور اپنی تھوتھنیوں سے ہوا کو سونگھنے لگے، یہ باتیں دیکھ کر نوعمر شہزادہ رو دیا۔ اور بولا۔

"یہ کون لوگ تھے اور کیا ڈھونڈھ رہے تھے؟"

ایک آواز۔ "تاج شاہی کے لئے لعل نکال رہے تھے۔"

یہ آواز سن کر بادشاہ چونکا۔ منہ پھیر کر دیکھا تو ایک شخص جاتریوں کا لباس پہنے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں چاندی کا شفاف آئینہ تھا۔ اسوقت شہزادہ کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اس نے پوچھا:۔

"کس بادشاہ کے تاج کے لئے؟"

جاتری۔ "اس آئینہ میں دیکھو، تمھیں اس کی صورت نظر آئے گی۔"

شہزادہ نے آئینہ میں دیکھا تو اپنی ہی صورت نظر آئی۔ اس کے منہ سے ایک

زبردست چیخ نکلی اور وہ بیدار ہو گیا۔ آفتاب کی منور شعاعیں کمرہ میں کھیل رہی تھیں اور قصر شاہی کے باغ میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

افسر تشریفات اور دیگر ارکان دولت حاضر ہوئے اور مجرا عرض کیا۔ خدام نے تاج عصا اور لباس زرکار سامنے لاکر پیش کیا۔

نوعمر شہزادہ نے ان چیزوں کی طرف دیکھا یہ تینوں بہت خوبصورت تھیں اس قدر خوبصورت کہ آجتک کوئی ایسی خوبصورت چیز اس کی نظر سے نہ گذری تھی۔ لیکن شہزادہ کو رات کے خواب کی باتیں یاد تھیں۔ اس لیئے اس نے امراء سے کہا۔" یہ چیزیں میرے سامنے سے اٹھا کے لے جاؤ۔ میں انھیں کبھی نہیں استعمال کروں گا"۔

ارکانِ دولت سخت حیران ہوئے اور بعض تو یہ خیال کر کے کہ شہزادہ مذاق کر رہا ہے ہنس بھی پڑے، لیکن شہزادہ نے دوبارہ سختی سے کہا"۔ لے جاؤ یہ چیزیں اور کہیں چھپا دو تاکہ میری نظر ان پر نہ پڑے۔ ہر چند آج میری تاجپوشی کا دن ہے۔ مگر میں انھیں ہرگز نہیں استعمال کروں گا۔ کیونکہ یہ لباس" رنج و غم" کے کرگھے پر بنا گیا ہے اور" درد کرب" کے ضعیف ہاتھوں نے تیار کیا ہے۔ ان لعلوں کے جگر میں خون اور ان موتیوں کے قلب میں موت ہے"۔ اس کے بعد شہزادہ نے لوگوں سے اپنے تینوں خواب بیان کیئے جب اہل دربار نے خواب کی باتیں سنیں تو وہ باہم سرگوشیاں کرنے لگے۔" یقیناً شہزادہ پاگل ہو گیا ہے۔ کیونکہ خواب تو آخر خواب ہی ہوتا ہے۔ اسکا کیا اعتبار؟ وہ کوئی اصلی باتیں تو ہوتی نہیں جو ان کی پروا کی جائے اور پھر سوچئے تو سہی ہمیں ان لوگوں کی جانوں سے کیا تعلق جو ہمارے لیئے محنت کرتے ہیں۔ کیا کوئی آدمی روٹی نہیں کھاتا۔ جب تک پکانے والے کو نہ دیکھ لے یا شراب نہیں پیتا جب تک بنانے والے کی صورت نہ دیکھے؟"۔

اسکے بعد افسر تشریفات نے نوعمر شہزادہ سے عرض کیا" ولی نعمت اس قسم کے

الم انگیز خیالات کو اپنے دل سے نکال دیجئے، یہ لباس زیب تن فرمائیے اور اس تاج کو سر پر رکھئے۔ اگر لباس شاہی جسم پر نہ ہو تو لوگوں کو کیونکر معلوم ہوگا کہ ان کا بادشاہ اور آقا کون ہے؟"۔

شہزادہ"..... (غور سے دیکھ کر) کیا واقعی اگر میں یہ لباس نہ پہنوں تو لوگ مجھے اپنا بادشاہ نہ جانیں گے؟۔"

افسر تشریفات"۔ بے شک نہیں جانیں گے"۔

شہزادہ"۔ میں خیال کرتا تھا کہ دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی صورت سے بادشاہی ٹپکتی ہے۔ لیکن میں شاید ان میں نہیں ہوں۔ بہرحال نہ میں یہ لباس پہنوں گا۔ نہ یہ تاج سر پر رکھوں گا۔ بلکہ جس حالت سے اس قصر شاہی میں داخل ہوا تھا اسی حالت کے ساتھ نکل جاؤں گا"۔

یہ کہہ کر شہزادہ نے ایک خادم کے سوا جو اس سے ایک سال عمر میں کم اور اسکا رفیق تھا۔ سب آدمیوں کو چلے جانے کا حکم دیدیا۔ اس نے صاف پانی سے غسل کیا ایک بڑا رنگین صندوق کھولا اور اس میں سے اپنی پرانی چرمی قمیص اور کھدری پوستین نکالی۔ یہ وہ لباس تھا۔ جسے وہ پہاڑی کے اطراف میں بھیڑ بکریاں چراتے وقت پہنا کرتا تھا۔ اس نے یہ لباس پہنا اور مویشی ہانکنے والا ڈنڈا ہاتھ میں لے لیا۔

نوعمر خادم نے کہا:" خیر! لباس شاہی' اور عصائے شہریاری تو ہوگیا، لیکن تاج خسروی کہاں ہے؟"۔

یہ سن کر نوعمر شہزادہ نے ایک جنگلی بیل کی شاخ توڑی جو بالاخانہ پر چڑھی ہوئی تھی موڑ کر اسکا ایک حلقہ بنایا اور سر پر رکھ کر بولا:" دیکھو یہ میرا تاج خسروی"۔

یہی لباس پہنے ہوئے وہ اپنے کمرہ سے نکل کر ایوان عام میں پہونچا۔ جہاں امراء

دولت اور رعایان سلطنت اس کے منتظر تھے۔

یہ حال دیکھ کر لوگ ہنس پڑے۔ اور بعض نے کہا" لوگ بادشاہ کے منتظر ہیں، نہ کہ فقیر کے"۔ بعض بگڑ کر بولے" اس شخص نے ہماری سلطنت کو ذلیل کر دیا یہ ہمارا بادشاہ بننے کے قابل ہرگز نہیں"۔ لیکن نوعمر شاہزادہ نے کسی کی بات کا جواب نہ دیا بلکہ نکلا چلا گیا۔ وہ سنگ سماق کے چمکدار زینہ سے اترا۔ برنجی پھاٹکوں سے باہر نکلا اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور سیدھا گرجا کی طرف چلا۔ ایک آدمی مجمع سے نکل کر شہزادہ کے پاس آیا اور بگڑ کر بولا۔ آپ نہیں جانتے کہ امراء کی عیش پسندیاں غرباء کی زندگی ہیں، آپ کے جاہ و حشم سے ہماری پرورش ہوتی ہے اور آپ عیبوں اور گناہوں سے ہم کو روٹیاں ملتی ہیں ایک سخت گیر آقا کے لیے محنت کرنا ضرور ناگوار گزرتا ہے لیکن یہ اس سے بھی زیادہ برا ہے کہ کوئی آقا ہی نہ ہو، جس کی خدمت کی جائے، کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ چیلیں کوے ہماری بوٹیاں نوچ کر کھائیں؟ بتایئے آپ نے ان تمام باتوں کا کیا علاج سوچا ہے۔ کیا آپ کسی خریدار سے یہ کہیں گے کہ" اتنا سودا نہ خریدو" یا دوکاندار کو یہ حکم دیں گے کہ یہ مال اس قیمت کو فروخت کرو"۔ میں یقین کرتا ہوں۔ آپ ایسا نہیں کریں گے لہذا جایئے اور اپنے محل کو تشریف لے جایئے۔ اور اپنا نفیس لباس اور زرکار پوشاک زیب تن فرمایئے۔ آپ کو کیا معلوم کہ آپ ہمارے ساتھ کیا کر رہے ہیں اور ہم کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے؟"۔

شہزادہ" تو کیا امیر و غریب بھائی بھائی نہیں ہیں؟"

آدمی۔ ہیں تو سہی لیکن امیر بھائی کا نام قابیل ہے"۔

یہ سنکر نوعمر شہزادہ کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ اور مجمع کو چیرتا پھاڑتا نکلا چلا گیا لیکن وہ چھوٹا سا خادم ڈرا اور اسکا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ جب نوعمر

شہزادہ بڑے گرجا کے پھاٹک پر پہونچا تو اسے دیکھ کر فوجی سپاہیوں نے شمشیریں کھینچ لیں اور بولے:۔ "تو کون ہے ؟ تو یہاں کیا لینے آیا ہے ؟ اور اس دروازہ سے بادشاہ کے سوا اور کوئی داخل نہیں ہوسکتا"۔

شہزادہ کا چہرہ غصّہ سے تمتما گیا۔ اور اس نے سپاہیوں سے کہا "میں ہی بادشاہ ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے سپاہیوں کی تلواریں ہٹادیں اور اندر داخل ہوگیا۔

جب بڈھے اسقف نے اسے اس طرح ایک گڈریہ کے لباس میں آتے دیکھا تو وہ حیرت زدہ ہوکر اٹھا اور بولا "کیا یہی بادشاہ کا لباس ہے۔ میں کس تاج میں تمھاری رسم تاجپوشی ادا کردوں اور کون سا عصا تمھارے ہاتھ میں دوں۔ یقیناً آج کا دن تو تمھارے لیے مسرت و شادمانی کا دن ہونا چاہیئے نہ کہ ذلّت و رسوائی کا۔"

شہزادہ "رنج و غم کے ہاتھوں کی بنائی چیزیں مسرت و شادمانی پیدا کرسکتی ہیں"

اس کے بعد شہزادہ نے اپنے تینوں خواب سنائے۔ خواب سنکر اسقف کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور اس نے شہزادہ سے کہا "میں بڈھا آدمی ہوں، اور خزاں رسیدہ میں جانتا ہوں کہ دنیا میں بہت سی باتیں بری ہوتی ہیں۔ خونخوار ڈاکو پہاڑوں سے اتر کر تاخت کرتے ہیں، چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ لے جاتے ہیں۔ اور انھیں عربوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ قافلوں کے راستے میں شیر چھپے بیٹھے رہتے ہیں جو کمین گاہوں سے نکل کر اونٹوں پر حملہ کرتے ہیں۔ وادیوں میں جنگلی سور فصلیں کھود ڈالتے ہیں۔ اور پہاڑیوں پر لومڑیاں انگوروں کی بیلیں کاٹ ڈالتی ہیں۔ بحری قزاق ساحلوں کو اجاڑ دیتے ہیں، ماہی گیروں کے جہاز پھونک دیتے ہیں، شورزمین کی دلدلوں میں جذامی رہتے ہیں۔ ان کی جھونپڑیاں گھاس پھوس سے بنائی جاتی ہیں اور کوئی ان کے پاس

نہیں جاتا۔ بھکاری شہروں میں پھرتے اور کتوں کے ساتھ کھاتے ہیں۔ کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ یہ باتیں نہ ہونے پائیں۔ کیا تم کسی جذامی کو اپنے بستر پر لیکر سو جاؤ گے یا کسی فقیر کو اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھالو گے؟ کیا شیر ببر تمہارے حکم کی تعمیل کریں گے، کیا جنگلی سور تمہارا کہنا مانیں گے۔ کیا وہ خدا نہیں جس نے محتاجوں اور مصیبت زدہ لوگوں کو تم سے زیادہ عقلمند بنایا ہے۔ بہر حال جو کچھ تم نے کیا ہے، میں اس کو پسند نہیں کر سکتا۔ اور تم سے کہتا ہوں کہ قصر شاہی واپس جاؤ۔ اور جو لباس بادشاہوں کے لائق ہے اسے پہنو۔ پھر تمہارے سر پر طلائی تاج رکھوں گا۔ اور عصائے شاہی تمہیں دونگا ایک آدمی کا کام نہیں کہ تمام دنیا کا بوجھ اٹھا سکے۔ اکیلا دل دنیا بھر کا رنج و غم برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اے شخص تو خدا کے گھر میں بیٹھ کر ایسی باتیں کہتا ہے؟" نوعمر شاہزادہ نے کہا اور اسقف کے پاس سے گزر کر قربان گاہ کے زینہ پر چڑھ گیا۔ اور مسیح کے بت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

وہ مسیح کے بت کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے داہنے بائیں نہایت خوبصورت طلائی ظروف، شراب کے لبریز جام، اور مقدس تیل سے بھری ہوئی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ وہ مسیح کے بت کے سامنے دوزانو ہو گیا۔ سجدہ گاہ پر بڑی بڑی شمع ہائے کافوری تھیں۔ عنبر کا دھواں بل کھاتا ہوا گنبد کی طرف چڑھ رہا تھا۔ شہزادہ نے سر جھکا کر دعا مانگی اور پادری قربان گاہ کے پاس سے ہٹ کر دور چلا گیا۔

اچانک باہر سڑک سے شور و غل کی آواز آئی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد امرا دو رؤسا شمشیر بکف، خودوں میں کلغیاں لگائے ہوئے اور لپشت پر صیقل شدہ ڈھالیں لٹکائے

گرجا میں داخل ہوئے۔ اور چلائے "کہاں ہے وہ خوابوں کا دیکھنے والا؟ کہاں ہے وہ بادشاہ جو فقیروں جیسا لباس پہنے ہوئے ہے؟ کہاں ہے وہ جو ہماری سلطنت کی ذلت کرتا ہے؟ ہم اسے ضرور مار ڈالیں گے۔ یہ نالائق ہرگز اس قابل نہیں جو ہم پر حکومت کر سکے"۔

نوعمر شاہزادہ نے اپنا سر جھکا لیا اور دعا مانگتا رہا۔ جب وہ اپنی دعا ختم کر چکا تو اٹھ کر کھڑا ہوا اور لوگوں کی طرف دیکھا ٹھیک اسی وقت کھڑکی سے آفتاب کی منور شعاعیں اس پر پڑیں۔ کرنوں نے اسکے جسم کو ایسی نورانی پوشاک پہنا دی جو اس شاہی لباس سے بدرجہا خوبصورت دلفریب تھی۔ اسکے ہاتھ کا خشک عصا خود بخود ہرا ہو گیا۔ اور اس میں سفید کلیاں نکل آئیں جو سچے موتیوں سے زیادہ خوبصورت اور سفید تھیں۔ خشک کانٹے ہرے بھرے ہو گئے، ان میں گلاب کے ایسے پھول نکل آئے جو لعلہائے بدخشاں سے بھی زیادہ خوش رنگ تھے، ان میں موتیوں سے زیادہ سفید پھول پیدا ہو گئے جن کی ڈنڈیاں چاندی کی تھیں۔

نوعمر شاہزادہ لباس شاہی میں کھڑا تھا۔ اور خدا کے جلال کا نور ہر جگہ پھیلا ہوا تھا۔ مخلوق گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ امراء نے اپنی تلواریں جھکا دیں پادری کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ اور وہ بھی شہزادہ کے سامنے گھٹنوں کے بل دوزانو ہو کر بولا "میرے ہاتھوں ایسی تاجپوشی کہاں ہو سکتی تھی؟"

نوعمر شہزادہ قربان گاہ سے نیچے اترا۔ اور مجمع سے گزر کر قصر شاہی کو واپس آ گیا کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ اسکے چہرہ کی طرف دیکھ سکے کیونکہ اسکا چہرہ ایسا تھا جیسے کسی فرشتہ کا۔

(آسکر وائلڈ)

# ولے بخیر گذشت

میری ان کی محبت کا فسانہ اپنے آغاز و انجام اور تمام درمیانی کڑیوں کے لحاظ سے بہت مختصر ہے۔ سینما ہال کے اندر (جبکہ بجلی کی روشنی عورت کو خدا جانے کیا بنا دیتی ہے مرد کا حال نہیں معلوم کہ وہ عورت کی نگاہ میں اسوقت کیسا نظر آتا ہے) انھوں نے مجھے دیکھا۔ اور میں نے ان کو، تماشہ کے دوران میں ایک خاص منظر کے اثر سے ان پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوئی، میں نے سنبھال لیا، ادھر سے شکریہ، ادھر انکسار ——— اس کے بعد ڈرامہ پر تنقید، فلسفۂ محبت پر ہلکی سی گفتگو ——— دوسرے دن صبح چائے کی دعوت اور شام کو انتہائی بے تکلفی ——— یہ تھا اس محبت کا انجام جس کے متعلق ایک ایشائی شاعر خدا جانے یہ کیوں لکھتا ہے:-

من کردہ ام آغاز بہ پایاں کہ رساند

---

میں ہفتہ میں صرف دو بار سینما جانے کا عادی تھا۔ لیکن اب روز کی شرکت ضروری ہوگئی۔ اس سے قبل بکس کے اندر بیٹھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ ہال کے تاریک ہونے کے بعد بکس کی چار سیٹوں کو جب صرف دو آدمی گھیرے ہوتے ہیں تو تماشہ کی طرف سے کیوں بالکل آنکھیں پھیر لی جاتی ہیں۔

بیوی نے ایک دن پوچھا "آجکل روز سینما جانے کی ضرورت کیوں پیدا ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے تو ہفتہ میں صرف دو بار کا معمول تھا۔ آجکل کیا روز نیا تماشہ ہوتا

ہے" ـــــ ان کی گفتگو سے ہمیشہ ایک خاص قسم کی ہیبت اپنے اوپر طاری ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہوں، خاص کر اسوقت جبکہ کبھی معاملہ میں خطا میری ہو۔ میں ان کے پہلے ہی فقرہ سے تقریبًا بدحواس سا ہو گیا تھا، لیکن ان کے آخری فقرہ نے خود جواب کی طرف میری رہبری کی اور میں نے گھبرا کر کہا: "ہاں آج کل روز نیا تماشہ ہوتا ہے"۔

یہ سن کر وہ خاموش ہو گئیں اور میں نے موضوع بدلنے کے لئے فورًا ہی ان کے بھائی کا ذکر شروع کر دیا جن کا خط شام کی ڈاک سے آیا تھا۔

---

"آپ نے دیکھا میری پکفورڈ کی یہ ایکٹنگ کس حد تک غیر فطری تھی"۔

"نہ صرف غیر فطری بلکہ جمالیاتی۔"

"یہ لوگ کیوں اسے "محبوبۂ عالم" کہتے ہیں۔ اس میں آخر وہ کونسی بات ہے جو کسی اور میں نہیں ہو سکتی۔"

"لوگ ہر اس چیز کو "محبوب" بنانے کے عادی ہیں جو انھیں نہ ملے حالانکہ میرے نزدیک یہ بالکل غلط اصول ہے"۔

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور ہال کی تاریکی میں اس نے اپنا سر میری آغوش میں رکھ دیا گویا وہ تھکی ہوئی تھی۔

---

فلم تیزی کے ساتھ "چک، چک" کرتا ہوا ختم ہوا۔ روشنی سے ہال جگمگا اٹھا۔ اور سب سے پہلی چیز جس نے مجھ کو چونکا دیا، وہ ایک ہاتھ تھا۔ جس نے میرے شانوں کو جھنجھوڑ کر رکھدیا۔

"چلئے سواری کا انتظام کیجئے میں تنہا ہوں"۔ یہ میری بیوی کی آواز تھی۔ میری

حالت کیا ہوگی؟ اس کا صحیح اندازہ تو اسی وقت ہو سکتا، جب کوئی شخص میرے اس وقت کی حالت کا فلم تیار کر لیتا۔ لیکن مختصراً و تشبیہاً یوں سمجھ لیجئے کہ اسوقت سارا کرۂ ارض مجھے دلدل نظر آرہا تھا اور اس میں نہایت تیزی سے سمایا جا رہا تھا۔

---

میری بیوی یوں تو صحیح معنی میں بیوی ہے، لیکن ہے آجکل کی بیوی ہر ہر بات پر محاسبہ کرنے والی، تنقید کی اہلیت رکھنے والی، اور ہر طرز عمل کا سبب دریافت کرکے غیر مطمئن رہنے کی حالت میں "ستیاگرہ اور" سوراج" کا اعلان کر دینے والی، اور حقیقت یہ ہے کہ میں ان کی اس آزادی سے برہم بھی نہیں تھا لیکن رات بغیر میرے علم کے، مجھے دھوکا دیکر، جاسوسی کی غرض سے سینما پہونچ جانا اور وہاں اپنے آپ کو ایک سخت ٹریجڈی کی صورت میں میرے سامنے پیش کر دینا یہ باتیں اس درجہ غیر معمولی اور غیر متوقع تھیں کہ جب میں اپنے ہوش میں آیا اور رات کی تنہائی میں ان پر غور کیا تو یکسر ناقابل برداشت نظر آئیں۔ میں بہت صبح اٹھ کر باہر چلا آیا اور غور کرنے لگا کہ دیکھئے نتیجہ کیا ہوتا ہے ——— دفعتہً اندر سے خادمہ آئی اور ملازم کو آواز دی کہ ٹیکسی لاؤ اور اندر آکر اسباب باندھو بیگم صاحب چھوٹے میاں (یعنی اپنے بھائی) کے پاس جائیں گی" ——— ٹیکسی لاؤ ——— اسباب باندھو!! ——— " اب واقعی میرا غصہ بڑھنے لگا اور "الرّجال قوامون علی النسا" کی آیت پر نہایت انہماک سے غور کرنے لگا۔

یہانتک کہ میں نے بھی عزم کر لیا کہ جاتی ہیں تو جائیں۔ نہ روکوں گا اور نہ خود بلاؤں گا۔ اس کے بعد ہی میرا خیال اپنی نئی محبوبہ کی طرف منتقل ہوا اور اس کی بری باتیں بھی مجھے اچھی معلوم ہونے لگیں ——— "کس قدر مہذب و شائستہ ہے، کیسی محبت کرنے والی اور کس درجہ جمیل ہے ——— اگر بیوی نہیں رہتا

چاہتیں تو مناسب ہے طلاق حاصل کر لیں۔ میں بھی آزاد ہو جاؤں گا۔ اور پھر مس .... سے شادی کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوگا، اسی روک کی وجہ سے میں نے ہمیشہ شادی کے ذکر کو ٹالا، لیکن اب خدا کی طرف سے اسباب پیدا ہو رہے ہیں۔" یہ سوچتے ہوئے میں نے خط کا کاغذ نکالا اور قلم ڈبو کر لکھنے ہی والا تھا کہ ——— آدمی آیا اور یہ رقعہ دیکر چلا گیا۔

"کل رات کے واقعہ نے میرے خیال کی دنیا کو بدل دیا ہے کہ آپ اب بھی مجھے مبتلائے فریب رکھنے کی کوشش کریں۔ بہرحال آئندہ کبھی مخاطب کرنے کی زحمت نہ گوارا کیجئے۔ میں آپ کی محبوبہ کے طرزِ عمل سے خوش ہوئی کہ اس نے آپ کے پرفریب خط و خال کو یوں میرے سامنے بے نقاب کر دیا۔ امید ہے کہ اب آپ نکاح کے وعدہ کو میری طرف سے منتقل کر کے انھیں کی خدمت میں پیش کریں گے۔ میں آج نینی تال جا رہی ہوں۔"

خط پڑھ کر ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے، سر چکرانے لگا۔ بدن کا جوڑ جوڑ ڈھیلا ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک اس نیم مردہ حالت میں گزرنے کے بعد پھر ردِ عمل شروع ہوا اور بیوی کے تمام محاسن ایک ایک کر کے میرے سامنے آنے لگے۔ اب مجھے کچھ ہنسی بھی آ رہی تھی کہ بیوقوف نے میری بیوی کو اپنا ہی جیسا آبرو باختہ سمجھ لیا ——— اب یہ جوش پوری قوت کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ اور کشاں کشاں مجھے اندر لیئے جا رہا تھا۔"

---

"جی ہاں، اب میرا رہنا یہاں بیکار ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی بیوی گھر میں نہیں رہ سکتی جب سنیما کا پروگرام روز بدلنے لگا۔

ان کے اس فقرہ پر بے اختیار مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا " اچھا اگر آج سے میں یہ عہد کر لوں کہ سینما کا پروگرام روز نہ بدلے گا تو بھی تم نہ مانوگی، چلی جاؤ گی"

" ہاں چلی جاؤں گی"۔

" کیوں"۔

" اس لئے کہ تمہارا کیا اعتبار۔"

جب ضد دلائل کے حدود میں آجاتی ہے تو ضد نہیں بلکہ رواداری ہوجاتی ہے اسی لئے میں نے اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہا اور حلف کی تمام ممکن صورتوں کے ساتھ میں نے یقین دلایا کہ آئندہ کبھی بغیر تمہاری اجازت کے سینما کیا معنی گھر سے باہر قدم نہ نکالوں کیونکہ پھر تمہیں مغالطہ ہوجائے گا اور تم ایک غیر عورت کو جس سے مجھے سوائے وقتی گفتگو کے کوئی واسطہ نہ ہو، میری محبوبہ سمجھنے لگوگی"۔

" اچھا اگر اس عورت سے تمھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور کل ہی اتفاق سے تمھاری ملاقات وہیں سینما میں ہوگئی تھی تو مجھ سے جھوٹ کیوں بولے کہ آج کل پروگرام روز بدلتا ہے"۔

" واللہ بیگم، یہ بات تو خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتی کہ میں کیوں جھوٹ بولا، لیکن خیر جانے دو یہ کوئی بڑا جھوٹ نہیں کہ تم آئندہ کے لئے بھی مجھے سچ بولنے کا اہل نہ سمجھو —— اور ہاں، دیکھو آج میں نے جاوید مرحوم کے کلام پر تبصرہ کیا ہے کل ہی سے خیال کر رہا تھا کہ تمھیں ایک شعر سناؤں گا دیکھو کیا خوب لکھا ہے:۔

بس اک بوسہ پر اتنی بحث زیبا ہے نہ شایاں ہے

نگاہیں نیچی کر لو، خیر اچھا لے لیا ہوگا

" چلو ہٹو، مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں" ان کے " چلو ہٹو۔" کا میرے پاس صرف ایک ہی " مسکت" جواب ہوا کرتا ہے۔ جس سے ان کا

منھ بند ہو جاتا ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس سے کام نہ لیتا۔
سینما میں اب بھی جاتا ہوں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس دن کے بعد سے پھر
سینما کا پروگرام نہیں بدلا۔

---

# چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ

دنیا میں "سانپ اور مولوی" دو چیزیں ایسی ہیں جن کی قسموں کی انتہا نہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور موخر الذکر کا یہ حال ہے کہ:

ہر کرا جامہ مولوی بینی
در دمش صد ہزار مار انگار

مسجد کے ملا سے لے کر محراب و منبر کے واعظ تک، نماز جنازہ پڑھانے والے مولوی سے لیکر اس مولانا تک، جو بیضاوی و بخاری کا درس دیتا ہے ایک خیر الا ماشاءاللہ سب مشترک پائی جاتی ہے اور وہ ان کے ظاہر و باطن کا تضاد ہے۔ یعنی جس مولوی کا ظاہر جتنا زیادہ خوشنما ہے اتنا ہی زیادہ اس کا بطون گرد آلودہ ہے۔

ایک مولوی کی "ہیئت وضعی" جس میں اس کا بے تکا عمامہ، الجھی ہوئی زلف، (گاہے تاگوش و گاہے تابنا گوش)، لانبی پریشان ڈاڑھی، زمین دوز بردت سیاہ داغدار پیشانی، شیروانی نما کرتہ، نیم ساقی پاجامہ اور غیر دباغت شدہ متعفن چمڑے کا جوتا مع تسبیح و جریب و رومال اور "ناسدانی" کے سب کچھ شامل ہے۔ ایک ایسی پیٹنٹ وضع ہے جس کو دیکھنے کے بعد گویا ہر شخص کا فطری فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس وضع والے مولوی کو سمجھے اور بحیثیت مولوی ہونے کے اس وضع کا اختیار کرنے والا تو گویا منجانب اللہ اس پر مامور ہی ہوا ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں قورمہ اور مرغ پلاؤ مہیا ہو سکتا ہے وہاں اپنا سلسلۂ ارشاد و ہدایت دراز کردے۔ اس میں بھلا کسی کو

اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔

مولوی کی اولیں قسم جو ارتقار مولویت کی سب سے پہلی کڑی تھی مکتبوں کی بوریوں پر نظر آتی تھی اب تقریباً مفقود ہو چکی ہے، مگر ان کے کارنامے مولویت کی تاریخ لکھنے والوں کے لئے ہمیشہ اہمیت رکھیں گے۔ کیونکہ "موجودہ مولوی" اسی "گزشتہ مولوی" کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور وہ شخص جو "نفسیات مولویت" سے بحث کرنا چاہے گا، اس کے لئے لازم ہوگا کہ وہ اس قوم کی ابتدار ظہور سے آغاز کرے۔ علمی و اصولی حیثیت سے آپ اس پر غور کرنے کی اہمیت کا اندازہ یوں کر سکتے ہیں۔

مثلاً ـــــ میرے محلہ میں بہت زمانہ ہوا ایک مولوی کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر محلہ کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ ان کی ایک مولویائن تھیں اور چند در چند بچے جن کو اگر برابر کھڑا کر دیا جاتا تو اچھا خاصا زینہ بن جاتا۔ رئیس کے یہاں ان کو صرف پانچ روپیہ ماہوار اور کھانا ملتا تھا لیکن ان کی دیگر فتوحات کی صورتیں مختلف تھیں، عید، بقرعید، شبرات میں عیدیاں، بقرعیدیاں وغیرہ بپاس خاطر عزیز سلیہ لکھ کر انعام وصول کرنا تو خیر ایک جائز معمول تھا ہی، لیکن اس کے علاوہ اور بھی مختلف ترکیبوں سے کام لیتے تھے اور اس باب میں وہ ایک مخترع و موجد کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً ان کے موٹے لانبے کرتے میں آگے پیچھے نیچے اوپر تقریباً ایک درجن جیبیں تھیں۔ یہ جیبیں مختلف وسعت کی تھیں اور ان کا رنگ بھی مختلف تھا، کوئی سرخ تھی اور کوئی زرد کوئی سفید تھی اور کوئی سبزی مائل، ہر لڑکے کو خفیہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب وہ گھر سے آئے تو کوئی نہ کوئی چیز لیتا آئے، پھر اگر کوئی مرچ لایا تو سرخ رنگ کی جیب میں ڈال دی، کسی نے ہلدی کی گرہ پیش کی تو زرد رنگ کی جیب میں

رکھ لی، کوئی آٹا لایا تو سفید جیب کی نذر ہوگیا اور سبز ترکاریاں سبز جیب میں چلی گئیں، ایک جیب چمڑے کی بھی تھی جس کا راز ایک دن اتفاق سے یوں کھل گیا کہ ایک مسلمان تیلی کا لڑکا کچھ تیل کٹورے میں لایا اور انھوں نے آنکھ بچا کر اسی جیب میں تیل کو انڈیل لیا۔ الغرض شام کو جب وہ گھر جاتے تو مولویا تن اور" ملازادوں" کے لیئے بقال کی اچھی خاصی دوکان بن کر جاتے تھے۔

ایک معمولی شخص کے لیئے بظاہر یہ واقعہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن ایک ماہر نفسیات غور کرے گا کہ ایسے معلم کے شاگردوں میں کیا ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے اور وہ آگے چل کر کس قسم کے" افراد قومی" بننے کی اہلیت رکھ سکتے ہیں۔

بہر حال اللہ کی یہ مخلوق تو، اب مفقود ہوگئی ہے لیکن اسی کی اولاد یا تلامذہ کے سلسلہ میں جو مولوی پائے جاتے ہیں، ان میں تین بڑی تقسیمیں ہو سکتی ہیں ایک وہ جو عربی مدارس میں لڑکوں کو پڑھاتے ہیں دوسرے وہ جو وعظ و تبلیغ کے ساتھ لوگوں کو مرید بھی کرتے ہیں اور تیسرے وہ جو سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد مسلمانوں کے قاید و رہنما بن گئے ہیں۔

اول الذکر قسم بظاہر گوشہ نشین اور بے ضرر قسم معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی خلوت نشینی حقیقتاً ایک مستقل ہنگامۂ محفل ہوتی ہے جس میں مولوی تائی کی حیثیت رکھتا ہے اور طلبہ مغبچوں کی، رہی بے ضرری سو اس کا حال اس سے عیاں ہے کہ اگر درس گاہ اس قسم کی ہے جس کے طلبہ مسجدوں میں رہ کر محلہ والوں کی خیرات اور سویم کی روٹیوں پر زندگی بسر کرتے ہیں تو اخلاقی تربیت اور علو حوصلگی معلوم اور اگر کوئی قومی مدرسہ ہے جس میں دارالاقامہ کے اصول پر طلبہ کے رہنے کا انتظام ہے تو وہاں کا نصاب وہی فرسودہ و قدیم ہے جو انسان کو آگے بڑھانے کے بجائے پیچھے ڈھکیل دیتا ہے اور جس کی تکمیل کے

بعد وہ سوائے اذان دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔"

اول الذکر قسم کے مولویوں میں جو افراد زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر دوسری قسم میں منتقل ہو جاتے ہیں اور وعظ و تبلیغ شروع کرکے "مشایخانہ" حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، یہ طبقہ زیادہ مالدار، زیادہ خوشحال، زیادہ کامیاب و رنگین ہے ایسا مولوی سب سے پہلے بنگال و برما کے جاہل قریوں میں اپنی "مشق سخن" شروع کرتا ہے اور جاہل مسلمانوں کو جھوٹی روائتیں، گڑھے ہوئے کاذب افسانے مذہب و بانیٔ مذہب کے متعلق سنا کر اول اول علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کا وعظ کہتا ہے اور جب وہ اپنی حیثیت بہ لحاظ ایک عالم ہونے کے "یکے از انبیاء بنی اسرائیل" کی طرح قائم کر لیتا ہے تو سراً علنًا مرشد ہادی بن کر اپنے ارادتمندوں اور مریدوں کے رجسٹر کھول دیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح کم از کم ۷۴۰ مرید اس کو حاصل ہو جائیں تاکہ اگر ایک روپیہ سالانہ بھی وصول کیا جائے (جو نہایت معمولی بات ہے) تو دو روپیہ روز کا اوسط پڑ جائے یہ طبقہ نہایت "خوش خور" "خوش پوشاک" ہوتا ہے۔

اگر یہ کسی ایسے قریہ میں پہونچ جاتا ہے جہاں تمام ضروری چیزیں اس کے "ذوق شکم" کو پورا کرنے والی مل سکتی ہیں تو پھر اس کے دستر خوان کا پروگرام یہ ہوتا ہے۔

صبح کا نسخہ:۔ نماز کے بعد ہی کشمیری چاء، سیر بھر دودھ اونٹا ہوا، پاؤ بھر مسکہ، ایک چھٹانک پسے ہوئے بادام، آدھ پاؤ قند، دو پراٹھے، تین ابلے ہوئے انڈے، چار کباب۔

دوپہر کا کھانا:۔ مرغ کا قورمہ، مرغ پلاؤ، بریانی، پسندے، باقر خانی، مزعفر، بالائی۔

سہ پہر:—— سادہ چائے اور تازہ پھل۔

شب کا کھانا:۔ وہی جو دوپہر کو مگر شامی کباب اور بھنی ہوئی مچھلی کے اضافہ کے ساتھ۔

اگر مولانا کسی ایسے مقام پر پہونچ گئے جہاں یہ اشیاء فراہم نہیں ہو سکتیں اور ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ صرف دال ترکاری پر بسر کرنا ہوگی تو وہ پھر کہہ دیتے ہیں کہ آج کل جلالی عمل کا چلہ کھینچ رکھا ہے اس لیئے سوائے دودھ بالائی کے کچھ نہیں کھا سکتا۔

مولانا کی پوشاک بھی ہمیشہ دورہ ہی کے زمانہ میں تیار ہوتی ہے۔ عماموں کی تو خیر کمی نہیں کیونکہ ہر نیا مرید جب کچھ زرِ نقد اور مٹھائی لاتا ہے تو وہ ایک نیا عمامہ بھی پیش کرتا ہے جو بعد کو گھر پہونچ کر مولویائن کے دوپٹے اور ملا زادوں کے کرتے کے کام آتا ہے لیکن یوں بھی قمیص، اچکن، تہمد اور ازار کے لیئے طرح طرح کے سوتی اور ریشمی کپڑے تحفتہً آتے رہتے ہیں اور جو مولوی کا زیادہ ہوشیار ہیں وہ صرف اسی غرض سے جولاہوں اور کپڑے کی تجارت کرنے والوں کو مرید بناتے ہیں، مولانا کے وعظ و تلقین کا جہانتک تعلق ہے یکسر خدا کی شان جلالی سے وابستہ ہوتی ہے۔ خدا ایسا قہار ہے۔ ایسا جبار ہے، اس نے جہنم اتنا وسیع بنایا ہے وہ یوں اژدہوں سے ڈسواتا ہے۔ اس طرح آگ میں جلاتا ہے، مگر ہاں وہ جس کی شفاعت رسول اللہ کر دیں یا کوئی پیر گویا خدا کا قہرمانی وجود اپنے وقت کا چنگیز یا ہلاکو ہے اور مولانا اس کے وزیر یا تدبیر، ان کی ملفوظات کا بڑا حصہ خود اپنے ہی کرامات و خوارق عادات سے متعلق ہوتا ہے کہ فلاں مقام پر اس طرح ایک مرتے ہوئے شخص کو اچھا کر دیا امسال باراں میں یوں پانی برسا دیا، فلاں کے دل کا حال اس طرح بتا دیا۔

جن کے بادشاہ کو طلب کر کے فلاں کے سر سے آسیب کو یوں دور کرا دیا وغیرہ وغیرہ

اگر مولانا کو ذوقِ موسیقی بھی ہے تو شب کے اول حصہ میں قوالی اور راس کے ساتھ حال قال' مذبوحانہ حرکات بھی دکھائی جاتی ہیں' ورنہ شام ہوتے ہی مولانا کا جائے قیام مردوں کے لیئے "ممنوع دخل" ہو جاتا ہے اور صرف عورتوں کی ہدایت کے لیئے وقف سمجھا جاتا ہے۔ پیر صاحب نرم قالین پر نرم تکیوں کے سہارے دراز ہو جاتے ہیں۔ عورتیں ڈرتی ہوئی، سہمی ہوئی آتی ہیں اور مولانا کا وہ جسم جو مقوی اور قیمتی غذا سے خوب نرم اور پر گوشت بنا ہوا ہے دابنے لگتی ہیں۔ مولانا تھوڑی دیر اس لذت سے سرشار ہونے کے بعد دوسرے کمرہ میں چلے جاتے ہیں اور وہاں علحدہ علحدہ ہر اک کو تعلیم و تلقین خصوصی کے لیئے طلب فرماتے ہیں، پھر چونکہ وہ مقام بلند ہے جو پیر صاحب کی اصطلاح میں "قاب قوسین او ادنیٰ" سے کم نہیں، اس لیئے یہاں کے راز اول تو بہت کم ظاہر ہوتے ہیں اور جو کبھی ہو گئے تو فوراً کل یوم ھو فی شان" اور اللہ جمیل ویحب الجمال کا وعظ شروع ہو جاتا ہے اور جاہل مرید خوشی کے ساتھ اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو آلۂ تفریح بنانے کے لیئے راضی ہو جاتے ہیں۔

تیسری قسم مولوی کی وہ مولانا ہے جو ملک کے اونچے اور تعلیمیافتہ طبقہ میں اپنی کارگاہ قائم کرتا ہے تاکہ ملک کا سیاسی قاید و رہنما تسلیم کیا جائے جہانتک اصلاح ملک و قوم کا تعلق ہے، ان کا کارنامہ بالکل صفحۂ سادہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جس حد تک تخریب و فساد متعلق ہے۔ اس طبقہ کا وجود اس درجہ خطرناک ہے کہ شاید ہم اتنی کہہ کر اس کی اہمیت کو پوری طرح ظاہر کر سکیں۔

یہ مولانا کھدر پوش ہوتا ہے، دیسی چیزوں کا عاشق، ولایتی اشیاد سے متنفر، حریت و آزادی کا علمبردار، غلامی استبداد کا عدو، ترقی کا حامی،

تنزل کا دشمن اور" یتیموں کا والی غریبوں کا ملجا" سبھی کچھ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس کے کھدر پوش سینہ کے اندر اتنا موٹا اور مکروہ قسم کا نفس ہوتا ہے کہ شاید ہی غریب فرعون کو نصیب ہوا ہو۔ اسکے تمام مقالات حریت، اسکی تمام شعلہ بیانیاں اس کی جملہ سوراج پرستیاں صرف حب جاہ سے متعلق ہوتی ہیں اور اس کا مقصود ان تمام نمائشوں سے سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ریل کے اونچے اونچے درجوں میں سفر کرے، وداع کے وقت لوگوں کا ہجوم اس کو اسٹیشن تک پہونچانے جائے، جہاں پہونچے وہاں رسم مشایعت کے لیے ایک جماعت موجود ہو، گلے میں ہار ڈالے جائیں، اسکی موٹر کو نوجوانانِ ہند ڈھکیل کر لے جائیں۔ جلوس کے ساتھ جب وہ بازاروں کی طرف سے نکلے تو ایک غرور نما انکسار کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے جھک جھک کر لوگوں کا سلام قبول کرتا جائے اور جائے قیام پر ہر وقت زائرین کی آمد وشد سے میلہ سا لگا رہے۔

یہ اپنے آپ کو سیاسیات کا ماہر، نظام عالم کا "اُستن حنانہ" اور گردش ارضی کا محور سمجھتا ہے، اس کو یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو نظم دنیا درہم برہم ہو جائے، اور قومیت کا بیڑا غرق۔ اس قسم کا مولانا بہت کم خطرہ میں پڑتا ہے اور اگر کبھی پڑ جاتا ہے تو صرف تجارتی اصول کی بنا پر کہ آئندہ اس کے کاروبار کی رونق اس سے زیادہ بڑھ جائے گی یہ سوائے اپنے کسی کی رائے کو پسند نہیں کرتا یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں خدا نے صرف اسی کو ذی عقل وہوش بنایا ہے اور خلیفۃ اللہ فی الارض اسی کی ذات سے عبارت ہے وہ جلسوں میں ہمیشہ دیر کر کے پہونچتا ہے تاکہ جس وقت وہ پہونچے تو سارا مجمع جو اس کا منتظر ہے گردن اٹھا اٹھا کر اسکو دیکھنے لگے وہ چوکڑیوں پر سوار ہو کر جاتا ہے

اونچی جگہ مسندوں اور زرکار کرسیوں پر اپنا دامن عبا دراز کرتا ہے وہ دوران جلسہ میں سرگوشیاں کرتا ہے۔ کاغذ کے پرزوں پر لکھ لکھ کر لوگوں کو ہدایت فرماتا ہے، گویا کہ وہ اس ساری جماعت کا قائد اعظم ہے، اس مشین کا گورنر اسپرنگ ہے جس پر پرزوں کی باضابطہ گردش قائم ہے' مولانا مولانا کی آوازوں سے اسکا سیروں خون بڑھتا ہے، دست بوسی سے اس کے جذبات قیادت میں برقی رو دوڑ جاتی ہے اور جس وقت وہ اسٹیج پر جاکر تالیوں کی آواز سنتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے کہ خدا کی عبادت ہے صرف اسی کی ذات سے' یہ حال ہے اسکی پبلک زندگی کا۔ لیکن اپنے گھر کے اندر وہ کیا ہے؟ اپنے متعلقین کے ساتھ اس کا کیسا برتاؤ ہے لوگوں کے حقوق وہ کیونکر ادا کرتا ہے اس کا حال اس کی غریب بیوی سے پوچھیے جو ایک کنیز سے بدتر حیثیت رکھتی ہے' بچوں، خادموں اور اس کے اعزہ سے دریافت کیجئے کہ یہ اپنے آپ کو "خدا کا بیٹا" کہنے والا کس طرح کا باپ کس قسم کا آقا اور کس انداز کا انسان ہے۔ اس کا مذہب یکسر خود پرستی' اس کا دین و ایمان سراسر کبر و غرور، اور اس کی ذات از سرتاپا یادگار ہے ان فراعنہ جن کا حال تو کتابوں میں ہم کو نظر آجاتا ہے لیکن صورت اب تک کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس قدر تمہید کے بعد مجھ کو اصل مدعا کی طرف آنا چاہیئے جو عنوان سے ظاہر ہے میرے تجربات مولویوں کے متعلق اس قدر وسیع ہیں کہ اگر چاہوں تو برسوں تک اس سلسلہ کو قائم رکھ سکتا ہوں' لیکن اسوقت میں اپنا بالکل حال کا تجربہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو ادبی حیثیت سے کم پُر لطف نہیں ہے۔

۵ر جولائی کو میں ہندوستانی ایکاڈیمی کے جلسہ میں شرکت کی غرض سے الہ آباد جا رہا تھا۔ پرتاب گڈھ اسٹیشن پر پہونچ کر میں جس درجہ میں داخل ہوا۔ وہاں

پہلے سے ایک ہندو خاتون کونہ میں بیٹھی ہوئی تھی جس سے ایک مرد (جو غالباً اس کا خوش نصیب شوہر ہوگا) باتیں کر رہا تھا۔

یہ عورت جسے ایک نوجوان لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، بہت قبول صورت حد درجہ مہذب اور نہایت خوش ادا اور اپنی نزاکت کے لحاظ سے بالکل ایک فاختہ یا کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ اسکے رنگ کی کندنی چمک، اسکے خد وخال کی کشمیریت اسکی آنکھوں کی نشیلی کیفیت، اسکے لبوں کی میگونی اسکے جسم کی بجلیلی نزاکت، یہ سب باتیں اسکی خوش سلیقگی اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ مل کر ایک ایسی فضا پیدا کر رہی تھیں کہ ہر شخص کو اس سے متاثر ہونا چاہیئے اور غلط ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا، لیکن ایسی صورتوں میں میرا فلسفہ صرف یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے آپ پر غور کرتا ہوں اور صبر کر لیتا ہوں۔ میرے لئے موقع تھا کہ میں مقابل کی بنچ پر بالکل اسکے سامنے اور بہت قریب ہو کر بیٹھ جاتا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا صرف احترام نسوانی کے خیال سے کہ ممکن ہے اسے کچھ تکلیف ہو اور وہ آزادی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکے۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک مولانا مع اپنی تمام خصوصیات ظاہری کے داہنے ہاتھ میں طہارت کا لوٹا لیئے ہوئے اور بائیں ہاتھ میں بستر اجام بدستے دسبوئے بدست) اندر داخل ہوئے بیک نگاہ گاڑی کا جائزہ لے کر بلا پس و پیش اپنا محاذ انھوں نے اسی جگہ قائم کر دیا جس کو میں نے قصداً چھوڑ دیا تھا۔

مجھے پہلے ہی ان کی وضع وصورت اور اس ناشائستہ حرکت سے یقین ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی مولانا ہے، لیکن اتفاق سے اسی درجہ میں ایک وکیل صاحب ان کے شناسا اور مل گئے اور انھوں نے مولانا کے لفظ سے خطاب کر کے اور مہر توثیق ثبت کر دی۔

مولانا کی عمر ۶۰ سے متجاوز ہوگی، لیکن ماشاءاللہ صحت بہت اچھی تھی۔ اور مصنوعی دانتوں کی تاب اور ڈاڑھی کا خضاب جو ہر چند طاؤسی ہوگیا تھا۔ بتا رہا تھا کہ ہنوز زعم جوانی موجود ہے تمام اعضاء صحیح و سالم تھے، البتہ داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور انگوٹھا کچھ ٹیڑھا اور مفلوج سا تھا جو غالباً عمل جراحی کا نتیجہ تھا کیونکہ ہاتھ پر ایک بڑا نشان اس کا پایا جاتا تھا۔

مولانا کو اس قدر اپنے سے قریب دیکھ کر اس خاتون نے آنچل کی اوٹ سے نیچے ہی نیچے بہت غور سے دیکھا اور نہایت مخفی تبسم کے ساتھ اس نے شوہر کو اور شوہر نے اسے دیکھا اور دونوں پھر باتوں میں مصروف ہوگئے تھے۔

مولانا نے سب سے پہلے اپنی نشست کا اندازہ اس طرح قائم کیا کہ چہرہ اسی طرف رہے اور اسکے ماتھے کی سرخ بندی جو بیر بہوٹی کی طرح دہک رہی تھی نگاہ سے اوجھل نہ ہو جب وہ اپنے نشانہ و ہدف کی طرف سے مطمئن ہوگئے تو انھوں نے چاہا کہ کسی طرح اسکے شوہر سے بے تکلفی پیدا کر کے اپنے آپ پر گلچینی جمال کو حلال کریں، لیکن بدقسمتی سے ایک صاحب جوان کے شناسا تھے الف لیلہ کے کم گو حجام سے کم باتونی نہ تھے اور انھوں نے جو مولانا سے گفتگو شروع کی تو پھر اس کا موقع ہی نہ دیا کہ وہ کسی طرف اور متوجہ ہوتے۔ ہر چند مولانا کی جبین پیشانی کی عبوست اور کبھی کبھی اخبار لے کر اس کے مطالعہ کی کوشش کرنا صاف کہہ رہا تھا کہ وہ کسی کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے اور ان کی توجہ و مراقبہ کو صدمہ پہونچ رہا ہے لیکن وکیل صاحب جو اپنی پہنائی اور قد و قامت کے لحاظ سے ابوالہول کی تحد معلوم ہوتے تھے، اس غریب مولانا کے آزار کو نہ سمجھ سکے اور برابر انکی یکسوئی خیال و نگاہ میں حارج رہے۔ لیکن باوصف اس کے مولانا نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے ہدف کو فراموش نہیں کیا اور اپنے کسی لخت عزیز کو انھوں نے بیسکار

جانے نہیں دیا۔ وہ باتیں کرتے تھے مگر نگاہ کا سمت نہ بدلتا تھا وہ وکیل صاحب کے سوالوں کا جواب دیتے تھے مگر ہر جواب کے دوران میں "اس سرمایۂ جان" کو بھی ضرور دیکھ لیتے تھے۔ وہ کوشش کرکے اپنے ہاتھ کی معیوب و کج انگلیوں کو چھپاتے تھے کہ مبادا وہ خاتون اس عیب کو دیکھ لے، وہ آواز میں اک خاص قسم کا وہ پیدا کرکے گفتگو کرتے تھے، وہ اپنے قہقہہ میں جھنکار سی پیدا کرنے کی سعی فرماتے تھے وہ اپنی خوش دلی، قابلیت، جاہ و ثروت، دولت و امارت کا ثبوت دینے کے لئے کبھی کبھی لطائف بھی کہتے، فارسی کے اشعار بھی پڑھتے، بڑے بڑے لوگوں کے نام اور ان سے اپنے تعلقات بھی ضمناً ظاہر کرتے جاتے تھے اور سب سے زیادہ زور اس پر دے رہے تھے کہ دنیا میں تعصب سے زیادہ بری کوئی چیز نہیں اور بھئی میرا مسلک تو یہ ہے کہ" ——— " با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام "۔" رام رام "۔ کہہ کر جس وقت مولانا نے اس عورت کو دیکھا تو وہ ابھی انھیں دیکھ رہی تھی اور میں بھی ان دونوں کے دیکھنے کے دیکھ رہا تھا اور آخر کار جب تینوں نگاہیں مرکز اجتماع سے ہٹیں تو اس طرح کی تینوں۔ (علحدہ علحدہ ہر ایک کو دیکھا مگر یہ منظر پیدا کرتے ہوئے کہ مولانا اپنی جگہ مست تھے اور وہ خاتون محجوب۔ الغرض مولانا کے تمام مولویانہ تیور اس کا پتہ دے رہے تھے کہ وہ انھیں لوگوں میں سے ہیں، جو۔

ایں کار را بہ شیوۂ کار آگہاں کنند

جب مجھے پوری طرح یقین ہوگیا کہ مولانا کی خوش طبعی اب کافی طور پر بڑھ گئی ہے اور انھیں وثوق کامل ہوگیا کہ سارے درجہ میں صرف انھیں کی ذات ایسی ہے جس پر وہ خاتون مائل ہو سکتی (ہو سکتی کیا ہو ہی گئی) تو میں سنبھلا اور میں نے آگے بڑھ کر باادب عرض کیا کہ "۔ اگر جناب اجازت دیں تو چند مسائل

حضور سے دریافت کروں جو اسی وقت میرے ذہن میں آئے ہیں" وہ یہ سُنکر دفعۃً چونک پڑے اور بولے "ہاں کہئیے، ہم لوگ اسی لیئے ہیں" اور یہ کہہ کر خاص بندار کے ساتھ اس طرف دیکھ لیا۔ میں نے عرض کیا کہ "مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ جناب صرف عالم ہی نہیں بلکہ ادیب و شاعر بھی ہیں جیسا کہ آپ کی شعر خوانی سے ظاہر ہوتا ہے اور اسی بنا پر مجھے یہ دریافت کرنے کی جرأت ہوتی ہے کہ کیا "غنا خانۂ ہمسایہ" اور "حسن رہگذرے" سے فائدہ اٹھانے کا مسئلہ محض شاعرانہ ادعا ہے یا واقعی کوئی شرعی حقیقت بھی اس میں پنہاں ہے"۔ یہ سن کر ان کے چہرے پر پہلے ایک ہلکی سی سُرخی عتاب کی اور پھر زردی حجاب کی نمودار ہوئی اور پہلو بدل کر بولے کہ "آپ کو مجھ سے مذاق کرنے کا کیا حق حاصل ہے"۔ میں نے کہا کہ "بندہ نواز میں آپ سے مذاق کر سکتا ہوں میں تو واقعی آپ سے سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں کیونکہ بسا اوقات سفر حضر میں ایسا ہوتا ہے کہ نگاہ مجبوراً اٹھ جاتی ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے آخر کار کانپ اٹھتا ہوں کہ کہیں آخرت میں باز پرس نہ ہو۔"

مولانا نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے کہ "یہ صورت تو عذاب سے ڈرنے والو کی نہیں ہوتی، ڈاڑھی منڈی ہوئی، مونچھ بڑھی ہوئی اور پیشانی سجدے کے نشان سے خالی۔"

میں:- "بجا ارشاد ہوا، میں اپنی صورت کا سب سے زیادہ شناسا ہوں، اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ عذاب سے ڈرنے والی صورت کیسی ہوتی ہے، سامنے ہی موجود ہے، صراحت کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں تو آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں، اور آپ کو اس کا جواب عالم دین ہونے کی حیثیت سے دینا چاہیئے، عام اس سے کہ میری ڈاڑھی منڈی ہوئی ہے یا خضاب سے رنگی ہوئی، میرے دانت

اصلی ہیں یا مصنوعی، میری انگلیاں سیدھی ہیں یا ٹیڑھی، میری عمر باپ ہونے کی ہے یا شوہر بننے کی۔"

یہ سننے کے بعد مولانا کا غصہ ضبط سے باہر ہوگیا اور آستین چڑھا کر بولے کہ۔ "تم مجھ سے مسخرہ پن کرتے ہو۔ یاد رکھو بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش ہوں۔"

میں نے عرض کیا کہ" میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ اس تنقید کی تاب وہ کیا لا سکتے تھے، بے اختیارانہ اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن وکیل صاحب نے اٹھ کر ان کو پکڑ لیا اور سارا درجہ مخاطب ہوکر ان کو سمجھانے لگا کہ" جانے دیجئے آپ بزرگ ہیں اپنی طرف خیال کیجئے اور جنیں دیجیاں" میں نے کھڑکی کی طرف رخ کر لیا۔ اور جب چند منٹ کے بعد سکون ہوگیا تو میں پھر ان کی طرف متوجہ ہوا اور بولا کہ" مولانا اگر غصہ فرد ہوگیا ہو تو عرض کروں کہ میرے سوال کا جواب مرحمت ہو"۔ یہ سنکر سارے درجہ والے تو خیر ہنس ہی پڑے تھے، وہ خاتون بھی مسکرانے لگی اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔

مولانا بولے کہ" خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑیے میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے کہا کہ" یہ بات شرعی مسئلہ ہے اور آپ کو بتانا پڑے گا۔"

وکیل صاحب خوش مزاج انسان تھے، انھوں نے کہا کہ" مولانا کیا ہرج ہے آپ کیوں نہیں بتا دیتے"۔ مولانا بولے کہ آپ نہیں سمجھتے یہ مجھے بیوقوف بناتے ہیں ورنہ کیا یہ خود نہیں سمجھ سکتے کہ جو کچھ یہ پوچھ رہے ہیں محض شاعرانہ بات ہے اور شرع ...."

میں:" نہیں مولانا واللہ ایسا نہیں ہے، مجھے اس وقت تک تو صرف گمان ہی تھا لیکن آج یقین ہوگیا کہ غنائے خانہ ہمسایہ جائز ہو یا ناجائز، لیکن ——"حسن رہگذر رے" سے لطف اٹھانا قطعاً جائز ہے۔"

مولانا:" یہ کیونکر آپ کو یقین ہوگیا"۔

یہ سنکر میں ہنس پڑا اور دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔

مولانا غصہ میں اٹھے اور لوٹا لیکر منھ بناتے ہوئے بیت الخلا چلے گئے۔ ایک اسٹیشن درمیان میں باقی تھا کہ وہ باہر آئے اور جب اپنی جگہ بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا کہ" تشبہ کسی قوم کے ساتھ ایک شخص کو اسی قوم میں داخل کر دیتا ہے اس لیئے اگر ہمارے ہاں کی عورتیں سرخ بنیدی کا استعمال کریں تو وہ ہندو ہو جائیں گی' آپ کا کیا خیال ہے"

مولانا۔" بیشک بنیدی کا استعمال ہماری عورتوں کو نہ کرنا چاہیئے

میں:" لیکن مولانا، یہ تو آپ نے بھی دیکھا ہے کہ، بڑی پیاری چیز اور خاص کر گورے رنگ پر تو قیامت ہی ہوجاتی ہے"۔

مولانا۔" حقیقت یہ ہے کہ تم ہو کوئی بڑے بدمعاش"۔

اتنے میں پریاگ اسٹیشن آگیا جہاں مجھے اترنا تھا، مولانا بدستور بیٹھے رہے اور میں اتر پڑا۔ لیکن نیچے پلیٹ فارم پر جاکر میں نے ان سے کہا کہ" مولانا خدا کے لیئے صرف ایک بات کان میں سن لیجئے" مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے کہنا مان لیا اور جب انھوں نے کھڑکی کے پاس آکر اپنے کان قریب کیئے تو میں نے عرض کیا کہ" مولانا اس میں شک نہیں کہ چیز اچھی ہے، کیا رائے ہے"۔

یہ سن کر انھوں نے میری گوشمالی کے لیئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں الگ ہٹ گیا اور گاڑی روانہ ہوگئی۔

اکاڈمی کا دفتر پریاگ اسٹیشن سے صرف دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر ہے اور اس دس منٹ کے راستے میں جس خیال نے میرے دماغ کو گھیر رکھا وہ مولانا کا واقعہ نہ تھا بلکہ غالب کا یہ شعر تھا جسے میں گنگناتا جا رہا تھا۔

اگر بہ دل نہ خلد انچہ از نظر گزرد زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

بھیانک آواز سے پکارنا، گویا "بگل" کی آواز تھی کہ اس کے بعد کسی لبستر پر پڑے رہنا اپنے آپ کو "مارشل لا" کی گرفت میں دینا تھا۔

جہر زمانی بیگم کی زندگی کی تمام وہ کیفیات، جنھوں نے گھر بھر کو بے کیف بنا رکھا تھا۔ منحصر تھیں صرف ان دو باتوں پر کہ اول تو وہ کسی وقت چپ ہو جانا گناہ سمجھتی تھیں اور دوسرے یہ کہ صحیح معنوں میں وہ اس حوا کی بیٹی تھیں جس نے اپنی ضد اور زعم فراست پر جنت ایسی چیز کو ٹھکرا دینے میں باک نہ کیا، خدا جانے کس نے ان کو یقین دلایا تھا کہ زبان ہر وقت جنبش نہ کرتی رہے تو مفلوج ہو جاتی ہے؟ اور اگر بغیر عیب نکالے ہوئے کسی بات کو مان لیا جائے تو دماغ خراب ہو جاتا ہے ان کی گفتگو ہمیشہ الزامی اور جواب طلب ہوا کرتی تھی لیکن زبان کی تیزی کا کیا علاج کہ ان کی ایک بات کا جواب دینے سے پہلے ہی، دوسری بات کا جواب انسان پر عاید ہو جاتا تھا اور آخر کار وہ کسی کا بھی جواب نہ دے سکتا تھا اور بیگم صاحب اس کو اپنے الزامات کی صحت کی دلیل اور زجر و توبیخ کے لئے سند سمجھ بیٹھتی تھیں۔

کچھ عرصہ سے یہ بیوہ تھیں اور ممکن ہے یہ اطلاع درست ہو کہ اس سے قبل از وقت بیوگی کی ذمہ دار بہت کچھ وہ خود تھیں —— مرزا فریدوں قدر (ل) بھی فطرتاً نہایت نیک نفس، بے زبان، صلح کل اور متواضع انسان تھے اور اگر جہر زمانی بیگم کی جگہ ان کی بیوی کوئی اور ہوتی تو بھی وہ "نمک خوار" ہی قسم کے شوہر ثابت ہوتے، مگر انھوں نے تو ان کو کچھ ایسا "خاکسار" اور "فدوی" بنا دیا تھا کہ تصوف کے تمام منازل جلد جلد طے ہونا شروع ہو گئے یہاں تک کہ "فنا فی اللہ" کی منزل تک پہونچنے میں بھی انھیں زیادہ عرصہ نہ لگا —— انھوں نے اپنے بعد ایک جوان لڑکا بر جیس قدر چھوڑا اور دو لڑکیاں جن میں سے بڑی کی عمر ۱۶ سال کی

# محلّے کی رونق

مہر زمانی بیگم، اس زمانہ کی خاتون تھیں، جب عورت کو تعلیم تو نہیں دی جاتی تھی لیکن اسکی تربیت اتنی ہو جاتی تھی کہ خدا کی پناہ! یعنی یہ کہ وہ غلطیاں کر کر کے نقصان اٹھا اٹھا کر تجربات حاصل کرنے کے لئے حوادث و اتفاقات کے رحم پر چھوڑ دی جاتی تھی اور آخر کار سِن ڈھلتے ڈھلتے وہ سارے خاندان کے لئے ایک "تلخ حقیقت" اور "ناگزیر مصیبت" ہو کر رہ جاتی تھی۔

مہر زمانی بیگم نے چونکہ دنیا میں بہت زیادہ غلطیاں کی تھیں اس لئے وہ بہت زیادہ تجربہ کار تھیں اور اسی نسبت سے "بلے پناہ" جس وقت وہ صبح کو بیدار ہوتیں اور پوری قوت کے ساتھ دروازہ کو کھولتی ہوئی، اپنی بھاری، بلند، چوڑی اور کرخت آواز سے خادمہ کو پکارتی ہوئی باہر نکلیں، تو گھر کا ہر فرد اپنی جگہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا، گویا "اسرافیل" نے کہیں قریب ہی گلی سے صور پھونکنا شروع کر دیا ہے اور چونکہ بد قسمتی سے وہ تہجد گزار بھی تھیں اور سوتی بھی تھیں ہمیشہ بارہ کے بعد، اس لئے ان کا وجود تمام گھر کے لئے ایک ایسا فتنہ تھا، جو رات دن میں بیس گھنٹے بیدار رہتا اور صرف چار گھنٹے محوِ خواب اور "محوِ خواب" بھی کیا صرف "دلبستر آشنا"، کہئے کیونکہ جب وہ سو جاتی تھیں تو ان کے "خراٹے" جاگ اٹھتے تھے، جو خود ایک مستقل عذاب تھے۔

مہر زمانی بیگم کا صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے خادمہ (گلشن) کو اپنی خزاں رسیدہ اور

اور چھوٹی کی ۱۰ سال کی تھی، بہرحال قادر کی شادی ہو چکی تھی اس لیے بہو بھی گھر
میں موجود تھی۔ اور اس طرح علاوہ دو خادموں اور تین کنیزوں کے مہرزمانی بیگم
کے دائرہ حکومت میں چار نفوس اور بھی شامل تھے۔

اولاد نے تو خیر، اسی استبدادی حکومت میں نشو و نما پایا تھا اور ابتدا ہی
سے وہ اس کے عادی ہو چکے تھے لیکن بہو کے لیے ضرور یہاں کی غلامی بہت تکلیف دہ
تھی۔ مگر جب وہ اپنے شوہر کو اس درجہ ناچار و مجبور پاتی تو اسے بھی زبان کھولنے
کی جرأت نہ ہوتی تھی اور دل ہی دل میں گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھی ایک دن اس نے
ہمت کر کے شوہر سے اپنی ساس کے مظالم کی داستان جستہ جستہ دہرائی، تو وہ
سن کر باہر چلے گئے اور کوئی جواب نہ دیا۔ راضیہ تعلیمیافتہ تھی اور خوش حال
گھرانے کی، اس لیے مادی و روحانی دونوں جذبات کے لحاظ سے اس کو
سسرال میں اذیت پہونچتی تھی، مگر چونکہ ہندوستان کی لڑکی تھی، اس لیے اندر
ہی اندر گھلنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی ــــ خیر، ہمیں کوئی فسانہ تو لکھنا نہیں
کہ جزئیات سے بحث کریں۔ بلکہ مقصود صرف مہرزمانی بیگم کا ذکر کرنا ہے،
اس لیے اور تمام جھگڑوں کو چھوڑ کر فی الحال ان کی زندگی کا صرف ایک
دن پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

۶ر جون کی صبح کو ــــــ ان کے یہاں گرمیوں میں صبح ہمیشہ ۳ بجے
رات کو ہو جاتی تھی اور جاڑوں میں انتہائی رعایت کے ساتھ ۵ بجے، گویا
طلوع آفتاب سے تین گھنٹے قبل کوؤں کے ساتھ ہی ان کی "کائیں کائیں" کا
بھی شروع ہو جانا لازم تھا۔

ہاں، تو ۶ر جون کی صبح کو جب وہ بیدار ہوئیں اور حسب معمول گلشن کو
آواز دی، تو گھر میں بالکل خاموشی طاری تھی۔ قاعدہ تھا کہ ان کی پہلی گھن گرج

آواز پر گلشن دوڑ پڑتی تھی اور سارے گھر میں آثار حیات پیدا ہو جاتے تھے لیکن رات کو چونکہ گلشن کو بخار آگیا تھا اس لیئے صبح کو اس کی آنکھ کھل گئی، بیگم صاحب کے نزدیک دنیا میں اس سے زیادہ کوئی قصور نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کسی کو پکاریں اور پہلی آواز پر دوڑتا ہوا نہ آئے۔ اس سکوت پر ان کے غصہ کا پارہ دفعتہً اس قدر چڑھ گیا کہ بیتاب ہو کر گالیاں دیتی ہوئی گلشن کی کوٹھری کی طرف دوڑ پڑیں۔ سوء اتفاق سے شام کو دروازہ کے سامنے سے اسٹول ہٹانا کسی کو یاد نہ رہا اس لیئے بیگم صاحبہ جو گھبرا کر باہر نکلیں تو ان کا کلی دار پائجامہ اس سے اُلجھ گیا اور وہ بُری طرح منھ کے بل فرش پر گریں۔ بیگم صاحبہ چونکہ قدو قامت میں لندھور بن سعد ان کی بہن تھیں اس لیئے اس دھما کے سے نہ صرف ان کا سارا گھر بلکہ آس پاس کے بھی دو چار گھر چونک پڑے کہ یہ تین بجے رات کو دفعتہً کس کی سلامی سر ہونے لگی۔ پہلے تو بیگم صاحب نے گرتے ہی شور مچانے کا ارادہ کیا، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ سب لوگ دوڑے ہوئے آرہے ہیں، تو انھوں نے اس واقعہ کو زیادہ سنگین بنانے کے لئے بیہوش ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔ یہ وقت بھی، عجب وقت تھا کہ بہو، صاحبزادے، صاحبزادیاں اور تینوں کنیزیں پوری قوت کے ساتھ بیگم صاحب کے بے حس و حرکت جسم کو اٹھانا چاہتی تھیں، اور ان کا جاندار لاشہ کسی طرح جنبش میں نہ آتا تھا آخر کار یہ رائے قرار پائی کہ وہیں فرش پر قالین بچھا کر بیگم صاحب کو سرکا کے لٹا دینا مناسب ہے، بیگم صاحب کے کانوں میں جو یہ بھنک پڑی تو انھوں نے اپنی غشی کو ختم کر دینا ہی مناسب سمجھا اور جس طرح وہ بیہوش ہوئی تھیں اسی طرح وہ ہوش میں بھی آنے لگیں، پہلے آہستہ آہستہ پپوٹوں میں لرزش پیدا کی اور لبوں پر جنبش پھر نہایت ضعف کے ساتھ ہاتھ کو ایک طرف ڈھلکایا اور

تھوڑی دیر میں آنکھیں کھول کر اس طرح دیکھنے لگیں، گویا کسی اور عالم سے ابھی ابھی تشریف لائی ہیں۔ ہر چند ان کے ہوش میں آجانے سے سب کو اطمینان ہوا، لیکن اسی کے ساتھ اس خیال سے جسم پر لرزہ طاری تھا کہ اسٹول سے ٹکرا کر گر جانے کی خطا میں دیکھئے کس کس کو مجرم قرار دیا جاتا ہے اور کیا سزا تجویز ہوتی ہے، صاحبزادے تو خیر حکیم کو بلانے کے لئے باہر چلے گئے، لڑکیاں ان کو اٹھانے اور بہو بستر درست کرنے میں مصروف ہوگئیں۔ ایک گلشن ہی سامنے رہ گئی تھی، سو بیگم صاحبہ نے قرعۂ فال اسی غریب کے نام نکال کر جو گالیوں کی بوچھار شروع کی تو ایک منٹ میں بدحواس کر دیا اور اٹھتے اٹھتے اس کے سر کے بال پکڑ کر اس طرح جھنجھوڑ ڈالا گویا کھلیلدے بگھار رہی تھیں۔ بیگم صاحب صرف ایک سوال کا جواب اس چاہتی تھیں کہ اسٹول کس نے رکھا، اور گلشن یہی کہتی تھی کہ "سرکار مجھے خبر نہیں" بیگم کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی مصنوعی غشی کے مصنوعی اثرات رفع کرنے کے بعد ان کا غصہ پورے جلال کے ساتھ بھڑک رہا تھا اور ہر شخص اپنی جگہ کانپ رہا تھا کہ دیکھئے آج کیا ہوتا ہے۔ حقیقتاً اسٹول ان کی بہو لائی تھیں اور اس پر چڑھ کر طاق سے کوئی چیز اتاری تھی لیکن بعد کو اٹھانا بھول گئیں۔ گلشن کو اس کا علم تھا لیکن وہ کہنا نہیں چاہتی تھی کہ مبادا بات زیادہ بڑھ جائے۔ مگر وہ کب تک برداشت کرتی، آخر کار اس نے مجبور ہو کر کہدیا کہ "دلھن سے پوچھئے، وہی یہاں لائی تھیں" ــــ یہ سننا تھا کہ بیگم نے گلشن کو چھوڑ کر غریب دلھن کی طرف رخ کیا اگر اتفاق سے صاحبزادہ صاحب حکیم کے آنے کی اطلاع نہ دیتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ڈراما کیونکر ختم ہوتا۔

حکیم صاحب اس خاندان کے پرانے معالج تھے اور چند دن سے بقول خود

"ضعف" کا علاج کر رہے تھے اب یہ معلوم نہیں کہ اس سے مراد ان کی "ضعف" دور کرنا تھا یا "ضعف" پیدا کرنا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ آج صبح بیگم صاحب کو غش آ گیا تو وہ نبض دیکھنے اور حالات دریافت کرنے کے بعد دوسرا نسخہ تجویز کر کے چل دیئے۔

ان کے جانے کے بعد بیگم نے اپنے بیٹے سے کہا کہ "ذرا نسخہ تو پڑھنا۔ اس نے ابھی صرف پہلا جزو "گل بنفشہ کشمیری" ہی پڑھا تھا کہ بیگم صاحب نے چیخنا شروع کیا: "خدا غارت کرے ان حکیموں کو معلوم نہیں "بنفشہ" ان کی کوئی سگی لگتی ہے یا کیا کہ بغیر اس کا نام لیئے ہوئے ان کا قدم ہی نہیں آگے بڑھتا اور میں پوچھتی ہوں کہ یہ حکیم صاحب میری کمزوری کا علاج کر رہے ہیں یا زکام نزلہ کا لاحول ولا قوۃ۔ معاف کرو میں باز آئی اس نسخہ سے اور ہاں اس کے بعد کیا لکھا ہے؟"

"تخم گاؤ زباں"۔

"کیا کہا، تخم گاؤ زباں! آنکھیں کھول کر پڑھو، برگ گاؤ زباں لکھا ہوگا۔"

"جی نہیں اس میں تو، تخم گاؤ زباں ہی لکھا ہے۔"

"لکھنے کی غلطی ہوگی، تخم کاٹ کر برگ کر دو، ۔ اچھا آگے چلو۔"

"مویز منقے" ۔ کتنے دانے لکھے ہیں؟" ۔ "سات"۔

"سات زیادہ ہیں، پانچ کافی ہوں گے۔ اچھا ۔ "تخم کثوث"۔

اس دوا کا نام سننا تھا کہ بیگم آگ ہو گئیں اور نسخہ بیٹے کے ہاتھ سے لے کر چاک کرتی ہوئی بولیں کہ حکیم صاحب سے کہہ دینا کہ مہربانی کر کے اب میرے یہاں آنے کی زحمت نہ اختیار کریں غضب خدا کا یہ گرمی کا زمانہ، یہ میرا اختلاج یہ ضعف دماغ اور تخم کثوث! معلوم ہوتا ہے میری جان لینے کا ارادہ ہے۔

حماقت سے اسی عالم برہمی میں گلشن ناشتہ لے آئی جو غشی کی رعایت سے بہت ہلکے قسم کا یعنی صرف دلیا اور دودھ تھا۔ بیگم نے دیکھتے ہی مارے غصہ کے کشتی پر جو ہاتھ مارا تو دودھ سے تمام فرش خراب ہوگیا پلیٹ گر کر چور چور ہوگئی ۔ ایک تو بیگم کو اس بات کا غصہ کہ بجائے پراٹھے اور انڈوں کے ناشتہ میں صرف دودھ اور دلیا لایا گیا اور دوسرے اس امر کی برہمی کہ فرش خراب ہوگیا۔ پلیٹ ٹوٹ گئی۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ بالکل "دو آتشہ" ہو رہی تھیں اور آنکھیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُبل کر باہر آجائیں گی۔ بیگم کے غصہ کے تین درجے تھے۔ پہلا ہلکے قسم کا غصہ تو وہ تھا جب صرف گالیاں دینے پر کفایت ہوتی تھی اور یہ ایسی استمراری چیز تھا کہ اس کی اہمیت بھی لوگوں کے دل سے مٹ گئی تھی اور بیگم کا بڑبڑاتے رہنا، گھر کی رونق کا گویا جز ولازم ہوگیا تھا۔ دوسرا درجہ غصہ کا وہ تھا جب زبان کے ساتھ ان کا ہاتھ بھی چلتا تھا اور ہفتہ میں دو تین بار اسکا دورہ پڑنا یقینی تھا، اس کا مظاہرہ زیادہ تر خادموں پر ہوا کرتا تھا اور کبھی کبھی بیٹیوں پر لیکن ایک تیسری قسم غصہ کی اور بھی تھی، یعنی یہ کہ ان کی زبان اور ان کی ضرب دونوں کا صرف خود ان کی تین من کی وزنی "جان ناتواں" پر ہوا کرتا۔ وہ اس عالم میں اپنا منھ نوچنے لگتیں، بال کھسوٹنا شروع کر دیتیں، دیوار سے سر مار دیتیں، ہزاروں گالیاں خود اپنے آپ کو سناڈالتیں۔ اس میں شک نہیں کہ غصہ کی یہ کیفیت دوسروں کے لئے بے ضرر اور پُرامن وسکون تھی، لیکن اس کے اثرات مابعد ہمیشہ دوسری قسم کے غصہ کی صورت میں نمودار ہوتے اور وہ تمام "بے ضرری دامن پسندی" اک مستقل ہنگامہ دارو گیر اختیار کرلیتی

اس وقت جب ناشتہ انھوں نے اس بری طرح رد کر دیا تو اس خیال سے کہ اب دو پہر تک کسی طرح کا کھانا نہیں مل سکتا اور ان کو اپنا وہ معدہ جو

کسی وقت بغیر ثقیل غذا کے چین سے نہیں رہ سکتا تھا عرصہ تک خالی رکھنا پڑے گا، دفعتہً ان کا غصہ تیسرے درجہ تک پہونچ گیا اور انھوں نے وہی دیوانگی اختیار کرلی جو سارے اہل محلہ کو گوش بر آواز بنا دیتی تھی اس غصہ کا دورہ عموماً پندرہ منٹ تک جاری رہتا تھا کیونکہ گھر کے سب لوگ چاروں طرف سے انھیں سنبھال لیتے تھے، خوشامدیں کر کر کے ہاتھ جوڑ جوڑ کر سر پھوڑنے سے باز رکھتے تھے لیکن اب ان کی طرف سے بیزاریاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ ان کی اس حالت کو خدائی انتقام سمجھ کر سب اپنی اپنی جگہ خاموش رہ جانا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ کسی نے ان کو نہیں سمجھایا اور ان کا جنون بڑھتا ہی رہا یہاں تک کہ چند منٹ میں ان کے کپڑے تار تار ہو گئے اور جسم لہولہان — جب وہ خود تھک کر نیم مردہ حالت میں گر پڑیں تو سب سے پہلے صاحبزادے آئے اور انھوں نے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ " امی جان آپ ناحق اپنے آپ کو اس قدر ایذا پہونچاتی ہیں، خدا کے لئے اپنے اوپر اور ہم سب پر رحم فرمایئے یہ آخر کبتک برداشت کیا جا سکتا ہے۔"

بیگم صاحب کے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر اور کوئی نہیں تھا کہ کوئی شخص ناصحانہ لہجہ میں ان سے گفتگو کرے وہ اسکو سخت توہین سمجھتی تھیں۔ اس لئے بیٹے کی یہ بزرگانہ گفتگو سنکر اس سے زیادہ نہ ضبط کر سکیں کہ ہاتھ پکڑ کر ان کو فوراً باہر نکال دیا اور سانحہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دن گھر میں کھانا ہی نہیں پکا اور بیگم صاحب کے ساتھ سب کو فاقہ کرنا پڑا۔

سہ پہر کو جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلیں تو آنکھیں سرخ تھیں اور تیوریاں چڑھی ہوئی منھ پھولا ہوا اور پیٹ پچکا ہوا، نکلتے ہی حکم دیا تانگہ لایا جائے اور تھوڑی دیر میں وہ سوار ہو کر اپنی بہن کے مکان پر جو کسی دوسرے محلہ میں رہتی تھیں

چلی گئیں۔

بیگم صاحب کی برہمی کی یہ صورت اختیار کرلینا کوئی نئی بات نہ تھی بارہا ایسا ہوا کہ وہ برہم ہو کر چلی گئیں اور دو دن بھی اپنے پسماندگان کو چین نہ لینے دیا کہ پھر واپس آگئیں ہر چند ان کی یہ غیر حاضری سب لوگوں کو فردوسی سکون عطا کر جاتی تھی، لیکن اس نعمت کے جلد چھین لیئے جانے کا خوف اس فرحت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے دیتا تھا۔

دونوں بیٹیوں کے لیئے اول اول تو بہت جگہ سے پیام آئے لیکن بعد کو جب معلوم ہوا کہ ان کی ماں اس مزاج کی ہے تو پھر کسی نے ہمت نہیں کی بہو بھی مہینے میں بیس دن اپنے میکہ رہتی تھی اور باقی دس دن میں زیادہ حصہ بہانۂ علالت میں گزر جاتا تھا۔ بیچ میں قدر کی یہ کیفیت تھی کہ کسی وقت اتفاق سے گھر آگئے تو آگئے، ورنہ زیادہ تر دوست احباب میں یا اپنی بیوی کے گھر اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ وہ ملازم جو غریب کہیں نہیں جا سکتے تھے یا وہ اہل محلہ جو اپنے اپنے مکان نہیں چھوڑ سکتے تھے، بیشک مستقل تماشائی اس "اکھاڑے" کے تھے اور جب کسی طرف سے کوئی شور و غوغا بلند ہوتا تھا تو بغیر کسی تحقیق کے ہر شخص آنکھ بند کر کے یقین کر لیتا تھا کہ "ہو نہ ہو یہ بیگم صاحب ہی ہیں"۔

---

افسوس ہے کہ ایک ہفتہ ہوا دفعتہً زمانی بیگم کے قلب کی حرکت بند ہو گئی اور قبل اس کے کہ کوئی طبیب آکر نسخہ لکھتا اور وہ اس کے اجزاء میں حذف و اضافہ کرتیں آناً فاناً ان کا انتقال ہو گیا۔ میں تو جنازہ میں شریک نہیں ہوا، لیکن سنا ہے کہ کافی ہجوم ساتھ تھا اور ہر شخص کے چہرہ پر کچھ ایسے آثار پیدا تھے جیسے کوئی بڑی خوشی کی بات ہو گئی ہے اور سب مل کر اس تقریب مسرت سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ خود ان کے گھر والوں کے تاثر کا کیا عالم تھا؟ اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ صبح کو جانے والے کی یاد میں جب ہر شخص سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد سویا ہے تو دوسری صبح تک کسی کی

آنکھ نہیں کھلی۔ لیکن عادت بھی کیا بُری چیز ہے۔ صبح کو چار بجے جب مرحومہ کے کمرہ سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی تو گلشن نیند کی حالت میں یہی سمجھی کہ بیگم صاحب آواز دے رہی ہیں اور وہ "حضور سرکار" کہتی ہوئی اس طرح بدحواس ہو کر دوڑ پڑی جیسے بیگم صاحب کی زندگی میں دوڑ پڑتی تھی بہر حال کوئی کچھ کہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ بیگم "محلہ کی رونق" تھیں اور آج وہ رونق مفقود ہے۔

---

# دو گھنٹے جہنم میں

صبح تک میں خود بھی اپنے آپ کو ایسا بیمار نہ سمجھتا تھا کہ وصیت کی فکر کرتا یا ان سب ناتمام کاموں کا انتظام کر جاتا جن کو میں کبھی اپنی ۸۰ سال کی عمر میں پورا نہ کر سکا تھا اور نہ شاید کبھی انجام تک پہونچا سکتا، خواہ اتنی ہی عمر اور کیوں نہ مل جاتی، صرف کبھی کبھی قلب کے حوالی میں درد کی چمک محسوس ہوتی تھی اور میں سینہ پکڑ کر بیٹھ جاتا، دوپہر تک مجھے اور سب کو بھی یقین رہا کہ ریاح کا تکالف ہے، فکر کی بات نہیں لیکن جب شام کے وقت درد کے شدید و متواتر حملوں نے تشویش پیدا کی تو ڈاکٹر صاحب بلائے گئے۔ یہ میرے پرانے رفیق تھے۔ ان کو ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ اس زمانہ میں لوگ تداخل فصلین کے وقت بھی اس قدر بیمار نہیں پڑتے جتنے پہلے اچھے موسم میں صاحب فراش ہو جاتے تھے، اس میں شک نہیں کہ آدمی ذہین تھے، تجربہ کار تھے، معلوم نہیں کیوں وہ ہمیشہ مفلوک الحال رہے۔ بہرحال وہ اسکی تاویل یہی کیا کرتے تھے۔ انھوں نے آتے ہی نبض دیکھی آنکھوں کے پپوٹے چیر کر معائنہ کیا، زبان نکلوا کر اسکا رنگ دیکھا اور پھر آلہ سینہ پر رکھ کر ضربات قلب کی حالت دیکھی اور حد درجہ مایوسانہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ کر میرے اعزہ اور تیمارداروں سے کہا کہ "آپ لوگ اگر چند منٹ کے لئے باہر چلے جاتے تو بہتر تھا"۔ میں اس وقت سکون کی حالت میں تھا۔ جب تنہائی ہو گئی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ بہت جری آدمی ہیں اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ گھبرائیں گے نہیں اگر میں یہ کہوں کہ آپ جلد سے جلد اپنی وصیت مرتب کر لیجئے، اور جو ہدایتیں

اپنے پسماندگان کو کرنا ہیں کر دیجئے، کیونکہ آپ کے قلب کی حالت بہت نازک ہے اور مشکل ہی سے شاید دو گھنٹے وہ اپنا کام کر سکے۔"

اس میں کلام نہیں کہ میں فطرتاً بہت جری ہوں اور بڑی سی بڑی مصیبت میں بھی کبھی نہیں گھبرایا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس قدر ناگہاں طور پر مجھے صرف دو گھنٹے کا نوٹس اس دنیا سے چلے جانے کا دیا جس میں میں نے اپنی زندگی کے چالیس سال اس قدر انہماک و تعلق شدید کے ساتھ بسر کر چکا تھا۔ میں واقعی گھبرا گیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا کہ واقعی میں کمزور طبیعت کا انسان نہیں ہوں، لیکن یہ غلط ہوگا کہ اگر یہ کہا جائے کہ موت سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ میرا خیال کیا یقین تھا کہ کم از کم ۸۰ سال ضرور جیوں گا۔ کیونکہ میری صحت اچھی تھی میرے قوا، صحیح تھے، بیمار بہت کم پڑتا تھا پورے دو من کا وزن رکھتا تھا اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ مجھے دنیا میں بہت سے کام کرنا تھے اور میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ فطرت اس قدر ظالم ہو سکتی ہے کہ وہ مجھے قبل از وقت اٹھا لے در آنحالیکہ میرے رہنے سے اس کا کوئی نقصان نہ تھا۔ اس لئے جب میں نے یہ سنا کہ ۸۰ سال میں دفعتہً ۴۰ سال کم ہو گئے ہیں اور میں اپنے تمام کاموں کو ادھورا چھوڑ جانے پر مجبور ہوں، تو میری تمام جرات و ہمت مفقود ہو گئی اور میری حالت اس کبوتر کی سی ہو گئی جو باز کے پنجہ میں پہونچ کر بازو پھٹ پھٹانے کی بھی قوت کھو بیٹھتا ہے، سب سے پہلے مجھے اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ اس صدمہ کو کیونکر برداشت کریں گی، بیس برس کی معیت کا یوں دفعتہً ختم ہو جانا، ان کو کس قدر بیتاب کر دے گا، اس کے بعد میں نے سوچا کہ میرے دو بچے جن کی تعلیم بھی ابھی پوری نہیں ہوئی کیا کریں گے، میری چھوٹی بچی جو مجھی کو دیکھ دیکھ کر جی رہی ہے، کیونکر زندہ رہ سکے گی، روپیہ اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے کبھی پس انداز نہیں کر سکا، کاروبار کی حالت درست نہیں اور ہو بھی تو اس کا چلانے والا

کون ہے، بیمہ کی رقم بھی اتنی نہیں کہ بیوی بچوں کے لئے معقول سہارا ہو سکے۔ الغرض یہ تمام ہولناک خیالات مجسم ہو کر سامنے آگئے اور میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ جسم کے ریشہ ریشہ میں کسی نے برف پگھلا کر بھر دیا ہے۔ سر و پیشانی سے ٹھنڈا پسینہ بہہ بہہ کر ٹپکنے لگا اور ہاتھ پاؤں ایسے ڈھیلے پڑ گئے گویا ان کی جان نکل گئی ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ڈاکٹر صاحب کو کوئی جواب دوں لیکن زبان نے کام نہ دیا اور میں بے ہوش ہو کر وہیں پلنگ پر گر پڑا۔ اس کے بعد مجھے مطلق خبر نہیں کہ میں کب مرا اور کس وقت قبرستان پہونچایا گیا۔

دفعتہً میں نے محسوس کیا کہ سامنے سے ایک بڑا شعلہ چلا آ رہا ہے، لیکن تاریکی کا یہ عالم ہے کہ اسکی روشنی بالکل نہیں پھیل سکتی اور گرمی کی شدت سے دم گھٹا جا رہا ہے۔ میں نے اپنے چاروں طرف ہاتھ پاؤں چلائے تو معلوم ہوا کہ میں کسی گڑھے کے اندر بند ہوں اور جگہ اس قدر تنگ ہے کہ اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا وہ شعلہ بڑھتے بڑھتے قریب آیا اور دو حصوں میں تقسیم ہو کر میرے دونوں پاؤں کے اوپر قائم ہو گیا۔ اب گرمی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ اور کیفیت یہ تھی کہ جسم پسینہ کے گھلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں سمیٹنے چاہے کہ کہیں یہ دونوں شعلے مجھے جلا نہ دیں لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں روشنیاں طول میں بڑھنے لگیں، یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک بہت لمبی سلاخ سی بن گئی۔ اور عجیب قسم کے بھیانک سے چہرہ ان میں سے پیدا ہو کر میری طرف گھورنے لگے۔ خوف سے میری آنکھیں بند ہو گئیں اور عجیب قسم کی ہیبت مجھ پر طاری ہونے لگی۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ کہیں نکیرین ہی تو نہیں ہیں، جن کا ذکر میں نے کتابوں میں دیکھا تھا، اور اس خیال کے آتے ہی میں ایسا محسوس کرنے لگا گویا نہایت ہی وزنی گرز سر پر مار رہے ہیں اور دماغ پاش پاش ہوا

جارہا ہے میں چیخ اٹھا کہ "خدا کے لیئے مجھے کیوں مارتے ہو"۔ انھوں نے کہا کہ "آج تو ہمیں خدا کا واسطہ دلاتا ہے، لیکن یہ تو بتا کہ کبھی تو نے بھی خدا سے کوئی واسطہ رکھا تھا، تو نے اسکو ہمیشہ ایک قوت سمجھا اور قوت بھی مجبور قسم کی جو مقررہ اصول کے خلاف کچھ نہیں کرسکتی۔ پھر آج کیا ہوا جو اس کی پناہ میں آنا چاہتا ہے۔"

اب مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہا کہ "یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ بات کا جواب بھی نہیں سنتے اور مارنا شروع کردیتے ہو۔ مجھ سے سوال کیا ہے تو اس کا جواب سن لو پھر مارنے نہ مارنے کا تمھیں اختیار ہے۔"

وہ لفظ "انسانیت" سن کر بہت ہنسے (ان کی ہنسی بہت عجیب قسم کا زہر خند تھی)، اور بولے کہ "اے بیوقوف انسان اور انسانیت یہ سب دنیا اور مادی عالم کی اصطلاحیں ہیں یہاں ان کا استعمال درست نہیں۔ پھر یہ کہ ہم انسان کب ہیں جو ہم سے انسانیت کی توقع رکھتا ہے۔ ہم لوگ فرشتے ہیں، فرشتے، یوں ہی گرز چلاتے چلاتے نہ معلوم کتنا زمانہ گزر گیا ہے اور دشمنی کی وہ آگ جو آدم کی پیدائش کے وقت سے مخفی طور پر ہماری مخلوق میں انسان کی طرف سے بھڑکتی آرہی ہے، اسے اسی طرح بجھایا کرتے ہیں۔ بیشک ہم نے آدم کو سجدہ کیا تھا، لیکن وہ سجدہ مجبوری کا تھا نہ کہ دل کی خوشی کا۔"

میں نے یہ خیال کرکے نہ ان کی گفتگو سے تو کچھ خدا کی طرف سے بھی بیزاری پائی جاتی ہے بہت خوش ہو کر کہا کہ "سچ کہتے ہو، واقعی تمھاری سخت توہین کی گئی کہ خاک کے پتلے کے سامنے جھکنے پر مجبور کیئے گئے۔ اس لیئے اگر تم مجھے مہلت دو، تو میں تمھیں خدا کی بندگی کے عذاب سے نجات دلانے کے لیئے آمادہ ہوں اور سچ پوچھو تو خدا انھیں کو ہونا چاہیئے کہ تمھارے گرز سے سام و نریمان رستم و

اسفندیار کا کلیجہ دہل سکتا ہے۔ میں نے تو خدا کا واسطہ صرف اس عادت کی بنا پر دلایا تھا جو دنیا کی زندگی میں پڑ گئی تھی اور جس مقصود گفتگو میں زور دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اچھا تو مجھے اٹھاؤ اور اس تاریک غار سے باہر نکالو تاکہ میں آزادی سے سانس لے کر سوچوں کہ کیونکر تمہاری خدائی دنیا میں قائم ہو سکتی ہے۔"

وہ یہ سن کر بہت ہنسے اور بولے کہ "ساری عمر میں تو ہی آج پہلا مُردہ ایسا ملا ہے جو ہمیں بہکا کر خدا سے منحرف کرنا چاہتا ہے۔ احمق تجھے نہیں معلوم کہ ہماری حرکتیں مشین کی طرح ہیں اور ہم کو نہ سوچنے کا اختیار ہے، نہ اسکے علاوہ کچھ کرنے کا، جو بے اختیارانہ طور پر ہم سے سرزد ہوتا رہتا ہے۔ زیادہ بک بک نہ کر، اٹھ جہنم تیرا انتظار کر رہا ہے، اور آگ کے شعلے تجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔"

---

اب مجھ کو پہلی مرتبہ واقعی طور پر معلوم ہوا کہ میں مر گیا ہوں اور جہنم کا نام سنکر پھر میرے حواس نے جواب دینا شروع کیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نکیرین غائب ہیں اور میرے گلے میں ایک زنجیر پڑی ہوئی ہے۔ جو مجھے تپتے ہوئے ریگستان کے اوپر سے گھسیٹتی ہوئی کسی طرف لیئے جا رہی ہے۔ اِدھر اُدھر میں نے نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ دور دور فاصلہ پر مجھ ایسے سیکڑوں مُردے گھسیٹے جا رہے ہیں ان میں سے کوئی چیخ رہا ہے کوئی تڑپ رہا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو میری طرح بالکل خاموش ہیں اور حد درجہ بیچارگی کے ساتھ گھسیٹے جا رہے ہیں تھوڑی دور چل کر میں نے دیکھا کہ ہر مردہ کی سمت رفتار بدل گئی ہے، اور اب میں تنہا رہ گیا ہوں، وہ زنجیر دفعتہً مجھے غار تک پہونچا کر غائب ہو گئی۔ اور میں اس کے اندر اس تیزی سے جانے لگا جیسے کوئی اژدہا اپنی گرم و مسموم سانس سے کھینچ رہا ہو، مجھے نہیں معلوم کہ

کب تک اس طرح گھسٹتا رہا، دفعتہً یہ کشش بھی دور ہوئی میں نے اپنے آپ کو ایسے میدان میں پایا جو حدِ نظر تک وسیع تھا اور آگ کی گرمی سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سرخ آندھی چھائی ہوئی ہو۔ جابجا چنگاریوں کے بگولے بلند ہو رہے تھے اور کہیں کہیں آگ کے فیل پیکر شعلے جن میں سے بعض بالکل تاریک تھے، اور بعض بالکل سفید، اس طرح اُٹھ رہے تھے جیسے طوفان میں سمندر موجیں لے رہا ہو۔ پیاس سے بُرا حال ہو رہا تھا، زبان باہر نکل پڑی تھی، تالو چٹخا جا رہا تھا، اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں سے کھولتا ہوا پانی ہی میسر آجائے۔ لیکن بالکل کامیاب نہیں ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھ پر عذاب ہی ہونا ہے تو وہ کیوں نہیں شروع ہو جاتا، اور کیوں نہیں مجھے آگ میں ڈال دیا جاتا کہ جل بھُن کر خاک ہو جاؤں اور اس تکلیف سے نجات پاؤں۔ ناگہاں ایک فرشتہ سامنے سے اڑتا ہوا نظر آیا جس کے پر دیازو شعلے کی طرح چمک رہے تھے اور جس کا چہرہ ایسا نظر آتا تھا جیسے کھولتا ہوا تانبہ۔ اس چہرہ میں صرف ایک آنکھ چاندی کی ٹکی کی طرح درمیان میں چمک رہی تھی۔ جس کے اندر سے کبود رنگ کی شعاعیں، ببول کے کانٹوں کی طرح نکل نکل کر جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں وہ میرے سامنے آکر قائم ہو گیا اس حال میں اس کا سارا جسم ایسا نظر آتا تھا، جیسے گندھک کے ڈھیر میں آگ دیدی گئی ہو۔

اس نے کہا: "تمھارے لئے یہ حکم ہوا کہ فی الحال چند دن تک جہنم میں آزاد چھوڑ دئے جاؤ اور سوائے اس ایذا کے جو یہاں کی فضا میں از خود تمھیں پہونچ جائے کوئی اور مسلط نہ کیا جائے۔"

یہ کہہ کر فرشتہ دھوئیں کی شکل اختیار کر کے فضا میں از خود تحلیل ہو گیا اور میں حیران کہ آزادی بھی ملی تو کہاں جا کر۔ لیکن اس خیال سے کہ خیر فردوس کی پابندی سے

بہرحال جہنم کی آزادی بہتر ہے آگے بڑھا اور یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اب بجائے چٹیل میدان کے نہایت وسیع قلعہ کا سا حصار سامنے تھا۔ میں اس پھاٹک پر تھا جو سرنگ کی طرح بالکل گول تھا دفعتہً دروازہ کھلا اور میں اندر داخل ہو گیا ایک طرف نہایت وسیع جھیل کھولتے ہوئے پانی کی تھی جس میں نئے مُردے لالا کر غوطہ دئیے جا رہے تھے اور اس طرح گویا سب سے پہلے ان کی چربی نکالنے کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ عفونت سے دماغ سڑا جا رہا تھا اور چیخ پکار سے کلیجہ دہلا جاتا تھا داہنی طرف نگاہ گئی تو بہت سے آہنی مکان نظر آئے، جن کی دیواریں بلند تھیں لیکن شعلے ان کے اوپر سے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ہر مکان کا ایک دروازہ تھا لیکن بہت تنگ اور اس کے اندر سے بھی دہکتی ہوئی آگ اس طرح نظر آتی تھی جیسے انجن کی بھٹی دروازہ کھلنے کے بعد۔

سب سے پہلے مکان کے دروازہ پر آتشیں حروف میں ابلیسؔ کے نام سے بورڈ لٹک رہا تھا۔ لیکن یہ مکان مکین سے خالی تھا کیونکہ قیامت کے دن تک یہ دنیا میں آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ اندر صرف دھواں سا اٹھ رہا تھا اور آتشکدے ہنوز روشن نہیں کئے گئے تھے۔

اسکے پاس ہی دوسرے مکان پر فرعونؔ کا نام درج تھا۔ یہ نام دیکھتے ہی تمام وہ جھگڑے سامنے آ گئے۔ جو اس کے اور موسیٰ کے درمیان پیدا ہوئے تھے۔ اور بیتابانہ اندر داخل ہو گیا دیکھا کہ ایک نہایت ہی مہیب شکل کا انسان بیتابانہ ادھر اُدھر دوڑتا پھر رہا ہے تمام جسم میں اس کے سانپ بچھو لپٹے ہوئے ہیں۔ اور وہ ان کے زہر کی تکلیف سے بے چین ہو کر قریب ہی ایک گڑھے میں جس کا پانی سرد معلوم ہوتا ہے کود پڑتا ہے لیکن اس کے کودتے ہی آگ لگ جاتی ہے، اور پھر وہاں سے گھبرا کر باہر نکل آتا ہے۔ میں نے چاہا کہ کھڑے ہو کر کچھ حالات دریافت

کروں لیکن اسکی بیتابی کسی ایک جگہ لمحہ بھر کے لیئے بھی ٹھہرنے کی اجازت نہ دیتی تھی، اس لیئے میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ سامنے اس کے عذاب کا مفصل پروگرام دیوار پر منقوش تھا اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ہزار طرح کے عذابوں میں یہ صرف دوسرے قسم کا عذاب تھا جو ایکہزار سال تک اسی طرح قائم رہے گا اس کے بعد تیسرے عذاب کا زمانہ آئے گا، پھر چوتھے کا یہانتک کہ جب یہ ہزار قسم کے عذاب پورے ہو جائیں گے، تو پھر دس لاکھ سال کا دوسرا پروگرام بنایا جائیگا۔

میں گھبرا کر یہاں سے نکلا، تو قریب ہی قریب ہامان و شداد کے مکان نظر آئے لیکن میں اندر نہیں گیا اسی طرح قارون، نمرود، سامری۔ ضحاک وغیرہ کی عذاب گاہوں سے گزر گیا، لیکن جب دفعتہً میری نگاہ کلیوپٹرا کے بورڈ پر پڑی تو ٹھہر گیا، کیونکہ مجھے اسکی زیارت کا بڑا شوق تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ دیکھوں اس میں وہ کون سی بات تھی جس نے قدیم مصر کو دیوانہ بنا رکھا تھا اندر گیا تو سب سے پہلے ایک آتشیں آبشار نظر آئی جو ایک سنگین مورت پر تیزی کے ساتھ گر رہی تھی، جس وقت اس آبشار کی دھار اس بُت پر پڑتی تھی تو فوارہ کی شکل میں اس سے چنگاریاں بلند ہونے لگتی تھیں، یہ بُت کلیوپٹرا کا تھا، بلند بالا، پرشباب، آشفتہ گیسو، اور سر سے پاؤں تک بالکل عریاں و بے پردہ، میں حیران تھا کہ اگر کلیوپٹرا کو پتھر بنا کر بتلائے عذاب کیا گیا ہے تو اسکو خدا کے جمالیاتی ذوق کی رعایت کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ دفعتہً وہ بُت شق ہوا اور اس کے اندر سے ایک عورت انسانی شکل و صورت اور خدوخال کی نمودار ہوئی۔ اس کے تمام جسم پر چھوٹے چھوٹے آبلے موتی کی طرح جھلک رہے تھے، لبوں سے خون کے قطرے اور آنکھوں سے عنابی رنگ کے آنسو ڈھلک ڈھلک کر آبلوں پر رنگین خط ڈالتے ہوئے نیچے گر رہے تھے، گلے میں سفید انگاروں کا ایک ہار پڑا ہوا، آگ کی لپیٹ سے جنبش میں اگر جسم سے

مس کرتا تھا اور ہر بار اس کے گورے گورے جسم پر ایک سرخ نشان چھوڑتا جاتا تھا، اس عالم میں بھی اس پہ ایک شاہانہ جمال کا رنگ پیدا تھا۔ اور قیصر وانطانی اگر اس حال میں بھی اسے دیکھ لیتے تو شاید اس سے دوبارہ مل جانے کے گناہ میں ایک عمر دوزخ اور بسر کرنے کے لیے آمادہ ہو سکتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی وہ نگاہیں دیکھوں جن سے مسحور ہو کر انسان خوشی سے جام زہر پی جایا کرتا تھا، اس کی لانبی لانبی پلکیں خون تو ضرور ٹپکاتی رہیں، لیکن اس کی نگاہوں نے بلند ہو کر فضا کو مسموم نہیں کیا، تھوڑی دیر تک اسی حالت میں رہنے کے بعد وہ بُت پھر شق ہوا اور اس کے اندر کلیوپٹرا سمانے لگی، یہ غالباً اس کے لیے سب سے بڑا عذاب تھا، کیونکہ جتنا حصہ اس کے جسم کا پتھر میں تبدیل ہوتا جاتا تھا اسی قدر زیادہ اس کے چہرہ سے کرب و ملال کے آثار ظاہر ہوتے جاتے تھے، یہاں تک کہ جب گردن تک وہ پتھر کی ہو گئی تو ایک ایسی چیخ اس کے منھ سے نکلی جیسے سیکڑوں من بوجھ کے نیچے دب گئی ہو اور پھر دفعتہً اس کا چہرہ وسر بھی اسی سنگین حالت میں منتقل ہو گیا۔ دوزخ میں آنے کے بعد یہ پہلا منظر تھا جس نے بجائے غم و غصہ کے ملال کی کیفیت میرے اندر پیدا کی۔

یہاں سے نکلنے کے بعد مجھے نینوا د بابل کی ایک مشہور رقاصہ کا مکان جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ہاروت و ماروت کو مبتلائے حسن کر کے اس نے اسم اعظم سیکھ لیا تھا اور آسمان پر زہرہ بنکر اڑ گئی تھی۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ آسمان پر اڑ جانا غلط خبر تھی، بلکہ وہ قعر جہنم میں ہاروت و ماروت کے ساتھ پھینک دی گئی تھی، میں اسے بھی دیکھنے کا شائق تھا اس لیے اندر گیا یہاں میں نے نہایت تاریک دھواں دیکھا، جس میں چنگاریاں جگنو کی طرح چمک رہی تھیں۔ دیر تک آنکھیں ملنے کے بعد اسی تاریکی میں دور ایک عورت نظر آئی جو انگاروں پر لوٹ رہی

تھی اور جسم سے چربی اور خون کے جو قطرے ٹپک ٹپک کر آگ پر گرتے تھے تو سخت عفونت پیدا ہوتی تھی۔ میں یہاں زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھہر سکا اور فوراً ناک بند کرکے باہر نکل آیا۔

میں یہاں سے نکل کر کہاں گیا، اور کن کن لوگوں کو عذاب میں مبتلا پایا، اسکی تفصیل کسی آئندہ صحبت پر ملتوی رکھتے ہوئے صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب اس طبقہ میں پہونچا جو صرف شاعروں کے لئے مخصوص تھا، تو میرؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ، آتشؔ وغیرہ خدا معلوم کن کن شاعروں سے مل کر غالبؔ کے پاس پہونچا۔ تو وہاں ایک عجیب وغریب لطیفہ انھوں نے سنایا کہ:-

جب میرے اعمال کا محاسبہ ہوا اور دوزخ کے قابل نہ سمجھ کر مجھے جنت کے ایک نہایت ہی حقیر حصہ میں لے جاکر ایک ایسے حجرہ میں بند کر دیا، جہاں سوائے ایک خشک گملے کے اور کچھ نہ تھا تو مجھ سے دریافت کیا کہ تم اپنی بہت سی آرزوئیں نامکمل چھوڑ کر آئے ہو اور تمھارے بہت سے ناکردہ گناہوں کی حسرت ہنوز دادطلب پڑی ہوئی ہے اس لئے بتاؤ ان میں سے کوئی ایک آج پوری ہو سکتی ہے۔ میں نے فرطِ مسرت میں گھبرا کر کہدیا کہ "کوئی ایک" میرے منھ سے یہ نکلا ہی تھا کہ فردوس کے اس حجرہ کو اٹھا کر یہاں دوزخ میں ڈال دیا۔ میں حیران تھا کہ خدایا میری کون سی آرزو تھی جو اس طرح پوری کی جا رہی ہے کہ ناگہاں سامنے دیوار پر یہ مصرعہ نظر آیا کہ:-

دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو

اب میری سمجھ میں آیا کہ میرے اوپر اس مصرعہ کی وجہ سے عذاب نازل کیا گیا ہے خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا، لیکن میری سمجھ میں آج تک یہ نہ آیا کہ اس شعر کا پہلا مصرعہ "طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ" خدا کو سنایا گیا یا

نہیں ظاہر ہے کہ وہاں تک یہ بات نہیں پہونچی۔ ورنہ مجھے تو فردوس سے بھی بلند کوئی چیز ملنی چاہئے تھی نہ کہ ایسا حقیر و کثیف حجرہ، جو اگر جہنم میں ڈال دیا جاتا تو میں خود اس کے اندر آگ جلاکر اس کی گندگی و عفونت کو دور کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان ظاہر پرست ملاؤں نے یہاں بھی اپنا اقتدار قائم کرلیا ہے اور افسوس ہے کہ اب فردوس بھی رہنے کے قابل جگہ نہ رہی"

میں نے یہ سن کر کہا کہ "آپ کا یہ خیال غالباً درست نہیں، کیونکہ میں نے آج ایسے ایسے مولویوں اور تہجد گزار بزرگوں کو دوزخ میں جلتے اور سسکتے دیکھا ہے کہ ان کی نسبت کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اعلیٰ علیین سے ایک قدم نیچے اتریں گے"۔

یہ سن کر وہ بہت متحیر ہوئے اور بولے کہ "پھر تو دوزخ بھی رہنے کے قابل نہ رہی تمام عمر ان کے صلاح و تقویٰ کے وعظ نے مجھے دنیا میں چین نہ لینے دیا۔ فردوس کا حال معلوم نہیں کہ وہاں میں نے کچھ دیکھا نہیں۔ جہنم میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہ عذاب یہاں بھی موجود ہے۔ لاحول ولا قوۃ کہو تم یہاں کس سلسلہ سے آئے ہو"۔

میں نے عرض کیا کہ مجھے ابھی تک بالکل اسکا علم نہیں۔ فی الحال آزاد چھوڑ دیا گیا ہوں آئندہ دیکھئے کیا فیصلہ ہوتا ہے، ڈرتا ہوں کہ شاعروں کے سلسلہ میں کہیں جگہ نہ دی جائے کیونکہ ان پر جس قسم کے عذاب ہوتے میں نے دیکھا ہے وہ حد درجہ توہین آمیز ہے۔ انکے ہر ہر جھوٹے شعر کی ایک تمثالی صورت عذاب کی صورت میں پیش کی جاتی ہے اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ شاعر کس کس طرح جھوٹ بولتا ہے۔ معلوم نہیں آپ نے یہ شعر۔

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

کسی واقعہ کی بنا پر کہا ہے یا نہیں۔ لیکن اگر یہ شعر جھوٹ کہا گیا ہے تو یقیناً یہ حرکت آپ کو یہاں کرنا پڑے گی اور ایک ہزار سال تک جو یہاں کی ریاضی اکائی ہے برابر آپ کو

کسی نہایت ہی مکروہ شکل والے کے پاؤں دابنا پڑیں گے۔ الغرض میں اس وقت سے کانپتا ہوں جب شعراء کے زمرہ میں مجھ پر عذاب نازل کیا جائے۔ ہر چند اس کا اندیشہ کم ہے کیونکہ اول تو میں نے شعر ہی بہت کم کہے ہیں اور جو چند کہے بھی ہیں تو وہ شعروں میں شمار ہونے کے قابل نہیں۔

وہ اس کا جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ دفعتہً اپنے ہاتھوں سے منھ نوچنے لگے، سینہ زخمی کرنے لگے میں نے خیال کیا کہ یقیناً یہ بھی کوئی عذاب ہے اور دیر تک سوچنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ داد ہے ان کے اس شعر کی۔

تا بند نقاب کہ کشو دست کہ غالبؔ
رخسار بہ ناخن صلہ دادیم و جگر ہم

میں یہ دیکھ کر یہاں سے دبے پاؤں باہر چلا گیا۔ اور سوچتا رہا کہ دیکھئے اب کب تک غریب غالبؔ اس حال میں مبتلا رہتا ہے۔

---

جہنم کے کتنے طبقات ہیں اس کا علم مجھے نہیں، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ ہر گروہ و جماعت کے لیئے ایک ایک حصہ مقرر ہے۔ مثلاً ایک حصہ جہنمی بادشاہوں کا ہے جن میں سے صرف فرعون کا حال میں نے لکھا، دوسرا حکماء اور علماء کا ہے جن میں سے ارسطو، افلاطوں، فیثاغورث وغیرہ سیکڑوں کو مختلف عذاب میں میں نے مبتلا دیکھا، ایک حصہ مولویوں، متقیوں اور نمازیوں کا بھی ہے، اور یہ دیکھ کر مجھے کتنی حیرت ہوئی کہ ان میں سے بعض ایسے ایسے اکابر بھی مبتلائے عذاب تھے جنھوں نے دنیا میں اپنی مستقل شریعتیں قائم کر رکھی تھیں، لیکن سب سے زیادہ ہنسی مجھے اس وقت آئی جب میں نے اپنے محلہ کے ایک مولوی کو بھی یہاں دیکھا اور وہ مجھے دیکھ کر سخت شرمندہ ہوا۔ کیونکہ وہ مجھے ہمیشہ کافر اور جہنمی کہا کرتا تھا۔ اور

اپنے آپ کو رضواں کے بیٹے سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے آزاد پھرتا دیکھ کر اسے بڑا رشک آیا، لیکن میں نے کوئی طعن آمیز فقرہ استعمال نہیں کیا، کیونکہ اسکی حالت خون اور پیپ پیتے پیتے بہت سقیم ہو گئی تھی اور اس کی زبان پر ببول کے کانٹوں کی طرح سیکڑوں خار پیدا ہو گئے تھے، جن کی وجہ سے وہ زبان کو اندر نہ لے جا سکتا تھا۔

جب بادشاہوں، امیروں، فلسفیوں، مولویوں، شاعروں، اور مصنفوں کے طبقات سے گزر کر میں اس حصہ میں پہونچا جو عورتوں کے لئے مخصوص تھا تو مجھے سخت تکلیف محسوس ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے قطب مینار سے اٹھا کر مجھے پھینک دیا۔ میں چونک پڑا اور آنکھ کھلی تو دیکھا بیوی بری طرح رو رہی ہیں اور کچھ لوگ کفن لا کر میرے غسل کی تیاری میں مصروف ہیں، ٹھیک ۵ بجے شام کو ڈاکٹر صاحب نے میری دو گھنٹے کی زندگی کا اعلان کیا تھا اور ۷ بجے شام کو دو گھنٹے بعد جو میری آنکھ کھلی تو میں زندہ تھا۔

---

# میر بیدانہ

سید لطافت حسین پرانی وضع قطع کے بزرگ تھے، لیکن تھے نہایت وسیع معلومات کے انسان اور قدیم و جدید علوم دونوں سے باخبر، اخلاق کے لحاظ سے جو اوصاف ایک سید میں ہونے چاہئیں وہ سب ان میں پائے جاتے تھے، متین و سنجیدہ روش کے ساتھ ہر شخص سے جھک کر ملنا، ہم لوگوں کے ساتھ تلطف، چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کا احترام، یہ ان کی وہ خصوصیات تھیں جن سے ہر شخص واقف تھا۔ جس سے جو رسم ایک مرتبہ قائم ہو گئی اس میں کبھی فرق نہ آنے دیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ اپنی غرض کسی کے سامنے نہ لے جائیں۔ بیس روپے پنشن کے ملتے تھے اور اسی میں کسی نہ کسی طرح سیدانی پورا کرتی تھی۔ میر صاحب کے مزاج میں شگفتگی بھی بہت تھی، اور بعض لوگ ان سے مذاق بھی کر لیتے تھے چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب ان کے دانت گر گئے تو ان کے کسی دوست نے ان پر "میر بیدانہ" کی پھبتی کہی اور یہ اس قدر مشہور ہوئی کہ قصبہ کا ہر شخص انھیں میر بیدانہ کہنے لگا، لیکن باوجود ان تمام صفات کے ہر شخص ان سے ملتے ہوئے گھبراتا، اور اگر دور دور سے بھی ان کی صورت دیکھ لی تو راستہ کترا کر نکل جاتا۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ بات شروع کرنے کے بعد وہ ختم کرنا جانتے ہی نہ تھے اور سلسلہ گفتگو میں وہ ایسی پیچ در پیچ کڑیاں پیدا کرتے ہوئے چلے جاتے تھے کہ آدمی گھبرا جاتا، اور آئندہ کے لئے توبہ کر لیتا تھا کہ ان کو کبھی اپنی صورت نہ دکھائے گا۔ بڈھی سیدانی

کا بھی ناک میں دم تھا اور ہر روز وہ انھیں سمجھاتی تھی کہ خدا کے لیئے یہ عادت چھوڑ دو میں تو خیر کسی نہ کسی طرح گوارا کر لیتی ہوں، لیکن دنیا کیونکر اسے برداشت کر سکتی ہے تم زمانہ کی تو شکایت کیا کرتے ہو کہ جسے دیکھیئے منھ چڑا تا ہے، لیکن تم اپنی زبان کو تو دیکھو جو لوگوں کے لیئے ایک مستقل مصیبت ہو کر رہ گئی ہے، مگر میر صاحب کی سمجھ میں کبھی یہ بات نہ آئی کہ ان پر کیوں یہ الزام قائم کیا جاتا ہے۔

بارش کا زمانہ تھا ایک دن صبح کو اٹھے تو کسلمند تھے اور کچھ آثار نزلہ کے پائے جاتے تھے۔ بیدانی نے مضمحل دیکھ کر دریافت کیا کہ "کیوں کیسی طبیعت ہے یہ سن کر میر صاحب نے فرمایا۔

"کل شام جو میں گھر سے نکلا تو بارش دفعتہ آگئی، یہ ساون کا مہینہ اور گنوار کے سے جھالے! ہماری جوانی میں ساون ایسا نہ ہوتا تھا، کالی کالی گھٹائیں گھنٹوں پہلے امنڈ امنڈ کر آنا شروع ہوتی تھیں، لوگ دیکھ کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہونچ جاتے تھے یا کہیں ایک جگہ جمع ہو کر جھولے ڈالتے تھے کھانے پکتے تھے۔ ناندیں آموں سے بھر دی جاتی تھیں۔ خدا بخشے آباد خاں مرحوم کو عجیب سیر چشم رئیس تھے انھیں کے ہاں اکثر ہجوم ہوا کرتا تھا اور بغیر میرے تو نوالہ نہ توڑتے تھے۔ اب نہ ویسے رئیس ہیں اور نہ وہ سیر چشمیاں، ہائے یہ زمین بھی کیسے کیسے آسمان کھائے بیٹھی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے جیسے کل کی بات ہو کہ برابر ایک ہفتہ سے ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ احباب کا مجمع تھا، چہلیں ہو رہی تھیں، باغ میں ایک طرف خورشید، جدن، ننھی اور چھٹن پکوان کی تیاریوں میں مصروف تھیں، دوسری طرف مشتری اور ہرمزی، جھولوں پر ملار کی تانیں اڑا رہی، جس وقت انھوں نے "کوئلیا کوک سنا دے" شروع کیا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بادل امنڈ امنڈ کر آ رہا ہے، کیا آواز تھی، کیا خدا داد مرکیاں گلے میں پڑی ہوئی تھیں، اب یہ فن بھی بالکل معدوم ہوتا جاتا ہے غضب

خدا کا لکھنؤ جہاں سے واجد علیشاہ کے زمانہ میں ٹھمریوں کی ابتدا ہوئی، وہاں بھی اب سوائے غزلوں اور قوالیوں کے کچھ نہیں سنائی دیتا، گانا کیا ہوتا ہے عرس ہوتا ہے، ہائے کیا مردنی لوگوں کے ذوق پر چھاگئی ہیں نے خود وہ زمانہ دیکھا ہے زیادہ دنوں کی بات نہیں کہ اسی شاہ مینا کے مزار پر سوائے خیال اور ٹھمری کے کوئی چیز گائی نہ جاتی تھی، یا آج یہ حالت ہوگئی ہے کہ لکھنؤ کی اچھی سے اچھی گانے والی عورت بھی وہاں پہونچ کر زنخوں کی طرح تالی بجا بجا کر "آہے وا آہے وا" کرنے لگتی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ان صوفیوں نے لوگوں کے اخلاق درست کئے ہوں یا خراب، لیکن موسیقی کے گلے پر تو انھوں نے یقیناً چھری پھیر دی ہے کوئی پوچھے کہ جب تمھیں کسی بات کا سلیقہ نہیں تو کیوں اسے اختیار کرتے ہو، لیکن وہ تو مقصود عوام کو اپنی طرف کھینچنا ہے کہ اسی طرح لوگوں کا میلان ہماری طرف ہو جائے گا۔ جیسے تھیٹر کا اشتہار تقسیم کرنے والی گاڑی پر باجہ بجتا ہے اسی طرح گویا صوفیوں کی بزم تصوف کا گانا ہے، جب نٹ تماشہ کرتے ہیں تو پہلے ایک جگہ بیٹھ کر زور زور سے ڈھول پیٹنے لگتے ہیں اور جس وقت لوگ اس آواز کو سن کر جمع ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اپنی بازی گری شروع کر دیتے ہیں۔ یہی حال صوفیہ کی ڈھولک کا ہے کہ جب اس کے لالچ سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں تو پیر صاحب پر حال طاری ہوتا ہے اور سو میں دس ایسے بیوقوف ضرور ہی نکل آتے ہیں جو ان کو اللہ والا سمجھ کر دست ارادت پھیلا دیتے ہیں۔ سال میں پندرہ بیس جلسے ہوئے اور کم از کم ۳۶۵ مرید ایک ایک روپیہ سالانہ دینے والے پیدا ہو گئے۔ چلئے محنت ٹھکانے لگی تیس روپیہ ماہوار کا سہارا ہوگیا اس سے بہتر کیا نجات ہو سکتی ہے ..... " سیدانی بات کاٹ کر بولیں " لاحول ولا" میں کہتی ہوں کہ یہ تم کو ہو کیا گیا ہے میں نے تو پوچھا تھا کہ تمھاری طبیعت کیسی ہے، اور تم نے یہ الھا شروع

کردیا، میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تم میرا سر شام تک کھاتے رہو، گھر کا سارا کام پڑا ہے، جلدی بولو چائے پیو گے، یا جوشاندہ" کل شام کو بھیگ گئے تھے اور اس سے نزلہ ہو گیا ہے جوشاندہ بہتر ہو گا۔"

میر صاحب، ہاں جوشاندہ بہتر ہو گا لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ اب مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ حکیم مہدی حسن مرحوم جبتک زندہ رہے جوشاندہ کا بھی اثر رہا، اب وہ نہیں تو یہ بھی بیکار ہو گیا۔ معلوم نہیں کہ آجکل کے طبیب لکھنا نہیں جانتے یا دوائیں خراب آنے لگی ہیں، کہ کسی چیز میں اثر ہی نہیں رہا جب کبھی کھانسی ہوتی ملیٹھی کا ٹکڑا منھ میں رکھ لیا اور غائب ہو گئی اب سیروں کھا جاؤں تو بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میاں ہادی حکیم مہدی حسن کے بیٹے کے پاس جاؤں گا اور ان سے پوچھوں گا کہ اس موسم میں جبکہ نزلہ کے آثار ہوں تو جوشاندہ کے اجزاء کیا ہونے چاہئیں دیکھو وہ کیا کہتے ہیں، لیکن کہیں گے کیا مجھے معلوم ہے کہ۔ یہی بنفشہ گاؤ زباں بتائیں گے میرا تو ان دواؤں سے اب جی گھبرا گیا ہے، یہ اطبا بھی بالکل لکیر کے فقیر ہیں چند دواؤں کے نام انھوں نے رٹ لیئے ہیں بس انھیں الٹ پھیر کر لکھ دیتے ہیں، نہ یہ دیکھتے ہیں کہ موسم کا کیا اقتضا ہے بیمار کس طبقہ کا ہے اس کا مزاج کیسا ہے، کتنی مقداریں، کیا دوا اس کو دینی چاہیئے یہ بات تو حکیم مہدی حسن میں عجیب تھی میرے سامنے ہی دو آدمی آئے جن کو قبض کی شکایت تھی، ایک کو صرف گل قند اور منقے لکھا اور دوسرے کو جمال گوٹہ کی گولی دی، میں نے سبب پوچھا تو ہنس کر بولے کہ جس کو میں نے جمال گوٹہ دیا ہے وہ گاؤں کا محنتی کسان ہے اور سخت معدہ رکھتا ہے اس پر معمولی مسہل دواؤں کا کیا اثر ہو سکتا ہے، دوسرے صاحب شہر کے نازک مزاج بے احتیاط نوجوان ہیں۔ معدہ یوں ہی ضعیف ہے، ذرا دیر دھوپ میں بیٹھ جائیں تو دست جاری ہو جائیں

انھیں گل قند کافی ہے۔ یہ سوجھ بوجھ اب کہاں ہے۔

میر صاحب دیر تک مصروف جواب دہی رہی اور سیدانی غصہ کے مارے اٹھ کر چل دیں۔

---

مجھے ایک ضروری کام سے لکھنؤ جانا تھا، اسباب براہ راست اسٹیشن پر بھیج دیا تھا۔ اور میں ایک صاحب سے ملنے جا رہا تھا، خیال تھا ان سے باتیں کر کے وقت پر اسٹیشن پہونچ جاؤں گا۔ بدقسمتی سے میر صاحب ایک ایسی گلی کے موڑ پر مل گئے کہ میں ان سے بچ کر کسی طرح نکل ہی نہ سکتا تھا، دیکھتے ہی روح خشک ہوگئی، لیکن چونکہ یہ میرے والد کے دوست تھے اور میں ان کا بہت ادب کرتا تھا اس لئے مجبوراً چہرہ کو شگفتہ بنا کر سلام عرض کرنا پڑا اور قبل اس کے کہ ان کا دعائیہ فقرہ پورا ہوتا میں نے ایک ہی سانس میں نہایت جلدی جلدی یہ بھی کہدیا کہ "حضرت نہایت عجلت میں ہوں اس وقت کی گاڑی سے لکھنؤ جانا ہے" اور یہ کہہ کر بغیر انتظار جواب میں آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ انھوں نے فرمایا" میاں ذرا ٹھہرو میرا بھی ایک کام ہے، لیکن خیال رہے کہ تمھیں زحمت نہ ہو اور بعد کو....

میں نے قطع کلام کر کے عرض کیا کہ" اس کا خیال نہ فرمایئے، آپ جو حکم دیں گے اس کی تعمیل ضرور ہوگی"۔ چونکہ وہ پان کے زیادہ شایق تھے اس لئے میں نے خود ہی قیاس سے کام لے کر کہا کہ" کیا قوام کی ضرورت ہے اور یہ اس لئے کہ کسی طرح جلدی نجات مل جائے تو میں نکل بھاگوں۔ مگر میر صاحب جن کو اپنے آپ سے ہمیشہ کم گوئی کی شکایت رہی کب ماننے والے تھے انھوں نے فرمایا کہ" میاں قوام کھانا تو میں نے عرصہ ہوا ترک کر دیا، تمھارے والد انھیں جوار رحمت میں جگہ دے، اور یقیناً انھیں وہاں ایسی ہی جگہ ملی ہوگی کیونکہ ان کے اخلاق ہی ایسے تھے کہ

اپنی ساری عمر دوسروں کی خدمت کے لیے وقف کردی، اور اپنے مدعا پر کبھی نظر نہیں کی جب غدر کے بعد مارشل لا جاری ہوا، اور ایک ایک سرجنٹ کو پھانسی کے اختیارات دے گئے تو تمھارے والد مرحوم کان پور میں مجسٹریٹ ضلع کے چیف ریڈر تھے اور اتنا وقار رکھتے تھے جو حکم لکھدیا اس پر دستخط ہو گئے۔ اس زمانہ میں انھوں نے خدا جانے کتنے رئیسوں کی جان بچائی، وہ چاہتے تو کروروں روپیہ کما لیتے، انھوں نے اس طرف نگاہ ہی نہیں ....» میں نے پھر ذرا جرأت کر کے بات کاٹی اور کہا " اچھا اگر قوام آپ نے ترک کر دیا ہے تو فرمایئے اور کیا لاؤں، وقت تنگ ہے اور مجھے کام بھی زیادہ ہے اس لیے ذرا جلدی جانا چاہتا ہوں"۔ میر صاحب بولے" تو ہاں تمھارے والد مجھ سے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ قوام نہ کھایا کرو، نزلہ کی شکایت ہو جاسے گی، لیکن میں نے نہ سنا، اب ان کا کہنا سامنے آیا تو مجبوراً ترک کرنا پڑا۔ اس لیے میاں قوام تو تم لانا نہیں، کیونکہ میں بھی استعمال نہیں کرتا اور تمھاری چچی بھی پسند نہیں کرتیں، پتی کھاتی ہیں اور وہ بھی بغیر خوشبو کی اور یہ عادت ان کو شروع ہی سے ہے، یہی وجہ ہے انھیں آجتک کبھی نزلہ زکام کی شکایت نہیں ہوئی اور میں آئے دن کا روگی ہو گیا ہوں سو اس کی ضرورت نہیں ہے لیکن میرا ایک پیغام پہونچانا ہے تم نے غالباً وکٹوریہ گنج کا پل تو دیکھا ہوگا، وہاں سے مشرق کی جانب جو سڑک آغا میر کی سرائے کو گئی ہے اس پر سو قدم چلنے کے بعد داہنے ہاتھ کو ایک گلی ملتی ہے، سامنے نیم کا درخت ہے، اس کے نیچے پانی کا نل لگا ہے اور بائیں طرف ایک بلند پختہ مکان لالہ کشوری مل کی حویلی کے نام سے مشہور ہے، اس گلی میں مڑ جانا بیس قدم کے بعد ہی تمھیں ایک پھاٹک ملے گا، وہاں کسی سے پوچھ لینا کہ سید مبارک حسین صاحب کہاں رہتے ہیں، مشہور آدمی ہیں محلے کا ہر شخص انھیں جانتا ہے کیونکہ انکے والد کا بڑا اچھا زمانہ تھا اور نخاس کے تمام مکانات انھیں کے قبضہ میں تھے، ڈیوڑھی پر ہاتھی گھوڑے،

وقت موجود رہتے تھے، بڑے بڑے رئیسوں سے ملاقات تھی دربار سرکار میں ان کو خاصہ اقتدار حاصل تھا، لیکن پھر جو تباہی آنی شروع ہوئی تو ساری ملکیت ہاتھ سے نکل گئی اور وہ گھر ایسا بگڑ گیا جیسے آندھی نے صاف کر دیا ہو، سید مبارک حسین کے بیٹے ہیں....."

میں پھر گھبرا کر بول اٹھا کہ :-

"ہاں تو ان سے مل کر کیا عرض کروں"۔ اور یہ کہہ کر میں نے گھڑی دیکھی کہ اب بھی وہ میرے اضطراب کو محسوس کر لیں، لیکن ان کے دماغ میں اس ادراک کی قوت ہی موجود نہ تھی میرے شانہ پر انکا ہاتھ رکھا ہوا تھا اور میں انکی اس شفقت سے بیزار و متنفر تھا۔

میر صاحب نے مطلقاً اس کو محسوس نہیں کیا اور برابر اسی طرح نہایت سنجیدگی و متانت کے ساتھ اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا کہ" ہاں وہ ملیں تو ان سے کہدینا اور اس طرح کہنا گویا میں کہہ رہا ہوں کہ"۔ میاں تمھارے باپ تو مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے، کبھی پہونچ جاتا تھا تو ہفتوں آنے نہ دیتے تھے رات رات بھر باہر میرے ہی پاس دیوانخانہ میں بیٹھے رہتے تھے، تمھاری ماں بھی بڑا اکرام فرماتی تھیں، خاص اہتمام سے میرے کھانے کا انتظام کرتیں اور گھڑی گھڑی کنیز کو بھیج کر دریافت فرمائیں کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے، اور تمھارے بڑے بھائی بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن تم نے کیوں مجھے بھلا دیا۔ خط کا جواب نہیں، خیریت کی اطلاع نہیں، اگر مجھ سے کوئی قصور ہوا ہے تو اسے معاف کر دو، تم سید ہو، سید زادے ہو اور میں بھی تمھارا نام لیوا ہوں..

میں اس قدر گفتگو سننے کے بعد پھر گھبرایا اور بول اٹھا کہ "بہتر ہے، عرض کر دونگا" اور یہ کہکر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ انھوں نے پھر روک لیا اور بولے کہ ہاں ان سے میرا یہ پیام بھی کہدینا کہ چھ مہینے اس طرف جب سندیلہ میں ملاقات ہوئی تھی تو تم نے وعدہ کیا تھا کہ میر صاحب موسم کی

بیاض بطور یادگار کے بھیجدونگا، میں چاہتا ہوں کہ اسکو اپنے پاس رکھوں"۔ وہ فقرہ ختم
کرنے نہ پائے تھے کہ میں بول اٹھا "بہتر ہے بیاض لیتا آؤنگا" اور فوراً ایک تانگہ کو روکا
جو اتفاق سے اسی وقت نظر آگیا تھا، کیونکہ وقت بہت تنگ ہوگیا تھا، اور گاڑی چھوٹنے میں
صرف پندرہ منٹ باقی تھے، میں سلام کرکے آگے بڑھا اور تانگہ پر بیٹھ کر روانہ ہونا
چاہتا تھا کہ میر صاحب بڑھ کر تانگہ کے پاس آگئے اور اسکے پادان پہ پاؤں رکھ کر
فرمانے لگے کہ "جہانتک ممکن ہو بیاض ضرور لیتے آنا اور مولوی عبدالشکور سے مل کر
یہ کہدینا کہ اب مناظرہ اور جھگڑے کا وقت نہیں ہے، درس تدریس میں وقت بسر کیجئے،
شیعہ سُنّی کے نزاع اعتقادی ہیں اور ہماری معاشرت اور تمدن کو ان سے متاثر نہ ہونا
چاہیئے، رسالہ بازیوں میں تعلقات خراب ہوتے ہیں اور نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ اگر انھوں نے
اپنی ساری عمر کی کاوش کے بعد دو چار شیعوں کو سُنّی بنا بھی لیا تو کیا، جبکہ موجودہ تعداد بھی
سُنّیوں کی قومی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، علاوہ اسکے میں یہ بھی دیکھتا ہوں
کہ شیعوں کے خلاف جو طریق تردید و استدلال وہ اختیار کرتے ہیں اس میں بھی بہت سی
خامیاں ہوتی ہیں اور بحث کے اصول ان سے اکثر و بیشتر ترک ہو جاتے ہیں اسی کے
ساتھ میری طرف سے یہ بھی کہدیجئے گا کہ پہلے خود اپنے مذہب کے عقائد و اصول پر
تنقیدی نگاہ ڈالیے اور جب آپ پوری طور پہ مطمئن ہو جائیں تو پھر شیعوں کی کتابوں
کا غائر مطالعہ کیجئے آپ تحقیقی نقطۂ نظر سے ابھی تک اسی زمانہ میں ہیں جب منصور کے
انا الحق کو نشان کرامت و بزرگی سمجھا جاتا تھا، ضرورت ہے کہ اب اجتہادی رنگ
پیدا کرکے ایک اک مسئلہ پر نگاہ ڈالی جائے غضب خدا کا ابھی تک جمعہ کے خطبہ میں
عثمان ہی کو جامع قرآن کہا جاتا ہے حالانکہ حقیقی معنی میں جمع قرآن عہد رسالت
ہی میں ہو چکا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ سُنیوں کے اس مزعوم کو سامنے رکھ کر لکھنؤ کے بعض
شیعی رسائل انکی دھجیاں اڑا رہے ہیں سو کہدیجئے کہ اس باب وہ مجھ سے خط و کتابت

کریں اگر مناظرہ ہی کرنا ہے، ورنہ بہتر تو یہ ہے کہ وہ اس مشغلہ ہی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں"۔

اب صبر میرے اختیار سے باہر تھا۔ اس لئے میں نے حد درجہ اضطراب کے ساتھ ان کا پاؤں پادان سے ہٹا کر تانگہ والے سے کہا کہ گھوڑے کو بھگائے کیونکہ وقت نہیں ہے اور اسٹیشن پہونچ کر گاڑی پر سوار ہونا ضروری ہے۔ میر صاحب وہیں کھڑے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور میں روانہ ہو گیا لیکن چونکہ اسٹیشن دور تھا اس لئے جس وقت میں وہاں پہونچا تو ریل سیٹی دے چکی تھی اور پلیٹ فارم تک پہونچتے پہونچتے روانہ ہو گئی میرا ملازم پریشان تھا وہ اسباب گاڑی میں رکھ کر میرا انتظار کر رہا تھا اور جب میرے آنے میں بہت دیر ہوئی تو وہ پھر اسباب اتارنا چاہتا تھا، لیکن مجھے پل پر دیکھ کر رک گیا اور جب گاڑی روانہ ہو گئی اور میں نہ پہونچ سکا تو بہت گھبرا گیا میں نے کچھ تو اس خیال سے کہ جانا ضرور تھا اور کچھ اس بنا پر کہ اسباب وغیرہ گاڑی میں رکھ دیا گیا تھا اضطراری طور پر دوڑ کر سوار ہونے کی کوشش کی اور غالباً میں اس میں کامیاب ہو جاتا اگر گارڈ مجھے نہ روک لیتا، لیکن میرا ایک پاؤں گاڑی کے تختے پر پہونچ چکا تھا کہ اس نے میرا بازو پکڑ کر علیحدہ کرنا چاہا اور میں پھسل کر نیچے گر پڑا یہ وقت میرے لئے کس قدر نازک تھا، اس کا اندازہ تو میں اسوقت نہیں کر سکا۔ کیونکہ میں بیہوش ہو گیا تھا، لیکن بعد کو جب میری آنکھ کھلی اور میں نے آپ کو اسپتال میں پایا تو مجھے معلوم ہوا کہ میر صاحب نے میرے اوپر کس قدر ظلم کیا تھا، کیونکہ ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور اب بھی کہ اس واقعہ کو کئی سال گذر چکے ہیں میر صاحب کی یاوہ گوئی کی طرف سے ایک مستقل "عذر لنگ" ہو کر رہ گیا ہوں۔

---

# ٹیلیفون نمبر ۶۷۰

مسٹر زبیدی جب ولایت سے واپس آئے تو اور نفتے تو خیر جلد ہرن ہو گئے لیکن یہ یقین ان کے دل سے کسی طرح محو نہ ہوا کہ بیوی نام ہے اس عورت کا جو جلسے میں تقریر کر سکے، ادبیات پر تنقید کی اہلیت رکھتی ہو، نظم و نثر میں مصنفانہ حیثیت کی مالک ہو، رقص کرنے والیوں کی جماعت میں بہترین نیڈل پر انعام حاصل کر سکتی ہو اور اگر کبھی ضرورت ہو تو گرلس اسکول کی معلمہ بھی بن سکے اور ماسٹر ٹیلر بھی۔ یعنی اس سلسلہ میں خیر سے یہی ایک بات ایسی تھی جو ان کی اہلی و معاشرتی زندگی کے لیئے مفید ہو سکتی تھی۔

کامل ایک سال تک انھوں نے مختلف رسالوں اور اخباروں میں اشتہار دیا احباب واعزہ کے ذریعہ سے جستجو کی، مختلف شہروں کی مختلف آزاد سوسائیٹیوں میں خود جا کر اس جنس نایاب کو تلاش کیا۔ جب کہیں جا کر مس لطیفہ سہروردی ان کے ہاتھ آئیں۔

مس سہروردی بمبئی کے اس خاندان کی جوہر تابندہ تھیں جو بہت عرصہ ہوا بسلسلۂ تجارت ایران سے ترک سکونت اختیار کر کے بمبئی آ گیا تھا مغربی تہذیب و معاشرت کے حصول میں جس کی شہرت تقریباً ایک صدی سے قائم تھی۔

مسٹر اشفاق حسین سہروردی مس سہروردی کے والد ہر چند مالی حیثیت سے کوئی مختلف درجہ نہ رکھتے تھے لیکن مغربی تہذیب میں ان کی واقفیت و مہارت اس قدر مشہور تھی کہ کوئی بلند سوسائٹی ایسی نہ تھی جہاں ان کی رسائی نہ ہو اور شاید

ہی کوئی تقریب تہذیب جدید کی ایسی ہوتی ہو جس میں ان سے مشورہ طلب کیا جاتا ہو۔ گورنر کا ڈنر ہو یا کسی آنریبل ممبر کا الوداعی جلسہ اس کا اہتمام انھیں کے سپرد ہوتا تھا اور اس میں کلام نہیں کہ جب وقت وہ اپنی صاحبزادی سہروردی کے ساتھ محفل کے سلیقے و ترتیب میں مصروف ہو جاتے تو خدا جانے کیوں ہر جگہ اور ہر چیز میں آپ ہی آپ ایک خاص قسم کا حسن نظر آنے لگتا۔

مسٹر سہروردی کے متعدد لڑکیاں ہوئیں لیکن سب کی سب جوان ہونے سے پہلے مر گئیں، صرف ایک صاحبزادی مس لطیفہ زندہ ہیں، اور یہ کہنا غالباً خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ شاید ان کی تمام مرنے والی بہنیں اپنے مستقبل کا حسن و شباب انھیں کے سپرد کر گئی تھیں۔

مس لطیفہ کی تعلیم صرف الف۔ اے تک ہوئی تھی لیکن چونکہ ہوئی تھی وہ بالکل مغربی ماحول میں اور اس کے بعد کافی زمانہ انھوں نے یورپ میں بھی لبسر کیا تھا اس لیئے ان کا شمار ان برقپاروں میں سے تھا جو یورپ میں بھی ہمیشہ حلقۂ امراء ہی کے اندر گردش کرتے نظر آتے ہیں اور مشرق میں بھی اندور، رام پور اور کشمیر سے کم کسی جگہ کو اپنی سیر کا جولانگاہ نہیں بناتے۔

یورپ میں مس سہروردی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے تقریباً بین الاقوامی قسم کا حسن ان میں پیدا کر دیا تھا، ان کی اس زندگی سے متعلق تھا جب وہ صرف شوق کی بناء پر آرکسٹرا میں اپنے غیر معمولی جمال اور اپنی سحر آفریں موسیقی کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں، ان کے جوتے کی نوک ایسی سریع و جنبش کے ساتھ تختۂ رقص کو چھوتی تھی جیسے ہرن کے پاؤں چوکڑی بھرنے کے وقت۔ اور جب برقی کی رنگین روشنیاں ان کے قامت خوش اندام پر ڈالی جاتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ یہ تو پرستان کی کوئی مخلوق ہے جو راستہ بھول کر دنیا میں آگئی ہے یا سمندر کی کوئی دیوی جو دنیا والوں کو ڈبو دینے

کے لیے سطح آب پر آگئی ہے۔ اسکے بعد مس سہروردی کی شہرت کا دوسرا دور وہ تھا جب ولایت کی امپیریل فلم کمپنی نے انھیں سینما میں کام کرنے کی دعوت دی اور یہ واقعہ ہے کہ اگر ان کی وجہ سے دو نوجوانوں میں باہم جنگ کی نوبت نہ آجاتی اور اس بدنامی کی بنار پر وہ ہندوستان کی واپسی پر مجبور نہ ہوتیں تو ان کے اسٹار بننے میں چند ہفتوں سے زیادہ کی دیر نہ تھی ـــــ وہ کلبوں اور جلسوں میں بھی شریک ہوتیں، تقریریں کرتیں اور اپنی خطبات کی داد ہر شخص سے حاصل کرتیں، ادبیات کے متعلق غالبًا اس قدر کہدینا کافی ہوگا کہ یورپ کے مشہور رسائل میں ان کی نظمیں اکثر شائع ہوتی تھیں اور افسانہ نویسی میں بھی ان کی ذہانت کافی شہرت حاصل کر چکی تھی۔

مسٹر زیدی کو یہ دولت بے پایاں کس طرح ہاتھ آئی یہ ایک ایسا سوال ہے کہ بعض اوقات خود جناب زیدی کی سمجھ میں بھی نہ آتا اور ان کو اپنی خوش بختی پر خواب کا سا دھوکا ہونے لگتا۔ مسٹر زیدی سویلین افسر تھے ایکہزار سے زاید کا مشاہرہ پاتے تھے، شہر کی تمام بلند سوسائیٹیوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے یہ سب ہی لیکن مس لطیفہ جو اپنے اکتسابات و خصوصیات کے لحاظ سے کسی شاہانہ ہاتھ کی متمنی ہوسکتی تھیں، کس طرح ان سے مالوف ہوگئیں۔ مسٹر زیدی تنہائی میں تو اسکو صرف خدا کی دین سمجھتے تھے، لیکن احباب میں بیٹھ کر اسے وہ اپنے تصرفات حسن و تہذیب سے تعبیر کرتے تھے، کیونکہ واقعی حسین بھی تھے اور حد درجہ شائستہ و خوش اطوار بھی۔

مسٹر قاسم بھائی کی تقریب شادی میں جب اول اول ان دونوں کا تعارف ہوا تو ان میں سے کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ایک وقت وہ آئے گا جب یہ رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوجائیں گے۔

مسٹر زیدی کا بیان ہے کہ سب سے پہلا واقعہ جسے ان کے قلب نے متاثر کیا

مس لطیفہ کی وہ تقریر تھی جو انھوں کے عقدِ ثریا کلب کے عام مجمع میں عورت کے مستقبل پر کی تھی اور مس لطیفہ کا کہنا یہ ہے کہ ان پر سب سے زیادہ اثر جس بات نے کیا تھا کہ جب مسٹر زیدی فینسی ڈرس بال میں بہترین وضع وآرائش کی پارسی خاتون بن کر آئے تو وہ بھی خود بھی نہ سمجھ سکی کہ واقعی یہ کوئی عورت نہیں ہے، بہر حال سبب یہ ہو یا کوئی اور، اس میں شک نہیں کہ ہوا سب کچھ بہت اچانک اور اس قدر جلد کہ تمام شہر حیرت زدہ سا ہوگیا۔

---

عروس نو کا حجاب، نئی جگہ جانے کی جھجھک اجنبیوں میں دفعتاً ہو پہنچ جانے کی شرم، ہفتوں تک گھونگھٹ نہ کھولنا اور سمٹے سمٹائے بیٹھے رہنا ـــــ ان باتوں کا وہاں کیا ذکر تھا۔ اگر کوئی تغیر لطیفہ سہروردی کی زندگی میں ہوا تو صرف اتنا کہ وہ ایک مکان سے اٹھ کر دوسرے مکان میں آگئیں مسٹر زیدی سے ظاہری بے تکلفی پہلے ہی سے تھی اب اخلاقی و معاشرتی یگانگت بھی پیدا ہوگئی اور جب ایک ماہ کے بعد دونوں بنگلور سے ہنی مون کا زمانہ لبسر کر کے پونا میں آئے جو مسٹر زیدی کا مستقر تھا تو دونوں ایسا محسوس کر رہے تھے کہ شاید دونوں کی ملاقات برسوں کی ہے اور جذبات میں کوئی گرمی باقی نہیں رہی۔

لطیفہ سہروردی لاکھ ذہین و طباع سہی مگر اس میں شک نہیں کہ مسٹر زیدی کے بعض خصوصیات سمجھنے میں اس نے غلطی ضرور کی۔ یا یہ کہ خود اس نے اپنی قوت اقتدار کا اندازہ صحیح نہیں کیا، یقیناً وہ حسن و جمال کے لحاظ سے ایک بدلیۂ قدرت تھی، اس میں کلام نہیں کہ تہذیب و تعلیم کی حیثیت سے وہ بہترین نتیجہ تربیت تھی، اور ظاہر ہے کہ اس پر مٹنے اور مٹے رہنے کے لئے اس سے زیادہ زبردست دلیل ایک مرد کے پاس اور کیا ہو سکتی تھی، لیکن وہ شاید اس سے واقف نہ تھی کہ انسان

نہ حسن و جمال کے لیئے بیتاب ہوتا ہے نہ لباس کی آرائش و زیبائش پر مٹتا ہے بلکہ وہ تڑپتا ہے صرف اس لیئے کہ فلاں چیز اسکی نہیں اور جس قدر زیادہ یقین کسی شے کے بعید یا عسیر الحصول ہونے کا ہوتا جاتا ہے اسی قدر اسکی بیتابیاں بڑھتی جاتی ہیں، اس لیئے مشکل ہی سے چار ماہ کا زمانہ گذرا ہوگا۔ کہ مس سہروردی نے اپنی ازدواجی زندگی کی بے نمکی محسوس کرنا شروع کی اور ایک ہلکے قسم کا استغنا دونوں میں پیدا ہوگیا۔ لیکن چونکہ مسٹر زیدی اس قسم کے صاحبوں میں سے تھے جن کو ہر وقت یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ وہ اپنے ہندی الاصل ہونے کا داغ کیونکر مٹائیں، دوسری طرف لطیفہ سہروردی ان عورتوں میں سے تھیں جنھیں اگر شادی سے قبل مس صاحب اور شادی کے بعد میم صاحب نہ کہا جائے تو برہم ہو جاتی ہیں، اس لیئے اگر ادھر زیدی صاحب ایک بہترین صاحب بننے کی ایکٹنگ کر رہے تھے تو دوسری طرف لطیفہ سہروردی بھی لوگوں کی نگاہوں میں اپنے آپ کو بالکل میاری میم صاحب ظاہر کرنا چاہتی تھیں، بنگلے کے اندر تنہائی میں خواہ ایک کو دوسرے سے گفتگو و اختلاط کی نوبت ہفتوں نہ میسر ہو، لیکن کھانے کی میز پر خادموں کو دکھانے کے لیئے ڈرائنگ روم میں ملاقاتیوں کو دھوکا دینے کے لیئے اور موٹر میں شوفر کو جتانے کے لیئے باہم لطف و محبت کا اظہار ضروری تھا۔

ان دونوں کی زندگی کا روزانہ پروگرام یہ تھا:۔

مسٹر زیدی:۔ صبح آٹھ بجے حاضری کے بعد ملاقات کے کمرہ میں آجانا گیارہ بجے کچہری جانا ۵ بجے شام کو واپس آکر چائے پینا اور ٹینس کھیلنے کے لیئے فوراً چلا جانا، رات کو نو بجے واپس آکر کھانا کھانا۔ اور خواب گاہ میں چلا جانا۔

لطیفہ سہروردی:۔ صبح کی حاضری سے فارغ ہو کر سیر و ملاقات کے لیئے

نکل جانا اور ایک بجے واپس آکر چار بجے تک خطوط وغیرہ لکھنا ،

شام کو مسٹر زیدی کی واپسی سے قبل تنہا چائے پی کر عقد ثریا کلب میں جاکر رات کو واپس آنا اور اگر کبھی کوئی محفل رقص و سرود برپا ہوگئی تو صبح کر دینا۔

مختصراً یوں سمجھ لیجئے ان دونوں کی زندگی اس طرح بسر ہوتی تھی کہ جب میاں گھر میں ہوتے تو بیوی گھر سے باہر ہوتیں، اور جب بیوی گھر میں ہوتیں تو میاں موجود نہ ہوتے گویا یہ دونوں قطب نما سوئی کے دو سرے تھے کہ اگر ایک سرا شمال کو ہوگا تو دوسرے کا جنوب کی طرف رہنا لازم ہے۔

مہینوں گذر گئے اور ان دونوں کی زندگی جو بالکل مشین کی طرح تھی بغیر کسی شکوہ و شکایت کے جاری رہی، ایک روز شام کو جب مسٹر زیدی کچہری سے واپس آئے تو انھیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ بیوی گھر ہی میں ہیں اور ابتک باہر نہیں گئیں دریافت سے معلوم ہوا کہ کوئی خاتون جہان آئی ہوئی ہیں، یہ سیدھے اس کمرے کی طرف پہونچے اور دروازے پر دستک دیکر اندر آنے کی اجازت طلب کی، تھوڑی دیر میں لطیفہ سہروردی نے اٹھ کر خود دروازہ کھولا، اور جب مسٹر زیدی اندر پہونچے تو "مس بلقیس" سے تعارف کرایا گیا جو کراچی سے تشریف لائی تھیں۔

بلقیس، کراچی کے ایک مشہور تاجر کی صاحبزادی تھیں اور مس سہروردی کے ساتھ ہی تعلیم پاتی تھیں اتفاق سے جب وہ بمبئی آئیں اور انھیں مس سہروردی کی شادی کا حال معلوم ہوا تو ملنے چلی آئیں۔

رسم تعارف ادا ہوگئی، تھوڑی دیر تک پورے لطف کے ساتھ آپس میں گفتگو ہوتی رہی اور جس وقت مسٹر زیدی وہاں سے اٹھ کر واپس آئے تو ان کے دماغ میں لطیفہ سہروردی اور بلقیس دونوں کی صورتیں قائم تھیں لیکن اس طرح کہ ایک میں

ان کو بہت سے نقائص نظر آرہے تھے اور دوسری میں سیکڑوں محاسن۔

یہ بالکل واقعہ ہے کہ شکل وصورت کے لحاظ سے لطیفہ سہروردی کو بلقیس پر کسی طرح ترجیح نہیں دیجا سکتی تھی لیکن اطوار کے لحاظ سے وہ بلقیس سے بدرجہا بلند تھی، مگر اس کا کیا علاج کہ لطیفہ سہروردی مسٹر زیدی کی بیوی تھیں اور بلقیس ان کی کیا کسی کی بھی بیوی ابھی تک نہیں بنی تھی۔

جب تک مسٹر زیدی کچہری سے واپس نہ آئے تھے وہ لطیفہ سہروردی کے یہاں قیام کرنے سے انکار کر رہی تھی، لیکن جب اس نے ایک بار زیدیؔ اور ان کی نگاہوں کو دیکھ لیا، تو خود ہی قیام پر راضی ہوگئی اور چار دن کے اندر وہ زیدیؔ سے اس قدر بے تکلف ہوگئی، گویا برسوں کی ملاقات تھی، اول اول تو لطیفہ کو یہ خیال ہوا کہ جب زیدیؔ گھر میں ہوتے ہیں تو بلقیس کیوں کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے اس کے ساتھ باہر جانے سے انکار کر دیتی ہے اور جب زیدی کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ بلقیس باہر جانے والی نہیں تو کیوں وہ شام کا ٹینس اور کلب غائب کر دیتے ہیں لیکن آخرکار ایک دن یہ راز کھل کر رہا اور زندگی میں سب سے پہلی مرتبہ لطیفہ سہروردی میں وہ تمام نسائی جذبات رشک رونما ہوئے جو ایک بار ابھر آنے کے بعد مشکل ہی سے بغیر انتقام کے آسودہ ہوسکتے ہیں۔

ایک دن شام کو جب وہ کلب سے بالکل غیر متوقع طور پر گھر واپس آئی اور بالائی منزل کا دریچہ کھول کر خانہ باغ میں نگاہ ڈالی تو اس نے بعید ترین گوشہ میں ایک بنچ پر ان دونوں کو اس طرح مصروف اختلاط دیکھا کہ مشکل سے وہ اپنی نگاہوں پر اعتبار کرسکتی تھی۔ بلقیسؔ زیدیؔ کی آغوش میں تھی اور زیدیؔ کے لب اسکے لبوں پر، غیظ وغضب کے عالم میں اس نے ارادہ کیا کہ اسی حالت میں ان کو جاکر گرفتار کرے لیکن بدنامی کے خیال سے رک گئی اور دیر تک مضطربانہ ادھر

اُدھر ٹہلتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیئے اور آخر کار ایک فیصلہ کرکے آہستہ آہستہ نیچے گئی اور وہاں سے کیمرا لاکر اس نے وہیں دریچے سے دونوں کی تصویریں لے لیں اور پھر نیچے آکر اپنے خادم رمضانی کو بلایا اور دیر تک سمجھاتی رہی۔ اس کے بعد جب وہ اپنے کمرہ میں پہونچی اور تھوڑی دیر بعد بلقیس بھی وہاں آئی تو اسے بالکل سکون تھا اور اس کی طرف سے کوئی بات ایسی ظاہر نہیں ہوئی جس سے بلقیس یا زیدی کو کسی قسم کا شبہہ پیدا ہوتا۔

---

اس واقعہ کے تیسرے دن صبح مسٹر زیدی اپنے آفس کے کمرے میں بیٹھے ہوئے ڈاک دیکھ رہے تھے کہ رمضانی آیا اور ایک لفافہ ہاتھ میں دیکر بولا۔

"حضور مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔"

مسٹر زیدی:۔ "یہ لفافہ تو میم صاحب کے نام کا ہے۔"

رمضانی:۔ "ہاں ہے تو میم صاحب کا لیکن سرکار اسے کھول کر ضرور پڑھیں اسی طرح کے لفافے کئی دن سے ایک آدمی دستی دے جاتا ہے اور ہر دفعہ جب میں میم صاحب کو دیتا ہوں تو کہتی ہیں کہ دیکھو کسی سے ذکر نہ کرنا، یہی آدمی ایک دن، جب حضور کچہری میں تھے تین چار کاغذ کے بکس بھی لایا تھا اور چھپا کر میم صاحب کو دے گیا تھا۔ میں نے بارہا ارادہ کیا کہ حضور سے ذکر کردوں لیکن میم صاحب کے ڈر سے ہمت نہ ہوئی۔ اب چاہے مجھے نکالیں یا رکھیں میں نے سارا ماجرہ حضور سے کہدیا ہے۔"

زیدی یہ داستان سن رہا تھا اور حیران تھا، وہ کبھی لطیفہ کی طرف سے اس قسم کی بیوفائی کی توقع نہ رکھتا تھا، یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ آزاد ہے لیکن اخلاقی کمزوری کا وہم و گمان بھی اس کو نہ ہوا تھا، وہ نہ صرف حیران تھا بلکہ غصہ کی وجہ سے اس کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا، اب اس نے بالکل پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ اسے لطیفہ سے واقعی

شدید محبت ہے اور کسی طرح وہ اپنے اس حق کو چھنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

رمضانی کے چلے جانے کے بعد اس نے احتیاط سے لفافہ کھولا جس کے اندر ٹائپ کیا ہوا ایک خط رکھا ہوا تھا، اسکا مضمون یہ تھا:۔

آرام جان ــــــــــ!

میں سنا کرتا تھا کہ دیویاں ظالم ہوتی ہیں، لیکن تم تو ایسی نہیں ہو، تمہارا التفات تمہارا لطف و کرم جس وقت یاد کرتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ ان کے مقابلہ میں میرا جذبۂ پرستش کس قدر کم وزن نظر آتا ہے۔ اب سے اس دن قبل جب میری نگاہ کا اولین ہدیۂ شوق تم نے اپنی آنکھوں کے تبسم سے قبول کیا تو میں نے جانا کہ ایک انسان کے لیئے فردوس صرف یہی ہو سکتی ہے لیکن جب اس کے بعد پے در پے حجابات اٹھتے گئے اور تمھاری محبت نے اپنی بارش کرم سے مجھے بالکل شرابور کر کے رکھ دیا تو معلوم ہوا کہ:۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں

میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں تمہارا شکریہ ادا کروں میرے پاس سوائے جان کے کوئی ہدیہ نہیں کہ اسے پیش کروں، سو بیس دفعہ کہہ چکا کہ اس سے زیادہ لطف و عنایت کی برداشت مجھ میں نہیں رحم کرو اور جان لے کر اس جھگڑے کو ختم کرو، لیکن تم نے ہمیشہ مسکرا کر ٹال دیا۔ کیا کروں حیران ہوں، نہ کسی کام میں جی لگتا ہے نہ رات کو آنکھ بند ہوتی ہے، ہر وقت تم ہو، تمھاری تصویر ہے اور ہر وقت

اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

خدا کرے تم آگ لگانے والی خوش رہو۔

آج بھی بارہ بجے ٹیلی فون پر آنے کی زحمت گوارا کیجئے اگر فرصت ہو۔

صرف تمھارا ——— جمیل

اس خط کو پڑھ کر زیدی کی جو کیفیت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے لیکن چونکہ تہذیب جدید کے زیر اثر اسکو تربیت ہوئی تھی اس لئے وہ غیرت تو تھی نہیں کہ فوراً بیوی کا جا کر گلا کاٹ ڈالتا اور جمیل کو ڈھونڈھ کر اسکے پیٹ میں چھری بھونک دیتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کر سکتا تھا کہ اسے طلاق دیدے اور اس خیال کے آتے ہی اسے ایک گونہ سکون بھی ہوا کیونکہ اس صورت میں وہ بلقیس سے شادی کرنے کے لئے آزاد بھی ہو جائے گا ——— چنانچہ وہ اس کے لئے آمادہ ہو کر جانا ہی چاہتا تھا کہ رمضانی پھر گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ حضور نے وہ خط پھاڑا تو نہیں۔ میم صاحب کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ وہ آدمی خط دے گیا ہے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا ہاں دے گیا ہے اور میں ابھی لاتا ہوں، کام کی وجہ سے خیال نہیں رہا۔ لائیے وہ خط مجھے دیدیجئے میں لفافہ میں بند کر کے انھیں دے دوں۔

پہلے تو زیدی کا خیال تھا کہ خود جا کر وہ اس خط کو دے گا اور اسی وقت آئندہ کا فیصلہ کر دے گا لیکن رمضانی کی یہ گفتگو سن کر اس نے تدبیر بدل دی اور سوچا کہ زیادہ سے زیادہ مناسب یہی ہے کہ ٹیلی فون کی گفتگو بھی سن لے، ممکن ہے کوئی اور راز ظاہر ہو یہ سوچ کر خط اس نے رمضانی کے حوالہ کیا، اور خود لطیفہ کے نام ایک خط لکھ کر کہ میں ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں شام تک آسکوں گا، چلا گیا۔

---

ٹھیک بارہ کے ہندسے پر کلاک کی دونوں سوئیاں پہونچی ہی تھیں کہ لطیفہ

ٹیلیفون پر گئی اور ایکسچینج سے ۶۷۰ نمبر ملوایا گفتگو کرنے لگی:۔

ہاں ہاں ... ... ... میں ہوں ... ... مجھے کیا کم انتظار ہے ... ...

ضرور ... ... ... شام کو ... ... کس وقت ... ... ...

جب آپ فرمائیں ... ... ... ... ... ... ... ... ... ...

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ زیدی بپھرے ہوئے شیر کی طرح پردے کی اوٹ سے باہر آیا اور لطیفہ کے سامنے آکر بولا:۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کس سے راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں!"۔

لطیفہ نے مطلقاً کوئی پروا نہ زیدی کے آنے کی کی، اور نہ اسکے استفسار کی، اس نے اسی طرح ٹیلیفون پر اپنی گفتگو کو جاری رکھا۔

"ہاں آپ کے تحائف ملے۔ کس قدر پاکیزہ تھے .... خوب میں شرمندہ کر رہی ہوں۔ جی نہیں۔ معاف فرمائیے۔ اس سے زیادہ تکلیف اٹھانے کی اجازت نہیں"۔

زیدی اس سے زیادہ اپنی توہین برداشت نہ کر سکا اور غصہ میں بڑھ کر ٹیلیفون اسکے ہاتھ سے چھین لیا اور بولا کہ "میں حکم دیتا ہوں کہ مجھے اسی وقت اس شخص کا نام بتاؤ جس سے تم گفتگو کر رہی تھیں اور جواب دو کہ تم نے کیوں غیر مرد سے اختلاط پیدا کیا"۔

لطیفہ زیدی کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی کہ "میں تمھارا حکم ماننے سے انکار کرتی ہوں اور بتانا چاہتی ہوں کہ میں بھی آزاد ہوں جس سے چاہوں اختلاط کر سکتی ہوں"۔

زیدی:۔ "بہتر ہے آپ اپنے کو بالکل آزاد سمجھیں اور اپنے گھر تشریف لے جائیں"۔

لطیفہ۔ "شکریہ لیکن مہربانی کر کے ایک تحریر مجھے دیدیجئے کہ پانسو روپے ماہوار میرے مصارف کے لئے آپ ماہ بماہ ادا کرتے رہیں گے"۔

زیدی:۔ "خوب یہ بدوضعی اور اس پر یہ مطالبہ! قانوناً شرعاً ایک شوہر بد اطوار

بیوی کے مصارف کا کفیل نہیں قرار دیا جا سکتا۔"

لطیفہ:۔ اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو عدالت اسکا فیصلہ کریگی اور فیصلہ یقیناً میرے حق میں ہوگا، کیونکہ آپ کے پاس کوئی ثبوت میری بد اطواری کا موجود نہیں ہے۔"

زیدی نے غصہ سے آگے بڑھ کر وہ خط اٹھایا جو سامنے ہی میز پر رکھا تھا، اور بولا کہ "کیا اس سے زیادہ ثبوت تمھاری غداری کا کوئی اور ہو سکتا ہے۔"

لطیفہ نے آہستگی سے میز کی دراز کھولی اور ایک تصویر سامنے رکھ کر بولی کہ "کیا اس سے زیادہ ثبوت تمھاری بد چلنی اور پاجی پن کا کوئی اور ہو سکتا ہے۔"

جس وقت زیدی نے دیکھا کہ یہ تصویر اسی کی تھی جس میں وہ بلقیس کے ساتھ ہم آغوش نظر آرہا تھا تو اسکے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور سر سے پاؤں تک عرق عرق ہو گیا۔

---

بلقیس تو اس واقعے کے بعد ہی پونا سے غائب ہو گئی اور اس طرح کہ یہ پتہ بھی نہ چلا کہ کہاں اور کب گئی، لیکن زیدی بدستور اپنی شرمندگیوں کے ساتھ وہیں موجود رہا بعد کو جب اسے معلوم ہوا کہ جمیل اور اسکا خط یہ سب فرضی باتیں تھیں اور ٹیلیفون نمبر ۶۷۰ زنانہ اسکول کا تھا تو زیدی کی خفت کا یہ عالم ہوا کہ اس نے کچھ دنوں لطیفہ کو اپنی صورت تک نہ دکھائی ــــ اور جب کبھی انتہائی لطف کی حالت میں لطیفہ اسکے چھیڑنے کے لئے ٹیلیفون نمبر ۶۷۰ کا نام لے دیتی تو وہ جھینپ کر رہ جاتا۔

---

# انتظام علی صاحب

کس ماحول میں پیدا ہوئے، کس گردو پیش میں پرورش پائی، کس سوسائٹی کے زیرِ اثر ان کی تعلیم ہوئی اور ان کے خیالات و جذبات میں امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ کیا تغیر ہوا نہ ان باتوں کا ہمیں علم، نہ جاننے کی ضرورت۔ ہم تو صرف اس قدر جانتے ہیں، اور افسانہ کے لیئے اتنا جاننا کافی ہے کہ معاشیات و اقتصادیات میں انھوں نے ایم۔ اے کیا۔ اور اس شان کے ساتھ کہ جب وہاں سے نکلے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی سودیشی بھنڈار کے اشتہار ہیں یا کارخانۂ پارچہ بافی کے ٹریڈ مارک۔ یعنی تکمیل معاشیات کے ساتھ ساتھ سیاسیات کا مطالعہ بھی آپ نے جس نقطۂ نظر سے کیا وہ بھی ویسا ہی ویران سنسان اور بے آب و رنگ تھا۔

یوں تو فنون لطیفہ کی طرف توجہ کرنے کی ذلت کبھی گوارا نہیں کی۔ لیکن سنا ہے کہ اول اول اتنی بیگانگی بھی نہ تھی۔ چنانچہ موسیقی کے ذکر کے سلسلہ میں آپ ہمیشہ اس موذن کا ذکر ضرور کر دیتے تھے جو محلہ کی مسجد میں اذان دیتا تھا۔ اور فرماتے۔ "اچھے اتار چڑھاؤ"۔ کے ساتھ اذان دیتا ہے"۔ —— اتار چڑھاؤ —— ان کے نزدیک موسیقی کی گویا ایسی نازک و دقیق اصطلاح تھی کہ وہ اسکے علم پر جتنا بھی فخر کرتے کم تھا۔ شعر و شاعری کے سلسلہ میں جب وہ کبھی اظہار خیال فرماتے تو شاید اس لئے کہ ساری دنیا غالب کی تعریف کرتی ہے وہ بھی ہمیشہ غالب ہی سے ابتدا کرتے اور اسی پر انتہا۔ اور مجھے خود تو تجربہ نہیں، لیکن دوسروں سے

انتظام علی صاحب

معلوم ہوا کہ جب کبھی رات کی تنہائی میں جذبات کا جوش وخروش ناقابل ضبط ہوجاتا تو غالب کا یہ مصرعہ دیر تک گنگنایا کرتے تاکہ،

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب

پورا شعر وہ بھی نہیں، کیونکہ ان اقتصادی توجہ کا مستحق تو "چار گرہ کپڑا" ہی ہوسکتا تھا۔

بہر حال اوائل عمر میں وہ کیا تھے اور کیا نہیں اس سے بحث کرنا فضول ہے ہمیں تو فراغت تعلیم کے بعد ان کی زندگی کے صرف اس پہلو سے بحث کرنا ہے جسے ازدواجی یا اہلی پہلو سے موسوم کیا جاتا ہے۔

پھر قدرت کے کھیل حیاتیات (Biology) ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں کبھی کبھی کھلنڈرے پن سے کام لیتی ہے چنانچہ انتظام علی کا نکاح بھی انھیں کھیلوں میں سے ایک کھیل تھا کہ بیوی ملی انھیں وہ جیسے کوئی دور کی نسبت بھی ان کے ذوق سے نہ تھی۔ یعنی جس چیز سے وہ جتنا بھاگتے تھے، اسی قدر وہ اس جانب ملتفت تھی۔ اور ان کو جس طرف جتنا میلان تھا اتنا ہی ادھر تنفر تھا۔

یہ اگر موسیقی کے نام سے پناہ مانگتے تھے تو اس کا یہ عالم تھا کہ دیگچی بھو نتے وقت بھی گنگنانا بند نہ ہوتا۔ یہ اگر پیسہ کی کیلیں خریدتے وقت پہلے ایک من لوہے کا بھاؤ دریافت کرتے، تو اس طرف یہ کیفیت تھی کہ ایک من آٹا تولنے پر اگر بیس سیر بھی کم نکلے تو "اونھ" کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا۔

شعر وشاعری میں انھیں لے دے کر صرف ایک شعر "چار گرہ کپڑے" والا خدا جانے کس طرح یاد رہ گیا تھا۔ ادر اس طرف یہ کیفیت تھی کہ ہر دو جملوں کے بعد ایک شعر پڑھ دینا ضروری۔

انتظام علی نے اپنی عمر میں شاید ہی کوئی مضمون لٹریچر کا کسی موضوع پر پڑھا ہو۔ اور ادھر ادبیت کا وہ زور کہ جب تک رات کو دو تین رسالے نگاہ سے نہ گزر جائیں نیند آنا دشوار۔

وہ کس قدر بے چین رہتی تھی کہ اپنے لکھے ہوئے مضامین انھیں سنائے اور داد لے لیکن اس طرف یہ احتراز کہ کھانا کھایا اور فوراً باہر کہ مبادا کوئی ذکر ایسا چھڑ جائے۔

ان حضرت کے نزدیک شادی کا مقصود سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ نظام تمدن میں مفید حصہ لینے کے لئے مرد کو ایک رفیق کار میسر آجاتا ہے اور بیگم کا نظریہ یہ تھا کہ ازدواج نام ہے ایک ایسے شخص کی فراہمی کا جو روپیہ کے ساتھ اپنا دل و دماغ بھی غلامی کے لئے پیش کر دے۔

الغرض یہ تھا دونوں کا رنگ طبیعت جسے قدرت نے ملاکر اپنی تفریح کا سامان بہم پہونچایا تھا۔ شادی کے چند دن بعد تک تو ان دونوں میں سے کسی کو پتہ نہ چلا کہ کعبہ کی طرف کون جا رہا ہے اور ترکستان کی راہ کس نے اختیار کی ہے لیکن جب چند دن کے بعد اجنبیت میں کچھ کمی ہوئی اور نسبتاً بے تکلفی پیدا ہو چکی تو سب سے پہلے بیگم ہی کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ دیکھوں ان میں کچھ ذوق شاعری بھی پایا جاتا ہے یا نہیں۔؟

ہر چند وہ شادی سے قبل ہی ان کا غیر شاعرانہ نام سنکر کھٹک گئی تھی کہ ایسا پیغمبروں کا سا نام رکھنے والا آدمی کیا ادبی ذوق رکھ سکتا ہے لیکن اس نے یہ سمجھ کر تسکین کر لی ممکن ہے کوئی اچھا تخلص رکھ کر اسکی تلافی کر لی گئی ہو۔

اس جستجو میں سب سے پہلے بیگم نے انتظام علی صاحب کی لائبریری اور انکے کاغذات کا جائزہ لینا شروع کیا، لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے

دیکھا کہ الماری میں کوئی ایک کتاب بھی اُردو فارسی کی نہیں ہے۔ اور انگریزی میں بھی صرف وہی کتابیں ہیں جن کا تعلق تجارت، زراعت، مالیات، میزانیات، سرمایہ، دولت اور مزدوری وغیرہ سے ہے۔ وہ حیران تھی کہ یہ کوئی آدمی ہے یا ٹھیکہ دار کہ سوائے اس قسم کی کتابوں کے اور کوئی کتاب ہی نظر نہیں آتی۔ کاغذات الٹ پلٹ کے دیکھے لیکن وہاں بھی کوئی جھلک امید کی اسے نظر نہ آئی۔

ایک دن انتظام علی صاحب کالج سے (جہاں وہ لکچرار کی خدمت پر مامور تھے) بہت خوش خوش واپس آئے، کیونکہ زراعت پیشہ طبقہ کے متعلق جو مقالہ انھوں نے تیار کیا تھا۔ اسکی خوبی کا حکومت نے اعتراف کیا اور خود گورنر نے ملاقات کے لیئے ان کو طلب کیا تھا، یہ گھر میں آئے تو سخت بیتاب تھے کہ کوئی ان سے پوچھتا اور وہ بتاتے کہ انکی محنت کی کیا داد ملی ہے، اِدھر بیوی ان کو غیر معمولی طور پر مسرور دیکھ کر یہ سمجھی کہ آج میاں غالباً شاعری کی جون میں آئے ہوئے ہیں۔ اور چھوٹتے ہی یہ سوال کر بیٹھی کہ "آج آپ بہت خوش ہیں، کیا کوئی اچھا شعر قلم سے نکل گیا ہے"۔

انتظام علی صاحب جن پر اسوقت نشۂ اقتصادیات پوری طرح مسلط تھا، شعر کا نام سن کر اس طرح چونک پڑے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ چونک کر بولے۔ "شعر! خوب کہی، شعر و شاعری بھی ایسی چیز ہے۔ جس پر کوئی انسان توجہ کرے"۔

یہ سن کر بیگم صاحب کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ لیکن بہت ضبط سے کام لیا اور بولیں کہ "یہ جو تمام دنیا میں ہزاروں میں لاکھوں شاعر پیدا ہوئے، سب بیکار تھے۔ اور زمانہ بھی نہایت احمق تھا کہ ان کے کلام کی قدر کی"۔

انتظام علی۔ یہ بھی کوئی دلیل ہوئی؟ محض کسی چیز کا پیدا ہو جانا اسکے مفید ہونے کا ثبوت نہیں۔ مچھروں، مکھیوں کی پیداوار شاعروں سے زیادہ ہے لیکن بتایئے کہ سوائے ملیریا اور بیماریاں پھیلانے کے ان سے کیا فائدہ ہے۔ رہا قدر کرنا، سو ان کی قدر

کرنے والے بھی وہی ہیں جو شاعر ہوتے ہوتے رہ گئے۔"

بیگم۔ (بگڑ کر) "جب کوئی کام کسی سے نہ بن پڑے تو یوں ہی کہنا چاہیئے۔ سچ ہے جب آنگن ہی ٹیڑھا ہو تو ناچنے والا کیا کرسکتا ہے؟"۔

انتظام علی:۔ "تم بھی کیا باتیں کر رہی ہو۔ شعر اور کسی سے بن نہ پڑے۔ یہ بھی گویا، ریاضی کا کوئی مسئلہ ہوگیا، علم الکیمیا کا کوئی معمہ ٹھہرا کہ ہر شخص اسکے سمجھنے یا حل کرنے کا اہل نہیں۔ چند الفاظ ایک خاص ترتیب سے جمع کردئے اور کوئی مہمل سی بات کہہ دی شعر ہوگیا۔"

بیگم:۔ "شعر کی یہ تعریف آج ہی معلوم ہوئی۔ میں تو سنا کرتی تھی کہ شعر فنون لطیفہ میں داخل ہے اور وہی شخص کہہ سکتا ہے جو قدرت سے خاص دماغ لیکر آیا ہو۔ اور جذبات انسانی کے اظہار پر پوری قدرت رکھتا ہو۔"

انتظام علی:۔ "شعر فنون لطیفہ میں داخل ہو یا فنون کثیفہ میں، اس سے بحث نہیں، مطلب صرف یہ ہے کہ اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہونچتا ہے۔ اور اس سے سوائے نقصان کے اور کیا حاصل ہے۔ حالات کا اقتضا تو یہ ہے کہ پیوند لگا لگا کر کپڑے کا استعمال کیا جائے۔ اور ادھر جب دیکھئے دامن کا چاک گریباں کے چاک سے ملا ہوا ہے کوئی پوچھے کہ ان دھجیوں کو کبتک کوئی رفو کرے گا۔ اور ان کی اس غیر مہذب و مسرف تعلیم کا اثر ملک پر کیا ہوگا۔"

بیوی۔ (ہنس کر) "ماشاء اللہ خوب سمجھے ہیں۔ اس سمجھ کی داد دینا چاہیئے۔ کہاں شاعر کا چاک گریباں اور کجا آپ کا یہ اقتصادی رفو۔ جی چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر نکلجائے۔"

انتظام علی:۔ "کس کے ؟"۔

بیوی۔ (غصہ سے) "اپنے اور کس کے"۔

انتظام علی:۔ "غنیمت ہے، میں تو کچھ اور سمجھا تھا۔"

یہ تھی سب سے پہلی گفتگو شاعری کے متعلق جو میاں بیوی میں ہوئی اور جس نے ہمیشہ کے لئے بیوی کو شوہر کی طرف سے مایوس کر دیا۔

انتظام علی، شاعر نہ سہی لیکن بہر حال ایک فاضل شخص تھے، نفسیات انسانی سے بے خبر نہ تھے انھیں معلوم تھا کہ بیوی کا کیا رنگ ہے۔ اور اچھی طرح واقف تھے کہ اس لحاظ سے وہ کوئی دلجوئی اسکی نہ کر سکتے تھے۔ اسکے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بیوی بہت محبت کرنے والی ہے۔ نہایت مطیع ووفاشعار ہے اور ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ اس کے ذوق کی رعایت کر سکیں۔

اس گفتگو کے چند دن بعد شام کو کامل ایک گھنٹہ تنہائی میں بیٹھ کر انھوں نے اس مسئلہ پر غور کیا اور سوچتے رہے کہ اگر کبھی کبھی وہ اپنی طبیعت کے خلاف محض بیوی کو خوش کرنے کے لئے شعروادب کے ذکر کو کبھی گوارا کر لیا کریں تو کیا مضائقہ ہے۔ کیونکہ یوں بھی اصولاً جب گھر میں کسی چیز کی "طلب" ناگزیر ہو جائے تو اس کی "فراہمی" ضروری ہے۔

انھوں نے فوراً اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے بازار سے دیوان غالب کا نہایت مکلف اڈیشن منگوایا۔ اور سب سے پہلے وہ غزل نکالی۔ جس کا ایک شعر انھیں عرصہ سے یاد تھا

انھوں نے ہر ہر شعر کو بار بار پڑھا اور واقعہ یہ ہے کہ انھیں ہر مرتبہ اپنے ذہن کی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑا۔ نہ ان کی سمجھ میں آیا کہ "در و دیوار سے بیابان کیونکر ٹپک سکتا ہے" نہ "جوہر آئینہ" کا "مژگاں" بننا ان کی عقل میں آیا نہ "عید نظارہ" کا صحیح مفہوم ان کو معلوم ہو سکا۔ اور نہ "داغ تمنائے نشاط" کا مطلب ان کے ذہن نشین ہوا۔ البتہ جب وہ مقطع پر پہونچے تو دماغ کی تشویش کم ہوئی اور دیر تک اس کو پڑھتے رہے:۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

سوچتے سوچتے انھوں نے کتاب کو ایک طرف رکھ دیا اور کاغذ پنسل لیکر بیٹھ گئے۔ کبھی وہ پنسل کی نوک کو زبان پر رکھ کر اور کبھی ایک لفظ لکھ کر دیر تک سوچتے کبھی چھت کو دیکھ کر انگلیوں کو میز پر ہارمونیم کی طرح دیر تک چلاتے رہتے۔ اور پنسل سے کوئی نشان کاغذ پر بنا دیتے کبھی سر پکڑ بیٹھ جاتے، کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتے، الغرض پورے ایک گھنٹہ تک اسی طرح کی عجیب و غریب حرکتیں کرنے کے بعد ان کے چہرہ پر آثار مسرت ظاہر ہوئے۔ اور جو کچھ انھوں نے لکھا تھا۔ اسے ایک کاغذ پر صاف کیا۔ اور احتیاط سے جیب میں رکھ کر اس شان سے صحن میں چہل قدمی فرمانے لگے گویا نپولین کو کوئی تدبیر دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کی سوجھ گئی ہے۔

شام کو گھر میں گئے تو بہت خوش خوش تھے، بیوی بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی تھیں لیکن کسی خیال میں محو تھیں۔ انھوں نے جاتے ہی دیوان غالب پیش کرتے ہوئے کہا کہ" بیگم آج میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ شاعری نہ ایسی بری چیز ہے نہ ایسی مشکل۔ جرمنی کا چھپا ہوا نیا اڈیشن غالب کا مجھے پسند آیا۔ اسے تم اپنی لائبریری میں رکھ لو۔"

بیوی نے مسکراتے ہوئے کتاب ہاتھ میں لے لی اور دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بولی کہ" واقعی نہایت پاکیزہ چھپا ہے۔ شکریہ۔"

انتظام علی:۔ "غالب اچھا شاعر تھا"

بیوی:۔ "ہوگا مجھے کیا معلوم؟۔"

انتظام علی:۔ (حیرت سے) "ہوگا۔ کیوں کیا شاعری سے تمھیں دلچسپی نہیں رہی۔"

بیوی:۔ "جی نہیں۔"

انتظام علی:" خوب، یہ عجیب بات ہے کہ جب میں نے غزل کہنا شروع کی تو تمھیں شاعری سے دلچسپی جاتی رہی اچھی ضد ہے تو (جیب سے کاغذ نکالتے ہوئے) اتنی محنت میں نے یوں ہی فضول کی۔"

بیوی۔ (حیرت سے) "آپ اور غزل"!

انتظام علی:" کیا تم مذاق سمجھتی ہو۔ یہ دیکھو۔ میری پہلی کوشش ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ناکامیاب نہیں رہی۔ پہلا شعر۔ پہلے شعر کو مطلع ہی کہتے ہیں نا۔ اچھا مطلع سنو

ہم نہیں وہ تجھیں آتا ہے پریشاں ہونا ۔ مفت میں بیٹھے بٹھائے یونہی حیراں ہونا

بیوی۔ (مسکراکر) "سبحان اللہ کیا کہنا۔"

انتظام علی۔ (خوش ہوکر) "اچھا دوسرا شعر سنو۔ اسی سلسلہ کا ہے:۔

کفِ افسوس کا ملنا کسے کہتے ہیں جناب
نام کس چیز کا ہے سر بگریباں ہونا

بیوی:" تو یوں کہئے، کہ آپ نے قطعہ تحریر فرمایا ہے۔"

انتظام علی۔ (حیرت سے) "اسے قطعہ کہتے ہیں۔ اچھا آج قطعہ ہی سُن لو، کل غزل بھی سن لینا۔ تیسرا شعر سنو۔ اس میں میرا نام بھی ہے۔

کیوں وہاں تم گئے بیکار کو اے انتظام
کس نے تم سے کہا وہاں جا کر پابجولاں ہونا

بیوی جو اسوقت تک اپنی ہنسی کو روک رہی تھی۔ مقطع سن کر بے اختیار ہوگئی۔ انتظام علی صاحب نے حیرت سے پوچھا یہ ہنسی کا کیا موقعہ ہے۔

بیوی۔ (ہنستے ہوئے) "آپ کا آخری شعر تو تقطیع سے بالکل گر گیا۔"

انتظام علی۔ (سنجیدگی کے ساتھ) "تقطیع سے گر گیا! تو کیا ہوا۔ بیس دفعہ تم سے نہیں دیگچی چولھے میں گر گئی۔ شعر تقطیع سے گرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا، اور تم نے

تو دیگچی گراکر ہر دفعہ کم از کم آٹھ آنہ کا نقصان کیا۔"

یہ تھی دوسری صحبت شعر و سخن جو انتظام علی صاحب کے گھر میں منعقد ہوئی اور ہنسی مذاق پر ختم ہوگئی۔ بیوی سمجھتی تھی کہ یہ جو کچھ ہوا۔ صرف مذاق تھا۔ اور انتظام علی صاحب نے قصداً محض تفنن طبع کے لیے غزل کہی تھی۔ لیکن ادھر بیوی کی یہ بات چوٹ کی طرح دل پر لگی کہ "مقطع تقطیع سے گر گیا"۔ اور انھوں نے پورے انہماک کے ساتھ غزل گوئی کی طرف توجہ شروع کردی۔ یہانتک کہ صبح ہوئی اور غزل سنانے بیٹھ گئے، دوپہر ہوئی اور دوسری غزل سامنے کردی۔ یہاں تک سونے سے قبل روزانہ تین چار غزلوں کا تیار کرلینا اور بیوی کو سنانا۔ ان کے فرائض میں داخل ہوگیا۔ بیوی حیران تھی کہ اس بلا کو کس طرح دور کرے اور ان کی غزلیں سن سن کر جو نفرت شاعری سے اسکو ہوتی جارہی تھی اسکا کیا علاج کرے۔ وہ اب ہنس بھی نہ سکتی تھی۔ کیونکہ انتظام علی صاحب کو ناگوار ہوتا تھا وہ منع بھی نہ کرسکتی تھی کہ یہ بھی گویا ایک قسم کی مخالفانہ تنقید تھی۔

ایک دن حسب معمول صبح ہی صبح انتظام علی صاحب ہاتھ میں غزل لئے ہوئے مردانخانہ سے اٹھ کر اندر آئے تو دیکھا بیوی چوکی پر نماز پڑھ رہی ہیں۔ یہ وہیں قریب کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس ارادہ سے کہ سلام پھیرتے ہی یہ اپنا وظیفہ شروع کردیں گے، لیکن بیوی نے نماز ختم کرتے ہی فوراً عقد انامل پر اسماء الٰہی کا ورد شروع کردیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ رحل سے قرآن شریف اٹھاکر اسے کھولنے لگیں انتظام علی صاحب کو بہت حیرت تھی کہ خلاف معمول بیوی نے نماز کیا سمجھ کر شروع کردی۔ کیونکہ آجتک کبھی کسی قسم کی عبادت میں انکو مشغول نہ دیکھا تھا تھوڑی دیر تک انتظار کرتے رہے لیکن جب بیوی نے کلام مجید سنبھالا تو یہ سمجھے جلد فارغ ہونا مشکل ہے اور باہر چلے گئے۔ آدھ گھنٹہ کے بعد پھر اندر آئے

تو بیوی بدستور کلام مجید کی تلاوت میں مصروف تھیں، دیکھ کر چلے گئے۔ الغرض دس بجے تک کوئی دس مرتبہ انھوں نے غزل سنانے کی کوشش کی اور ہر بار ناکام ہوئے۔ جب کھانا کھا کر کالج جانے کا وقت آگیا تو بیوی فارغ ہوئیں اور سیدھی باورچی خانہ جا کر کھانا نکالنے میں مصروف ہو گئیں۔

۴ بجے شام کو انتظام علی صاحب زیادہ جوش و ولولہ کے ساتھ واپس آئے کیونکہ اب بجائے ایک کے دو غزلیں سنانا تھیں، لیکن گھر پہونچ کر انھیں سخت مایوسی ہوئی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ بیوی پھر مصروف تلاوت ہیں۔ وہ الٹے پاؤں باہر واپس گئے اور خادمہ کو بلا کر پوچھا کہ "کیا بیگم نے آج دن بھر تلاوت کی ہے"۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ابھی عصر کی نماز کے بعد بیٹھی ہیں تو خاموش ہو گئے اور شام کی غزل گوئی ملتوی کر دی۔

مغرب کے وقت تک کئی بار انھوں نے دیکھا کہ بیوی فارغ ہوئیں یا نہیں۔ لیکن انھیں برابر اسی طرح خشوع و خضوع کے ساتھ تلاوت میں منہمک دیکھ کر یہ بھی اپنے کاموں میں لگ گئے۔ اور پھر انھیں نہ معلوم ہو سکا کہ عشاء کے بعد کس وقت تک وہ مصلے پر بیٹھی رہیں۔

انتظام علی سمجھتے تھے کہ ایک آدھ روز میں بیوی کا یہ جوش تسبیح و تحلیل ہو جائے گا لیکن جب مسلسل کئی دن تک انھوں نے یہ عالم دیکھا تو گھبرائے کہ بیوی بڑھتے بڑھتے کسی دن رابعہ بصری نہ بن جائیں۔ اور آخر کار ایک رات سوتے وقت موقع پا کر انھوں نے پوچھ ہی لیا کہ "یہ نماز روزہ کا دورہ آپ پر کب تک پڑتا رہے گا۔"

بیوی۔ (بگڑ کر) "توبہ کرو، توبہ، نماز روزہ کوئی بیماری ہے جس کا دورہ پڑتا ہے خوب، آپ کے یہاں مذہب کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔"

انتظام علی: نہیں یہ بات نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسوقت تک تو تم نے کبھی بھول کر بھی کوئی سجدہ نہ کیا تھا، پھر اب جو اس کا خیال آیا تو کیوں اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ جب دیکھئے سفید چادر میں لپٹی ہوئی چوکی پر تیمم کی مٹی کا تودہ بنی بیٹھی ہیں۔

بیوی: "لاحول ولاقوۃ، چلو ہٹو! مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ نماز روزہ کے ساتھ مذاق کیسا؟"

انتظام علی: "مذاق میں تو نہیں کر رہا، تمھیں کر رہی ہو۔ میں نماز کو منع نہیں کرتا تلاوت سے نہیں روکتا، لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے، تمھاری بھی عجیب باتیں ہیں نماز چھوڑی تو اس طرح کہ بھولے سے بھی کبھی خدا کا نام نہ لیا اور عبادت پر آئیں تو اس شان کے ساتھ کہ گھر کو مسجد خانقاہ بنا کے رکھ دیا۔"

بیوی۔ (تنک کر) "خیر ہوگا، آپ کو اس سے کیا، میں نے نماز نہیں پڑھی تھی تو خدا کا گناہ کیا تھا۔ اب پڑھتی ہوں تو اپنے لئے کسی کو کیا؟"

انتظام علی"۔ مجھے یہ، کہ جس دن سے آپ نے نماز شروع کی ہے۔ صرف دو غزلیں ہو کر رہ گئی ہیں سنانے کا موقع ملے تو اور کہوں۔ مجھے تو اس سال پورا دیوان ختم کرنا ہے آخر کام کیسے چلے گا۔"

بیوی نے اس اندیشہ سے کہ کہیں فوراً غزل خوانی نہ شروع ہو جائے، کوئی جواب نہ دیا۔ اور کروٹ لیکر اس طرح سانسیں لینے لگیں جیسے نیند سے مغلوب ہو۔ انتظام علی صاحب نے ایک آدھ مرتبہ آواز بھی دی لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو خاموش ہو کر خود بھی لیٹ گئے۔

---

کامل ایک ہفتہ اسی حال میں گزر گیا کہ انتظام علی صاحب جب اندر آتے ہیں بیوی

نماز و تلاوت میں مشغول ہوتی ہیں اور جب یہ کوئی ذکر اس قسم کا چھیڑتے ہیں تو وہ ٹال جاتی ایک دن انھوں نے یہ ترکیب کی کہ رات کو چپکے سے اٹھ کر بیوی کا مصلا اور تسبیح و قرآن سب چھپا دیا۔ صبح کو جب وہ اٹھیں اور وضو کر کے نماز کے ارادہ سے چوکی پر گئیں تو وہاں صفایا تھا، خادمہ کو آواز دی۔ اور پوچھا کہ مصلا کہاں گیا۔ لیکن اسے کیا خبر تھی۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور بیوی کو غصہ آگیا۔ جب بات زیادہ بڑھتی دیکھی تو انتظام علی صاحب بیوی کا تمام اسباب عبادت لئے ہوئے سامنے آئے اور کہا کہ "بیگم یہ ہے آپکا عاشورہ خانہ لیکن خدا کے لئے یہ بتا دو کہ یہ چلہ کتنے دنوں تک قائم رہے گا۔ تاکہ میں اتنے زمانہ کے لیئے کہیں باہر نکل جاؤں۔" بیوی اس ادا کو دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑی اور بولی کہ "سچ سچ کہوں گی تو آپ کو ناگوار ہوگا۔"

انتظام علی صاحب نے اسی جگہ بیوی کی جانماز، تسبیح اور قرآن مجید سب کو سر پر رکھ کر کہا کہ "قسم لے لو جو کچھ کہوں"۔

بیوی نے کہا کہ "وعدہ کیجئے آج سے آپ نہ کبھی کوئی شعر کہیں گے۔ نہ مجھے سنائیں گے"،

انتظام علی۔ (حیرت سے) "لاحول ولا قوۃ، میں تو سب کچھ تمھاری خوشی کے لیئے کرتا تھا۔ تم نہیں پسند کرتیں، تو کیا میرا سر پھرا ہے کہ خواہ مخواہ اپنا وقت ان مہملات میں ضائع کر دوں۔"

بیوی۔ "ہاں میری خوشی ہو چکی، اب میری مرضی یہی ہے کہ آئندہ کے لیے آپ اس سے توبہ کیجئے۔"

انتظام علی: "اچھا میں توبہ کرتا ہوں۔ لیکن آپ ... ...؟"

بیوی۔ (ہنستے ہوئے) "خدا تمھیں شرمائے، نماز سے توبہ کراتے ہو، جس نے تم سے شاعری کی لت چھڑوائی۔"

انتظام علی: "اور تم شاعری سے توبہ کراتی ہو، جس نے تمھیں نماز کی عادت ڈلوائی۔"

# سرزمین دکن کی ایک دلنواز شام

میرے اور خدا کے درمیان "عزم و فسخ عزم" کا ایک عجیب و غریب معاملہ قائم ہے کہ اگر میں سراپا "عبودیت" بننا چاہتا ہوں، تو وہ میرے اندر "شان کبریائی" پیدا کر دیتا ہے دعوائے خدائی کا خیال کبھی آیا نہیں، ورنہ ممکن ہے میں اس صورت میں "بندگی" کی لذت سے آشنا ہو جاتا۔

مہینوں سے "فرخندہ بنیاد" حیدر آباد پہونچنے کا عزم کر رہا تھا۔ اور "ماورای سرحد ادراک" سے برابر "شکست ہمت" کا سلسلہ جاری تھا، یہاں تک کہ ایک دن گھبرا کر بغیر کسی ارادہ کے دفعتہً رخت سفر استوار کیا اور اسٹیشن پہونچ گیا مجھے یقین کامل ہے کہ اگر ایک گھنٹہ قبل بھی ان فرشتوں کو معلوم ہو جاتا جو مولویوں کے بیان کے مطابق نسمہ یا مخلوق کی طرح ہر وقت انسان کے شانہ و دوش پر سوار رہتے ہیں، تو میں کبھی کامیاب نہ ہو سکتا، لیکن میں نے "ملاء اعلیٰ" تک اس خبر کے پہونچنے کا موقعہ ہی نہیں دیا اور اس طرح میری حریفانہ چال کام کر گئی، تاہم یہ ضرور ہوا کہ تیسرے دن بجائے صبح کے یہاں شام کو پہونچ سکا اور اس طرح گویا پورے بارہ گھنٹے کی تعویق کا جرکا آخر کار دے ہی دیا۔

قربان نگاہ تو شوم بازنگاہے!!

---

میرا ارادہ یہاں زیادہ سے زیادہ بیس دن قیام کا تھا، لیکن آج پورے

۸۲ دن "نجد وغزالان نجد" سے جدا ہو گئے ہیں اور ہنوز واپسی کی کوئی تاریخ متعین نہیں کر سکتا اپنی "بے بال و پری" کے ماتم کا عادی نہیں اس لئے سوا اس کے کیا کہوں کہ۔

خدا ایں چہ کافر ماجرائی ست!

ہاں، خدا ہی سے اسکی "کافر ماجرائی" کا گلہ کرتا ہوں اور "کِرَاماً کاتبین" اور علماء کرام عورتوں کے اندیشہ سے آزاد ہوں!

---

میں اس وقت کوئی لسبیکار دیدار قیام وسفر کی قلمبند کرنے نہیں بیٹھا اور نہ ایک مختصر مقالہ میں اپنے ان تمام تاثرات کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جو یہاں مجھے حاصل ہوئے بلکہ مقصود صرف ان چند ساعتوں کی یاد قائم کرنا ہے جن کا نام میری انشاء میں "نشاط زمزمہ ولذت جگر خواری" کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

---

اس وقت میں صرف اس ایک شام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کو ایک طویل و خنک رات میں تبدیل کرنے کے لئے ایک شخص اپنی زندگی کے بہت سے قیمتی دن دینے کے لئے آمادہ ہو سکتا ہے

آسودہ شبے باید وخوش مہتابے
تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

---

ایک دعوت ——!

میں جس وقت موٹر سے اترا تو میرے خیر مقدم کے لئے تنہا میرے میزبان ہی آگے نہیں بڑھ رہے تھے بلکہ ان کی معیت میں کوئی اور بھی تھا۔

"ہمچو نسیم سحری در چمن" اور میں اپنی جگہ ششدر و حیران کہ۔
"کس کے استقبال کو جی تن سے نکلا جائے ہے"
بڑھنے والے بڑھتے رہے، کھنچنے والے کھنچتے رہے، لب فرش تک تکلیف پا رنجہ کی گئی، فرق نازک تک ساعد سیمین کو زحمت جنبش دی گئی، ادھر سلام کے لئے سر جھکا کہ یہ رسم خیر مقدم تھی اور ادھر ذبح و نقل کے لیئے کہ میرے مذہب میں اسے رسم شہادت کہتے ہیں۔

سر از یں تیغ بردل آسان نیست

آہ، منظر خم سلام کیسے

اسوقت اس تمام منظر میں یہ ہستی رعنا وہی کیفیت رکھتی تھی جو طرۂ درِ یتیم میں زیادہ خوش آب موتی کی ہوتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ یہ صرف نگاہ کو خیرہ کرتا ہے اور وہ عقل و ہوش کو اس سے صرف ضو پیدا ہوتی ہے اور اسی سے بجلیاں، یہ ایک جنس جو لاکھ گراں ہونے پر بھی ارزاں ہے اور وہ ایک جوہر ہے جس کی ارزانی بھی جانِ ناتواں پر صد ہزار گرانباری احسان ہے۔

جلوہ گرے آفت نظارۂ

برق زمتشال دے انگارۂ

پرچم نور کی طرح لہراتی ہوئی، سرو زریں کی طرح لچکتی ہوئی بڑھی۔ واپس ہوئی تو موج ہوا خرام ناز سے گل در آغوش تھی اور بزم جلوۂ رنگین کے گلال و عبیر سے معمور!

جلوۂ گل شعلہ دارِ رہش | فرق ہما گرد غبار رہش
در نظر او شوخی اعضائے او | بود چمن خیز سراپائے او
رنگِ گل آئینہ دیدار او | موج پری جوہر رفتار او

عالم جذبات میں "شاہد و شعر و شباب" کا جو مرتبہ ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ کہ ان میں سے ہر چیز اپنی جگہ خدائی کا دعویٰ کرنے کی اہلیت رکھتی ہے، چہ جائیکہ ان سب کا اجتماع ایک ہی ہستی میں، ایک ہی پیکر نازنیں ہو اور وہ بھی نگاہوں کے قریب، دست شوق سے متصل!

جہانے مختصر خواہم کہ در وے ہمیں جائے من و جائے تو باشد

ساز کے تاروں کو چھیڑا گیا، ایک پاؤں کو بڑھا کر زرکار صندلی ساری کا پلہ بجلی کی روشنی میں اس پر ڈالا گیا، گورے گورے ہاتھ کہنیوں تک عریاں کئے گئے، چہرہ پر ہلکا سا تبسم، "چوں موج بادہ در مینائے رنگین" پیدا ہوا مست و مدہوش آنکھوں سے "نیم نگاہانہ" جائزہ بزم کا لیا، پنکھڑی ایسے لبوں میں جنبش پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک ایسی صدا فضا میں پھیلی کہ۔

فتادو اسامعہ در موج کوثر و تسنیم

یہ ایک چھریرے جسم کی بلند بالا "مخلوق" تھی جس کے اعضاء کا تناسب، رنگ کی شگفتگی چہرہ کی شادابی اور سب سے زیادہ "وہ چیز" جو بار بار شانہ سے آنچل کو سرکا دیا کرتی ہے، اس موسم کی خبر دے رہی تھی جس کے متعلق اگر رایوں میں اختلاف ہو سکتا ہے تو صرف اٹھارہ بیس کا۔ اسکے کتابی چہرہ کا ہر خط و خال وہی موزونیت رکھتا تھا جو یونان کے کسی "مجسمہ" میں کبھی پائی جاتی تھی، یہانتک کہ اگر کبھی وہ متانت و سنجیدگی کے ساتھ کچھ سوچنے لگتی تو حقیقتاً ایک "مرمریں بت" معلوم ہوتی تھی، یا پھر کوئی ایسی دیوی جس کے سامنے عشق کی "تھرتھری" جذبات پرستش کی "کپکپی" میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ جس وقت نغمہ کے بول کو اپنے اعضاء کی حرکت و جنبش میں منتقل کر کے دو چٹکیوں سے ریشمی رومال کو تانکر چہرہ کے سامنے لاتی اور اپنی آنکھوں کی ایک "گریز پا" جھلک دکھا کر گردن کو موڑتی ہوئی نگاہیں پھیر لیتی تو الیا

محسوس ہوتا کہ اسوقت کائنات جنبش میں ہے اور کلیجہ اچھل کر منھ تک آجانے کے لیئے بیتاب! یقیناً وہ فن موسیقی کی زبردست ماہر نہ تھی، اسکی آواز میں کوئی غیر معمولی دلکشی نہ تھی لیکن اسکا کیا علاج کہ اسکے "موئنم" میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں، اس کی آنکھوں میں جادو تھا اور اسکی زندگی کا یہ بدترین پہلو بھی کہ وہ بازار کی "ایک جنس کم ارز" ہے دل کو گوارہ تھا ہرچند یہ صبر آزمائیاں صرف تین گھنٹے تک قائم رہیں لیکن اسی قلیل فرصت میں ہمارے بعض احباب کو دو "عشق کہن سال" بخش گئیں۔

توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے

اس صحبت کے اختتام سے مجھے ایک گونہ مسرت تھی کہ آزمائش و ابتلا کا وقت بخیر گزر گیا، لیکن میں اپنے میزبان کی اس ستم ظریفی سے بیخبر تھا کہ وہ رسم الوداع میں ایک آخری لیکن حد درجہ بے پناہ حربہ مجھ پر صرف کرنے والے ہیں۔ یقیناً میں اس لمحہ کی لذت یا تکلیف کے بیان سے قاصر ہوں اور نہ اسوقت کی تصویر پیش کرسکتا ہوں جب کسی کا سر سامنے جھکا ہوا تھا اور کوئی اپنے دست سیمین سے (جو خود پھولوں کا گجرا معلوم ہوتے تھے) گلے میں ہار ڈال رہا تھا۔ وہ ہار جو بجائے پھولوں کے گویا سفید انگاروں سے گوندھا گیا تھا۔

---

ختم شد